© Urdu4U.com

پریشر ککر

صدیق سالک

۲۰۰۲ء

- پریشر ککر

۲۷- مارچ کی بات ہے علی محمد دبے پاؤں میرے کمرے میں داخل ہوا لیمپ جلایا اور میرے سرہانے کھڑا ہو گیا۔ حسب عادت اس کے ہاتھ میں ایک ٹرے تھی جس پر تازہ پھول' تازہ چائے اور تازہ اخبار رکھے تھے۔ اس نے پھول سامنے کارنیس پر گلدان میں سجا دیئے اور تازہ اخبار اور چائے کی پیالی سائڈ ٹیبل پر رکھ دی۔
URDU4U .COM

یہ روز کا معمول تھا۔ البتہ چھٹی کے دن اس میں کچھ تبدیلی آ جاتی تھی اور یہ کہ میں صبح دیر سے جاگتا۔ جاگ بھی جاتا تو ریشمی سی سستی کی آغوش میں لوریاں لیتا رہتا۔ موسم بہار یا موسم سرما ہوتا تو سستی یا کاہلی اور بھی مزید لگتی۔ علی محمد جو برسوں سے میرے پاس ملازمت ھا میری اس کمزوری کو اچھی طرح جانتا تھا چنانچہ چھٹی کے روز مجھے جگائے بغیر وہ بازار سے سودا سلف خریدے چلا جاتا واپس آ کر دوسرے کام کاج کرتا اور جب اس کے اندازے کے مطابق میری عیاشی پوری ہو جاتی تو وہ دروازے پر مترنم سی دستک دیتا۔ پھر آہستہ سے دروازہ کھول کر جوتے باہر ہی اتار دیتا اور دبیز قالین پر ننگے پاؤں چلتا ہوا میرے بیڈ سائڈ ٹیبل کے نقرئی بٹن کو چھو دیتا جس سے لیمپ جاگ اٹھتا اور اس کے دودھیا بلب کی روشنی (Beige) رنگ کے شیڈ سے چھن چھن کر میرے پپوٹوں کو گدگداتی اور میری نیند کا طلسم ٹوٹ جاتا۔

لیمپ کی روشنی میں چائے کا رنگ بہت فرحت بخش لگ رہا تھا۔ کسی حسینہ کے ہلکے میک اپ کی طرح! لیکن اس دن صاف ستھری چائے کی پیالی میں چائے کی پتی کا ایک ریزہ تیر رہا تھا۔ چائے حسب معمول سخت گرم تھی اور اس کی بھاپ صاف نظر آ رہی

تھی۔ میں چائے کے تیرتے ہوئے پتے کو دیکھنے لگا۔ یہ دوسرے پتوں کی طرح ڈوب کیوں نہیں گیا؟ کیا یہ اپنا مقدر دوسرے پتوں سے مختلف رکھنا چاہتا تھا یا گرم پانی کی سطح پر تڑپ تڑپ کر احتجاج کرنا چاہتا تھا؟

URDU4U.COM

میں نے جاپانی ساخت کی خوبصورت پیالی میں سنہری چمچ ہلایا تا کہ یہ تنہا پتہ بھی اپنے ہم نسلوں کے ساتھ زیرِ آب چلا جائے لیکن وہ ایسا سخت جان تھا کہ جونہی میں چمچ ہلانا بند کرتا وہ پھر ابھر کر سطح پر تیرنے لگتا۔ خاصا ڈھیٹ پتہ تھا شائد دلیر بھی!

میں چائے کی چسکی کے ساتھ ساتھ اخبار دیکھنے لگا۔ سب اخبار ایک سے تھے۔ ایک سی خبریں۔ ایک سی سرخیاں۔ ایک سی تصویریں! میں نے چند منٹوں میں سب اخبار کھنگال ڈالے۔ اتنے میں دوسرا ملازم وارث جلدی جلدی اوپر آیا اور کہنے لگا:

"صاحب جی' نیچے کمال صاحب کا فون آیا ہے"

"انہیں کہو اوپر اس نمبر پر رنگ کر لیں"

"نہیں صاب وہ بات نہیں کرنا چاہتے صرف یہ پوچھ رہے ہیں کہ صاب جاگ گئے ہیں یا نہیں' وہ آپ سے ملنا چاہتے ہیں"

"کیوں خیریت تو ہے اتنی صبح؟"

"وہ کہہ رہے تھے بہت ضروری بات ہے"

"اچھا اب کیا وقت ہوا ہے؟"

"جی' نو بجکر بیس منٹ"

"انہیں کہو' دس بجے تشریف لے آئیں"

میں دس بجے کے قریب میرون کلر کا ڈریسنگ گاؤن پہنے ڈائنگ روم میں ناشتہ کر رہا تھا اور وارث میرے پاس کھڑا کبھی ٹوسٹ سینک کر دے رہا تھا اور کبھی مکھن اور جیم آگے کر رہا تھا اتنے میں کال بیل بجی' میں نے کہا "جاؤ' دیکھو یہ کمال صاحب ہوں گے' انہیں ڈرائنگ روم میں بیٹھاؤ میں آتا ہوں"

ملازم نے فوراً تعمیل کی۔

میں ناشتے کے بعد سگار سلگاتے ہوئے ڈرائنگ روم میں داخل ہوا۔ کمال مجھے دیکھ کر احتراماً کھڑا ہو گیا۔ اگرچہ وہ سکول میں میرا کلاس فیلو رہ چکا تھا عمر میں مجھ سے سال ڈیڑھ سال بڑا تھا لیکن زندگی کی دوڑ میں ذرا پیچھے رہ گیا تھا اس لئے ہمارے درمیان بے تکلفی ختم ہو چکی تھی اور یکطرفہ احترام بڑھ گیا تھا۔ وہ پہلے بھی کئی مرتبہ ہمارے گھر آ چکا تھا لیکن آج وہ کچھ اکھڑا اکھڑا سا تھا۔ پریشان' گھبرایا ہوا!

"اللہ کرے خیریت ہی ہو"

"کیوں کیا بات ہے؟ ہاں پہلے یہ بتاؤ کیا پیؤ گے؟"

"کچھ نہیں' میں ابھی ناشتہ کر کے آ رہا ہوں"

"ہاں تو اس قدر پریشان کیوں ہو؟"

"پریشانی کی وجہ یہ ہے کہ فطرت پچھلے تین دن سے لا پتہ ہے"

"فطرت؟ اپنا آرٹسٹ فرینڈ' ابھی دو تین روز پہلے تو اس کے فن پاروں کی نمائش میں اس سے ملاقات ہوئی تھی۔ وہ تو بالکل ٹھیک ٹھاک تھا"

"اللہ کرے ٹھیک ٹھاک ہی ہو۔ لیکن پتہ نہیں کیوں میرے دل میں عجیب وسوسے جاگ رہے ہیں"

"وہم کا کوئی علاج نہیں' صبر کرو۔ آئے گا دو ایک روز میں"

"میرے خیال میں اس معاملے کو اتنا غیر اہم نہیں سمجھنا چاہئے۔ اس کی بیوی بہت پریشان ہے"

اتنے میں میرے دائیں ہاتھ کی درمیانی انگلیوں میں سلگتا ہوا سگار تقریباً بجھ چکا تھا۔ میں نے اس کی راکھ ایش ٹرے میں پھینک دی۔ مجھے رہ رہ کر چائے کی پیالی میں تیرنے والا چائے کا پتہ یاد آنے لگا جو گرم پانی کی سطح پر تڑپ رہا تھا۔

میں نے فطرت کو ہمیشہ خوش و خرم دیکھا اور خوش پوش شخص تھا وہ زندگی سے پیار کرتا تھا۔ اس کی گھریلو زندگی بڑی خوشگوار تھی وفادار' محبت کرنے والے دو گول مٹول بچے' چھوٹا سا خوبصورت مکان' گھر میں آسائش کی ساری چیزیں' مستقل نوکری' سواری

کے لئے اپنی گاڑی نہیں' نہیں ایسا شخص زندگی کو یوں تیاگ نہیں سکتا۔ ضرور کہیں دوستوں میں مصروف ہو گیا ہو گا۔ گھر والوں کو بتائے بغیر کسی مشاعرے میں چلا گیا ہو گا فطرت جیسا نفاست پسند' خوبرو' صحت مند شخص کوئی ایسی ویسی حرکت نہیں کر سکتا۔

"کس سوچ میں پڑ گئے ہو امجد" کمال نے میرے خیالوں کا تسلسل توڑ دیا۔

"میں یہی سوچ رہا تھا کہ تم فطرت کی غیر حاضری کو غلط معنی پہنا رہے ہو۔"

"اللہ کرے' غلط ہی ہوں' لیکن مسز فطرت کو کس طرح تسلی دیں۔ وہ بیچاری تو رو رو کر ہلکان ہو چکی ہے"۔

"ابھی فطرت کے گھر چلتے ہیں' تم ذرا رکو' میں کپڑے بدل کر آتا ہوں۔"

میں اوپر بیڈ روم میں کپڑے بدلنے جگیا تو بیگم صاحبہ جاگ چکی تھیں۔ لیکن ابھی تک نیند کے زیر اثر تھیں۔ بستر پر لیٹے لیٹے اس نے پوچھا:

"کون آیا تھا صبح ہی صبح"

"وہ اپنا کمال تھا میرا پرانا کلاس فیلو"

"کیا پھر اسے قرضے کی ضرورت پڑ گئی۔"

"نہیں' آج وہ ایک اور خبر لے کر آیا تھا۔"

"وہ کیا"

"وہ فطرت تھانا' اپنا فطرت' جس نے ہمیں ڈرائنگ روم والی خوبصورت پینٹنگ بنا کر دی تھی۔"

"اوہ' آئی سی' کیا ہوا اسے؟"

"وہ پچھلے تین چار دن سے لا پتہ ہے"

اس میں پریشانی کی کیا بات ہے۔ کسی لڑکی وڑکی کا چکر ہو گا۔ اس کے ساتھ بھاگ گیا ہو گا۔"

"نہیں نہیں' فطرت ان چیزوں سے بالا تھا۔"

 © Urdu4U.com

اگر وہ ایسا شخص نہیں تھا تو کسی دشمن نے اسے اغوا کروایا ہو گا"

"جہاں تک مجھے معلوم ہے اس کا کوئی دشمن بھی نہیں تھا۔"

"پھر غبن کیا ہو گا' پیسہ کھایا ہو گا' سزا سے بچنے کے لئے بھاگ گیا ہو گا"

میری بیوی ایک کے بعد دوسری دلیل دیتی رہی اور میرا دل ہر دلیل ماننے سے انکار کرتا رہا لیکن پھر میں نے لمحے بھر کو سوچا' ممکن ہے وہ صحیح کہتی ہو' میں فطرت سے دو چار بار ملا ضرور ہوں لیکن کیا میں اسے واقعی جانتا ہوں۔ کیا ایک انسان واقعی دوسرے انسان کو مکمل طور پر جان سکتا ہے یا ہم ہمیشہ ایک دوسرے کے لئے اجنبی رہتے ہیں۔ کسی درخت کے پتے دیکھ کر یہ کہہ دینا کہ یہ درخت مضبوط ہے' کہاں تک درست ہے۔ کیا سبز پتوں والے درخت کا تنا کھوکھلا نہیں ہو سکتا۔

میں نے نیچے اتر کر اپنی ٹیوٹاڈی لکس گاڑی نکالی' ہلکا سا ہارن بجایا' کمال اٹھ کر باہر آیا اور میرے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

ہم اسلام آباد فطرت کے گھر روانہ ہو گئے۔

فطرت ایک لائن مین کے گھر پیدا ہوا تھا جسے لوگ منہ پر چوہدری کرم دین اور پیٹھ پیچھے "کرموں لائن مین" کہتے تھے۔ کرم دین آبائی لحاظ سے فیصل آباد کے چک نمبر ۲۳۰ (گ۔ ب) کے ایک کاشتکار گھرانے سے تعلق رکھتا تھا لیکن زمین تھور اور سیم کا شکار ہو جانے کی وجہ سے وہ بجلی کے محکمے میں لائن مین بھرتی ہو گیا تھا۔ اس کی نوکری شہر میں تھی اور بال بچے گاؤں میں رہتے تھے۔ وہ انہیں ہر مہینے بیس پچیس روپے بھیج دیتا تھا جو قیام پاکستان سے پہلے ان کے گزارہ کے لئے کافی ہوتے تھے۔ کبھی کبھی اس کی بیوی مہینہ دو مہینے کے لیے شہر آ جاتی تھی اور پھر واپس چلی جاتی تھی۔

کرموں کی بیوی کا نام ریشماں تھا جو دو بچوں کی پرورش کر رہی تھی۔ ایک سات سالہ بیٹی کی' گھر میں۔ اور ہونے والے بچے کی' پیٹ میں۔ ذکیہ تو گھر داری میں اس کا ہاتھ بٹا دیتی تھی لیکن اس کا ہونے والا بچہ اس کے کام کاج میں خلل ڈالتا رہتا تھا۔

کبھی ریشماں کو چکر آنے لگتے' کبھی متلی تنگ کرنے لگتی اور کبھی جسم میں سوئیاں سی چبھنے لگتیں۔ لیکن یہ ایک ایسا بوجھ تھا جسے اٹھانے کی اسے ایک عرصے سے آرزو تھی۔

URDU4U.COM

یہ گاؤں اگرچہ فیصل آباد (ان دنوں کے لائل پور) سے زیادہ دور نہ تھا لیکن رسل و رسائل کے ذرائع نہ ہونے کی وجہ سے شہر سے بہت دور لگتا تھا۔ فیصل آباد سے چک نمبر ۲۳۰ تک نہ کوئی سڑک جاتی تھی نہ لاری نہ بس۔ کچے راستے پر تانگے چلتے تھے جو چک نمبر ۲۳۰ سے پہلے ہی سواریاں اتار دیتے تھے۔ تانگہ بانوں کا کہنا تھا کہ چک نمبر ۲۳۰ میں وہ سواری اتار کر اسی دن واپس نہیں آسکتے۔ انہیں رات باہر گزارنا پڑتی تھی جس کے لئے سارے راستے میں کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ لہٰذا لوگ فیصل آباد سے تانگے پر بیٹھے' جہاں تک تانگہ جاتا' تانگے پر چلے جاتے اور باقی سفر پیدل طے کرتے۔ اگر ساتھ سامان ہوتا تو اور بھی تکلیف ہوتی۔ اکثر لوگ جو شہروں میں ملازمت کرتے تھے اپنی آمد سے پہلے گاؤں میں خبر کر دیتے تھے اور ان کے رشتہ دار گھوڑی وغیرہ لے کر انہیں فیصل آباد لینے آجاتے تھے۔

چک نمبر ۲۳۰ (گ۔ ب) میں کوئی ایسی بات نہ تھی کہ اس کا ذکر ناولوں یا کتابوں میں کیا جائے۔ اس میں آموں کے باغ تھے نہ کوکنے والی کوئلیں۔ وہاں نہ روایتی قسم کے جاگیردار تھے اور نہ لاچہ باندھ کر پنگھٹ پر چوہلیں کرنے والی الھڑ لڑکیاں تھیں۔ یہ ایک غریبانہ سا گاؤں تھا جہاں سے صرف غربت یا محنت کش جسم ہی برآمد کئے جا سکتے تھے۔ کچھ لوگ تو بیلوں کے ساتھ کاشتکاری میں جت جاتے تھے اور کچھ فوج میں بھرتی ہو جاتے تھے۔ دوسری جنگِ عظیم میں جب جرمن توپوں کے لئے انسانی جسموں کی ضرورت پڑی تو ان جوانوں کی مانگ بڑھ گئی۔ انگریز نے ہٹے کٹے جوان بیس بیس' تیس تیس روپے ماہوار پر خرید لئے جن میں سے اکثر افریقہ یا برما کے محاذوں پر کام آئے اور صرف بچے کھچے چند لوگ پنشن پر واپس گاؤں پہنچے۔ پنشن بھی کیا تھی' تاجِ برطانیہ سے عہدِ وفا کی ایک علامت تھی۔ پانچ دس روپے ماہوار۔

کرموں کا مکان اندر سے کچا تھا لیکن اس کے آگے ڈیوڑھی پکی تھی۔ جس پر لکڑی کے کھردرے پھٹوں کے کواڑ کھڑے کر دیئے گئے تھے جو اب اتنے پرانے ہو چکے تھے کہ دروازہ کھولتے ہی کواڑ چیخنے لگتے تھے۔ سارے محلے کو پتہ چل جاتا تھا کہ کرموں کے گھر کوئی آیا ہے یا وہاں سے کوئی نکلا ہے۔

URDU4U.COM

کرموں کے گھر کی مکانیت زیادہ نہ تھی۔ پیچھے دو تنگ کوٹھڑیاں تھیں جہاں بھلے دنوں میں غلہ' بھوسہ اور دوسرا فالتو سامان رکھا رہتا تھا لیکن آج کل اس میں ٹوٹی ہوئی چارپائیاں' پرانے لحاف' سردیوں کے لئے لکڑی کا ایندھن اور غلے کے لئے ایک "بھڑولہ" رکھا تھا۔ ان کوٹھڑیوں کے سامنے ایک بڑا کمرہ تھا جس میں گھر کے تمام لوگ گزارہ کرتے تھے۔ سامنے ایک برآمدہ تھا جس کے ایک کونے میں دیوار کھڑی کر کے باورچی خانہ بنا دیا گیا تھا۔ نلکے' پانی غسل خانے کا کوئی تصور نہ تھا۔ مرد گاؤں کے ٹیوب ویل یا مسجد میں نہا آتے تھے اور عورتیں کھڑی چار پائیوں پر چادریں ڈال کر عارضی سا پردہ بنا لیتی تھیں اور ان کے پیچھے بیٹھ کر نہا دھو لیتی تھیں اور پھر چار پائیاں اٹھا دیتی تھیں۔ وہ نہاتی بھی کب روز روز تھیں۔ کبھی عید بقر عید پر نہا لیا یا جب منے کا ابا چھٹی آتا تو غسل کر لیا ورنہ ان کا وقت تو کھیتوں میں گزرتا تھا جہاں سے کام ختم کر کے وہ ہانڈی روٹی میں لگ جاتیں اور سب گھر والوں کو کھانا کھلا کر جب وہ برتن وغیرہ صاف کرنے سے فارغ ہوتیں تو ان میں اتنی ہمت ہی نہ ہوتی کہ وہ نہانے' کپڑے بدلنے یا اپنے آپ کو سنوارنے پر توجہ دے سکتیں۔ صدیوں سے ان کی زندگی اسی ڈگر پر چلتی آ رہی تھی۔

کرموں کی بیوی ریشماں اگرچہ ہونے والے بچے کی آمد کی وجہ سے ذرا پیلی اور کمزور پڑ گئی تھی لیکن ویسے اس کا شمار گاؤں کی باہمت اور دلیر عورتوں میں ہوتا تھا۔ وہ گھر کی چکی پر ایک ہی نشست میں کئی کئی سیر گندم پیس ڈالتی تھی۔ بڑی سے بڑی بھینس کا دودھ دوھ لیتی تھی۔ بلکہ کرموں ہل چلا کر واپس آتا تھا تو بیلوں کی جوڑی کو وہ

 © Urdu4U.com

خود سنبھالتی تھی۔ جب وہ پانی ڈھونے پر آتی تو دو گھڑے سر پر اور ایک گھڑا بغل میں اٹھا لیتی اور ایک ہی پھیرے میں سارے دن کے لئے پانی بھر لیتی۔ اگرچہ اس کا قد ٹھگنا تھا مگر اس کا جسم گٹھا ہوا تھا۔ لوگ اسے کام کرتے دیکھ کر اکثر کہتے تھے کہ "یہ پتھر کی بنی ہوئی ہے۔ پتھر کی"۔ جب سے پڑوسی گاؤں سے بیاہ کر وہ یہاں آئی تھی ذکیہ کی پیدائش کے وقت کے علاوہ کبھی کسی نے اسے بیمار چارپائی پر لاچار لیٹے نہیں دیکھا تھا۔

ریشماں کے منہ پر چیچک کے ہلکے ہلکے داغ تھے لیکن اس کا رنگ نکھرا نکھرا تھا اس کے بال گھنے' لمبے اور سیاہ تھے۔ جب میکے سے سسرال یا سسرال سے میکے جانے کے لئے نہا دھو کر تیار ہوتی تو وہ چھوٹے قد کے باوجود بڑی ممتاز اور قبول صورت لگتی تھی۔

اس کے ساتھ اس کا میاں چوہدری کرم دین لمبا' ہٹا کٹا اور وجیہ لگتا تھا۔ خاص کر جب وہ کلف لگا ہوا طرہ (پگڑی) باندھ کر باہر نکلتا تو بڑا بار رعب لگتا تھا۔ بچپن میں دو چار دن جماعتیں پڑھ کر وہ کھیتی (باڑی میں لگ گیا تھا۔ اگر سیم اور تھور کی وجہ سے زمینیں اس سے نہ چھن جاتیں تو وہ چک نمبر ۲۳۰ کا باوقار چوہدری ہوتا تھا۔ لیکن اللہ غارت کرے زمین کی ان بیماریوں کو جنھوں نے چوہدری کرم دین کو کرموں لائن مین بنا دیا تھا۔

بیساکھی سے چند دن پہلے جب فصلیں کٹنے کے لئے تیار کھڑی تھیں تو ریشماں کو درد زہ شروع ہو گئی۔ اس کی اکلوتی بیٹی ذکیہ گاؤں کی دائی اور اپنی اماں کی سہیلی نوراں کو بلا لائی۔ دونوں ریشماں کو گھر کی پچھلی کوٹھڑی میں لٹا کر محنت مشقت شروع کر دی وہ کہیں ظہر کے وقت جا کر فارغ ہوئیں۔ انھوں نے کوٹھڑی سے باہر نکل کر سب سے پہلے ذکیہ کو مبارک باد دی کہ "تمہارا ایک بھائی آیا ہے" ذکیہ نے اندر جا کر ماں کا حال پوچھا۔ اپنے بھائی کو ایک نظر دیکھا اور ماں کی ہدایت کے مطابق الماری سے گڑ اور بتاشوں کی ایک سینی نکال کر سامنے رکھ دی تا کہ جو کوئی مبارک دینے آئے منہ میٹھا کرتا جائے۔

کرموں لائن مین کو جو ان دنوں دیپالپور میں ملازم تھا خط کے ذریعے اطلاع دی گئی کیونکہ اول تو گاؤں سے تار بھجوانے یا ٹیلی فون کرنے کا کوئی بندوبست نہیں تھا۔ دوسرے ان دنوں تار کا نام سن کر خواہ مخواہ دل دہل جاتا تھا۔ صرف محاذوں پر کام کرنے والے فوجیوں کے لواحقین کو تار آتے تھے اور تار کھولنے سے پہلے ہی متعلقہ گھرانے میں آہ و بکا شروع ہو جاتی تھی۔

کرموں ایک ہفتے کے اندر اندر گاؤں پہنچ گیا۔ وہ راستے میں ایک درجن مالٹے' دو سیر مٹھائی اور ریشماں کے لئے ایک جوڑا نئے کپڑے خرید لایا۔ جب وہ گھر پہنچا تو ریشماں چلنے پھرنے کے قابل ہو چکی تھی۔ اس نے میلی سی شلوار اور قمیض پہن رکھی تھی۔ کیونکہ دائی اسے روزانہ تیل کی مالش کرنے آتی تھی اور وہ ہر روز نیا جوڑا خراب کرنا نہیں چاہتی تھی۔ اسے پتہ تو تھا کہ کرموں آنے والا ہے لیکن اسے اس کی آمد کے ٹھیک دن کا علم نہ تھا ورنہ وہ ہمیشہ کی طرح شائد آج بھی اپنا آپ ذرا سنوار لیتی۔

کرموں نے نوزائیدہ بچے کو اس کے بستر کے ساتھ دونوں ہاتھوں میں اٹھا لیا اور اپنی مونچھوں سمیت اسے دو تین بوسے دیئے۔ پھر اسے واپس چارپائی پر لٹانے کی بجائے عورتوں کی طرح گود میں لے کر بیٹھ گیا۔ ریشماں اس کی خاطر تواضع کے لئے چولہے کے ساتھ لگ گئی۔ عورتیں اور مرد سارا دن مبارک باد دینے آتے رہے اور منہ میٹھا کر کے واپس جاتے رہے۔

کرموں کو لڑکے کی پیدائش کی بہت تمنا تھی۔ ایک تو شادی کے پہلے سال تک اس کے گھر اولاد نہیں ہوئی تھی اور جب بالا آخر اللہ تعالی نے ریشماں کی گود ہری بھی کی تو لڑکی سے۔ ذکیہ کی پیدائش سے اگرچہ کرموں ذاتی طور پر خوش تھا لیکن اکثر خاندان والے طرح طرح کی باتیں بنانے لگے تھے۔ اب کرموں خدا تعالی کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا کہ اس نے اسے نر اولاد سے نوازا ہے۔ اس نے خوش ہو کر اللہ کے نام پر دونوں مقامی خانقاہوں پر نذرانہ چڑھایا اور مسجد کے فنڈ میں دس روپے دیئے۔ بعد میں ریشماں نے اسے بتایا کہ اس نے پانچ میل دور "چپ شاہ" کے مزار پر بھی منت مانی ہوئی

ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے بیٹا دیا یا تو وہ وہاں ایک بکرا اور ایک جھنڈا چڑھائے گی۔ اپنی آمد کے دو تین روز بعد کرموں یہ منت بھی پوری کر آیا۔

بچے کا نام رکھنے کا وقت آیا تو گاؤں کے مولوی صاحب نے اس کا نام عبدالفطرت رکھ دیا جو تین جماعت پاس کرموں کو تو پسند آیا لیکن ریشماں کی زبان پر آسانی سے نہ چڑھ سکا۔ وہ اسے ایک عرصے تک عبد عبدل کہتی رہی۔ لیکن کرموں اسے فطرت کہنا ہی پسند کرتا تھا۔ وہ اسے کھلونے کی طرح اوپر پھینکتا اور "فطری' فطری" کہہ کر ہاتھوں میں پکڑ لیتا تھا۔ ریشماں شور مچاتی رہ جاتی کہ عبدل ابھی چند دن کا ہے۔ اسے یوں اچھال اچھال کر نہ پھینک۔ اس کی آنتیں الٹ جائیں گی۔ دودھ اگل دے گا۔ یہ ہو جائے گا وہ ہو جائے گا۔ لیکن اس احتجاج کے باوجود کرموں جتنے روز رہا اپنے اکلوتے بیٹے سے جی بھر کر پیار کرتا رہا۔

یونہی ہنسی خوشی تین سال گزر گئے۔ کرموں محنت سے نوکری کرتا رہا اور ریشماں پوری لگن سے ذکیہ اور عبدل (فطرت) کی پرورش کرتی رہی۔ چار چھ مہینوں کے بعد کرموں چھوٹی آتا تو بیوی اور بیٹی کے لیے کپڑے اور بیٹے کے لئے کھلونے اور تصویروں والا انگریزی قاعدہ لیتا آتا۔ وہ جب بھی آتا پہلا قاعدہ پرزے پرزے ہو چکا ہوتا اور کرموں فطرت کے ہاتھ میں نیا قاعدہ تھما دیتا۔ اس کا خیال تھا کہ چھوٹی عمر سے ہی اسے یوں انگریزی کا شوق ہو گیا تو وہ آگے چل کر پڑھائی میں اچھا ہو جائے گا۔

ریشماں اور کمروں کی توقعات کے مطابق زندگی کا دھارا آگے بڑھتا رہا۔

اک دن کرموں اوکاڑہ میں دوپہر کے وقت ایک کھمبے پر تاریں ٹھیک کر رہا تھا کہ سنسان سڑک پر اسے کسی جوان لڑکی کی چیخ و پکار سنائی دی۔ "بچاؤ بچاؤ۔ بچاؤ" کرموں کیا دیکھتا ہے کہ دو غنڈوں نے کالج کی ایک لڑکی کو' جو غالباً بس نکل جانے کی وجہ اب پیدل ہی گھر جا رہی تھی' دبوچ رکھا ہے اور اسے اغوا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ گرمیوں کی اس دوپہر کو سب لوگ اپنے اپنے گھروں میں دبکے بیٹھے تھے اور بند کواڑوں

کے اندر اس بے بس آواز کو پہنچنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ شائد غنڈوں کو پتہ نہیں تھا کہ اوپر کھمبے پر کوئی شخص کام کر رہا ہے۔ انھوں نے سنسان سڑک پر اکیلی لڑکی کو دیکھ کر حملہ کر دیا تھا۔

URDU4U.COM

کرموں نے یک دم کھمبے سے چھلانگ لگا دی۔ ربڑ والا دستانہ نیچے پھینکا اور تاریں کاٹنے والے ہتھیار کے ساتھ غنڈوں کا مقابلہ کرنے لگا وہ آپس میں گتھم گتھا تھے کہ کہیں سے ہارن کی آواز آئی۔ غنڈے اپنا شکار چھوڑ کر بھاگنے لگے تو کرموں نے ان میں ایک کو اپنی مضبوط گرفت میں لے لیا۔ دوسرے نے تیز دھار چاقو سے اس کی گردن کے پچھلے حصے پر زبردست وار کیا اور بھاگ گیا۔

لڑکی کی جان اور عزت بچ گی۔

ڈاکو کو پولیس کے حوالے کر دیا گیا اور کرموں کو نازک حالت میں ہسپتال پہنچا دیا گیا۔ ڈاکو کو دس سال قید با مشقت سنائی گئی اور کرموں قید حیات سے ہمیشہ کے لئے آزاد ہو گیا۔

اخبارات نے اس واقعہ کو خوب اچھالا غنڈہ گردی کی مذمت کی' شہریوں کی جان' مال اور عزت کی حفاظت کے لئے انتظامیہ کو اس کی ذمہ داریوں کا احساس دلایا اور کرم دین لائن مین کے جذبے کی دل کھول کر داد دی۔ زخمی اور مردہ حالت میں صفحہ اول پر اس کی تصویر شائع کی اور حکومت پر زور دیا کہ وہ مرحوم کے لواحقین کی ہر ممکن مدد کرے۔

بعض اخبار والے کھوج لگاتے لگاتے کرم دین کے گاؤں پہنچے۔ جہاں کرموں کی غیر معمولی بہادری کی وجہ سے پورے خاندان میں صف ماتم بچھ چکی تھی۔ ریشماں ذکیہ اور فطرت کا مستقبل تاریک ہو چکا تھا۔ زمینیں پہلے ہی سیم اور تھور نگل چکی تھی اور کرموں کو اب موت نگل گئی تھی۔ مصائب زمانہ سہنے کے لئے ریشماں اور اس کے دو بچے اکیلے رہ گئے تھے۔

اخبار والوں نے ریشماں کا انٹرویو لیا۔ بچوں سمیت اس کی تصویریں اتاریں گاؤں والوں

سے کرم دین کے خاندانی پس منظر' جوانی کے حالات' کردار اور مشاغل کے بارے میں پوچھا اور واپس جا کر اپنے اخبار میں خوبصورت فیچر شائع کئے۔

URDU4U.COM

اس پبلسٹی کا اثر یہ ہوا کہ کرم دین کے محکمے نے صرف اس کے تمام واجبات اور پنشن وغیرہ فوراً ادا کر دی بلکہ محکمے کے سربراہ نے اپنی خصوصی اختیار استعمال کرتے ہوئے کرم دین کی بیوہ کے لئے دو ہزار روپے کی خصوصی امداد بھی منظور فرما دی۔

گاؤں والے جو چند ہفتے پہلے ریشماں پر رحم کھا رہے تھے اب ہزاروں روپے مہینے پر اس سے حسد کرنے لگے۔ کئی لوگ دبی زبان میں یہ کہتے سنے گئے کہ کرموں کیا مرا' ریشماں کی تو لاٹری نکل آئی۔ اب گھر میں بیٹھ کر کھائے گی اور مزے کرے گی۔ کرموں زندہ رہتا تو ریشماں کبھی بھی یکمشت دو ہزار روپے نہ دیکھ پاتی۔ بس کایا پلٹ گئی ہے اس کی تو۔ خیر جتنے منہ اتنی باتیں۔ جو ریشماں کے دل پر بیت رہی تھی وہ کسی کو معلوم نہ تھا۔

حکومت نے اخباری فیچرؤں اور تبصروں کے بعد کرم دین اور ڈاکوؤں کے درمیان مقابلے کی تفصیلات طلب کیں۔ جب اسے پتہ چلا کہ کرموں کا نہ تو غنڈوں سے کوئی ذاتی بیر تھا اور نہ نوجوان لڑکی سے کوئی رشتہ داری تھی بلکہ محض انسانی جذبے کے تحت وہ اس لڑکی کی عزت بچانے کے لئے اپنی جان پر کھیل گیا تو حکومت نے اسے (بعد از وفات) بہادری کا تمغہ دینے کا اعلان کیا۔ ریشماں تک یہ خبر نہ پہنچ سکی۔ اسے تو اس وقت پتہ چلا ۱۴ اگست سے چند روز پہلے تحصیل ہیڈ کوارٹر سے ایک کارندہ آیا اور ریشماں کو سمجھانے لگا کہ "مائی (حالانکہ وہ ایسی بوڑھی نہ تھی) سرکار نے کرم دین مرحوم کی بہادری کی بڑی قدر کی ہے۔ اسے ایک تمغہ دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ تم تیار رہنا۔ بے شک اپنے بیٹے کو بھی ساتھ لے لینا۔ تمہیں گورنر جنرل صاحب خود تمغہ دیں گے۔ بڑے لاٹ صاحب! انہوں نے کراچی سے حکم بھیجا ہے کہ آپ کو ۱۴ اگست سے پہلے پہلے کراچی پہنچایا جائے۔ کیوں اماں سمجھ گئی ہو نا؟"

"ہاں بیٹا' سمجھ تو گئی ہوں لیکن میں نے تو آج تک کراچی دیکھا نہیں' میں وہاں کیسے پہنچوں گی۔ کہاں ٹھہروں گی"۔

"آپ اس کا بالکل فکر نہ کریں۔ اس کا بندوبست ہمارے ذمے ہے۔ سارا انتظام موجود ہے۔ آپ صرف گاڑی میں بیٹھنے کے لئیار رہیں۔ میں یا ہمارا کوئی اور آدمی بارہ تاریخ کو آپ کو لینے آ جائے گا۔ بس اسی وقت کے لگ بھگ"

"ٹھیک ہے' بیٹا' میں تیار ہی ہوں' میں نے کون سے سوٹ سلوانے ہیں' صندوق میں ایک دھلا ہوا جوڑا رکھا ہے' نکال کر پہن لوں گی۔ اور ہاں' آپ مجھے واپس بھی پہنچا دیں گے نا"

"ہاں ہاں۔ بالکل! مائی تم تو سرکار کی مہمان ہو۔ تمہارے میاں تو بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔ اتنا بڑا کارنامہ تو جب سے پاکستان بنا ہے کسی نے انجام نہیں دیا۔ تم فکر نہ کرو۔ ہم تمہیں لے جائیں گے اور واپس گھر پہنچا دیں گے"

۱۴/اگست کو گورنر جنرل ہاؤس کراچی دلہن کی طرح سجایا گیا تھا۔ رات کو چراغاں کرنے کے لئے اس پر شکوہ عمارت کے چاروں طرف تاروں میں پروئے ہوی قمقموں کے جال بچھائے گئے تھے جو دن کے وقت روشن نہیں کئے گئے تھے۔ جی جی ہاؤس کو جانے والی سڑک پر صفائی کر کے اچھی طرح چھڑکاؤ کیا جا چکا تھا۔ گیٹ سے عمارت تک طرح طرح کے پھول اور پودے دونوں طرف سجے ہوئے تھے۔ اندر پورچ کے پاس باوردی محافظ کھڑے تھے۔ ہال کے اندر سٹیج کے دونوں جانب ایوارڈ پانے والوں کے لئے نشستیں مخصوص تھیں اور سامنے اعلیٰ افسروں' سفیروں اور معززین شہر کے لئے سیٹیں لگائی گئی تھیں۔

پورے ہال میں قیمتی قالین بچھے تھے اور سٹیج پر ایک نایاب قسم کا ایرانی قالین سج دھج دکھا رہا تھا۔ سٹیج کے دونوں جانب لکڑی کے سٹینڈ پر پیتل کے کھلے منہ والے دو پیالے رکھے ہوئے تھے۔ جن میں خوبصورت پودوں کے بڑے بڑے گلدستے سجے ہوئے تھے۔

ریشماں کو اپنے چار سالہ بیٹے سمیت سٹیج کے بائیں جانب اپنی مخصوص نشست پر بٹھا

 © Urdu4U.com

دیا گیا۔
تقریب کی کاروائی کا آغاز تلاوت قرآن پاک سے ہوا۔ اس کے بعد کیبنیٹ سیکرٹری نے انعام یا ایوارڈ پانے والوں کے نام اور ان کے کارنامے فرداً فرداً پڑھ کر سنانے شروع کئے۔ ہر کارنامے کی تفصیل پڑھنے کے بعد متعلقہ شخص تالیوں کی گونج میں اپنی نشست سے اٹھتا' سب کی نگاہوں میں سٹیج پر جاتا جہاں گورنر جنرل اسے ایوارڈ عطا کرتے اور وہ پہلے سے زیادہ زور دار تالیوں کی گونج میں واپس آ کر اپنی سیٹ پر بیٹھ جاتا۔

جب ریشماں کی باری آئی تو کیبنیٹ سیکرٹری نے ایک چھپے ہوئے کاغذ سے پڑھتے ہوئے اعلان کیا کہ

"چودہ جون کی ایک سنسان دوپہر کو لائن میں کرم دین ولد رحم دین اوکاڑہ شہر کی کالونی روڈ پر ایک کھمبے پر چڑھ کر تاریں ٹھیک کر رہا تھا۔ مقامی کالج کی ایک طالبہ مس نازنین(کلاس سیکنڈ ائر) کالج سے واپس آ رہی تھی کہ دو غنڈوں نے اس پر اچانک حملہ کر دیا۔ بے بس لڑکی مدد کے لئے چیخی لیکن وہاں اس کی مدد کے لئے کوئی نہ تھا۔ کرم دین نے کھمبے پر مدد کی یہ پکار سنی تو اس نے کھمبے سے چھلانگ لگا دی۔ غنڈوں کا بہادری سے مقابلہ کیا۔ ایک غنڈہ بھاگ گیا' دوسرا گرفتار ہو گیا۔ مس نازنین کی جان اور عزت بچ گئی۔ لیکن کرم دین غنڈوں کے ہاتھوں شدید زخمی ہو گیا اور وہ زخموں کی تاب نہ لا کر اسی دن ہسپتال میں فوت ہو گیا۔

"حکومت نے کرم دین کی قابل فخر احساس ذمہ داری اور اپنے فرض سے بڑھ کر جرات مندانہ رویئے کا مظاہرہ کرنے پر اسے تمغہ شجاعت (بعد از وفات) دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ یہ تمغہ چوہدری کرم دین شہید کی بیوہ مسماہ ریشماں بیگم وصول کریں گی۔ ان کے ساتھ اس کا بیٹا فطرت ہے۔" (تالیاں ہی تالیاں)

ریشماں تالیوں کی گونج میں جب سفید برقعہ پہنے تمغہ لینے کے لئے اٹھی تو اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو بہہ رہے تھے جو اس نے سرکاری قالین پر گرانے کی بجائے اپنے برقعے کے پلو میں جذب کر لئے۔ اس کے دائیں ہاتھ کی انگلی پکڑے ننھا فطرت چپ

چاپ اس کے ساتھ چل رہا تھا۔ یہ سارا ڈرامہ فطرت کی سمجھ سے بالا تھا۔ وہ اس سارے حال بلکہ ساری دنیا میں صرف اپنی ماں کو پہچانتا تھا اور اسی کی انگلی کے سہارے آگے بڑھ رہا تھا۔ وہ دونوں سٹیج پر پہنچے۔ گورنر جنرل صاحب نے سبز رنگ کی ڈبیا کھول کر چمکتا ہوا تمغہ ریشماں کو دکھا کر اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ فطرت کے گالوں کو پیار سے تھپتھپایا اور یوں اپنے فرض سے سبکدوش ہو گیا۔ ریشماں ایک مٹھی میں فطرت کا بازو پکڑے اور دوسری مٹھی میں تمغہ سنبھالے واپس اپنی سیٹ پر آ گئی۔ سٹیج سے سیٹ تک سارا راستہ تالیوں نے اس کا ساتھ دیا۔ ریشماں کا بالکل نہ سمجھ سکی کہ یہ تالیاں کس خوشی میں بجائی جا رہی ہیں۔ اس کی بیوگی پر فطرت کی یتیمی پر!

تقریب کے بعد ریشماں اور فطرت کو بحفاظت واپس چک نمبر ۲۳۰ (گ۔ ب) پہنچا دیا گیا۔

کراچی والی تقریب کی چمک دمک بڑی عارضی ثابت ہوئی۔ جب ریشماں فطرت سمیت واپس گھر پہنچی تو اس پر مصیبتوں کے پہاڑ لوٹنے لگے۔ سب سے پہلا وار اس کے مرحوم شوہر کے بڑے بھائی شرف دین (عرف شرفو نے کیا' اس نے کرم دین کی ساری بچی کھچی زمین پر قبضہ کر یا اور مرضی سے کاشت کرنے لگا جب سرکاری عملہ سیم زدہ زمین کا سروے کرنے آیا تو شرف دین نے کرم دین کی اور اپنی زمین کا مشترکہ حساب کر کے انہیں بتا دیا کہ ہماری اتنی زمین بنتی ہے اگر اس کا کچھ علاج ہو سکے تو "میں" اس زمین سے اتنا غلہ پیدا کر سکتا ہوں وغیرہ۔

ریشماں نے اس زیادتی کے خلاف احتجاج کیا۔ سب سے پہلے شرفو سے کہا کہ وہ اپنے مرحوم بھائی کے بیوی بچوں سے ایسا سلوک روا نہ رکھے لیکن اس نے جواباً اور بھی سخت رویہ اختیار کیا اور کہا شاید تم نہیں جانتی کہ کرم دین نے جس زمین پر اپنا مکان بنایا تھا اور آج کل تم جس میں رہ رہی ہو وہ میری ہے۔ ابھی تک میرے نام ہے۔ اگر زیادہ بکواس کی تو تمہیں اس مکان سے باہر پھینک دوں گا۔

 © Urdu4U.com

ریشماں نے گاؤں کے چودھریوں سے کہا کہ وہ شرفو کو سمجھائیں اور اسے اس قسم کی باتوں سے باز رکھیں لیکن یہ دیکھ کر ریشماں کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ سارے گاؤں والوں کی آنکھیں بدل گئیں۔ انہیں چودھری کرم دین مرحوم کا لحاظ رہا نہ یتیم بچوں کا خیال۔ کسی نے بھی مرحوم کرموں کی خاطر زندہ شرفو کو ناراض کرنا مناسب نہ سمجھا۔

URDU4U.COM

دوسرا اور ریشماں کے میکے کے ایک شخص چہدری سکندر نے کہا۔ وہ ریشماں کے گھر آیا۔ کرموں کی وفات پر افسوس اور تمغہ شجاعت ملنے پر خوشی کا اظہار کیا اور ہمدرد بن کر ریشماں کے دکھ درد سننے لگا۔ سادہ لوح ریشماں جو سسرال والوں کے رویئے سے مایوس ہو چکی تھی۔ میکے سے آنے والے اس شخص کی باتوں میں آ گئی۔ اس نے ریشماں سے کہا "بہن آج کل چوری چکاری کا زمانہ ہے' پڑوس میں شرفو اور اس کے خاندان والوں کا رویہ بھی خراب ہے۔ پتہ نہیں کب کوئی تمہارے نقد پیسے اور زیور وغیرہ پر ہاتھ مار لے۔ کہاں تھانوں میں رپٹ لکھواتی پھرو گی۔ اول تو رپٹ کوئی نہیں لکھے گا اور اگر لکھ بھی لی تو تمہاری حمایت میں کوئی گواہی نہیں دے گا۔ تم نے کرم دین مرحوم کی وفات کے ایک سال کے اندر دیکھ لیا کہ لوگ کتنی جلدی آنکھیں پھیر لیتے ہیں"

"تو بھائی مجھے کیا کرنا چاہیئے"

"میری مانو تو زیور اور نقدی شہر کے بنک میں جمع کرا دو بنک حکومت کی گارنٹی سے چلتے ہیں وہاں رقم بھی محفوظ رہے گی اور خرچے کے لئے سود بھی آتا رہے گا۔ آرام سے تمہارے بچے پل جائیں گے۔ فطرت بڑا ہو یا ذکیہ بیٹی کی شادی کا وقت آیا تو اپنی رقم پوری یا آدھی نکلوا لینا۔ اللہ اللہ خیر سلا۔"

"لیکن بھائی سکندر میں نے تو بنک کا منہ بھی نہیں دیکھا' مجھے ان جھمیلوں کا کیا پتہ کہ پیسے کیسے جمع کرواتے ہیں' گہنے کیسے بنک میں رکھتے ہیں' سود کیسے ملتا ہے میں تو

ان پڑھ ہوں۔ بالکل ان پڑھ۔"

"بہن اگر مجھ پر اعتبار کرو تو تمہاری خاطر میں یہ کام کر دوں گا۔ شہر میں میرا آنا جانا تو رہتا ہے۔"

"لو بھائی تم پر اعتبار نہیں کروں گی تو کیا شرفو اور اس کے کنبے والوں پر کروں گی۔ آخر تو میرے میکے گاؤں کا ہے۔ چاچی فاطمہ کا تو اپنے آپ کو بھتیجا بتاتا ہے۔ میں شادی سے پہلے تمہارے گھر نہ سہی فاطمہ کے گھر کئی مرتبہ چکی ہوں۔ میں اسے بہت اچھی طرح جانتی ہوں۔"

اس کے بعد وہ اٹھی اور پچھلی کوٹھڑی میں لکڑی کے بڑے صندوق کو کھولنے لگی اس نے کوٹھڑی کا دروازہ بند کر کے رضائیاں' کھیس اور فالتو چادریں ایک طرف رکھیں۔ پھر ایک پوٹلی کھول کر اس سے رقم نکالی۔ چارپائی پر بیٹھ کر خرچی کے لئے کچھ رقم علیحدہ رومال میں باندھی اور ایک کپڑے میں باقی رقم اور زیور وغیرہ محفوظ کرئے پھر اسی ترتیب سے اس نے لحاف' رضائیاں اور کھیس صندوق میں واپس ڈالی۔ موٹا سا دیسی تالا لگایا اور چابی دیوار میں اونچی جگہ پر ایک سوراخ میں چھپا دی' پہلے وہ یہ چابی اپنے پراندے کے ساتھ باندھے رکھتی تھی لیکن جب سے اسے نقد روپیہ ملا تھا وہ زیادہ محتاط ہو گئی تھی۔ شیداں نے اس کے پراندے سے بندھی ہوئی چابی دیکھ کر کہا تھا کہ یہاں سے کاٹ لے گا اور ساری رقم چوری کر لے گا۔ چابی کو سنبھال کر رکھ کہیں گھر میں' اس کے بعد اس کے نیم تاریک کوٹھڑی کے ایک تاریک گوشے میں چابی سنبھال کر رکھ دی تھی۔

اپنا اثاثہ چوہدری سکندر کے حوالے کرنے سے پہلے ریشماں نے اپنے میکے والوں کے متعلق سوچا لیکن وہاں اسے کوئی ایسا شخص نظر نہ آیا جو اس کی مدد کر سکے۔ اس کے والدین پہلے ہی فوت ہو چکے تھے ایک شادی شدہ بہن تھی جو اس کی طرح ان پڑھ تھی اور ایک بھائی تھا جو ایک عرصے سے معذور ہو کر چارپائی پر پڑا تھا۔

ریشماں نے سوچ سوچ کر پوٹلی چوہدری سکندر کے حوالے کر دی۔
سکندر نے پوٹلی قبول کرتے ہوئے کہا:
"بہن تم بھی میرے ساتھ چلو۔ تمہارا کام تمہارے سامنے ہی ہو جائے تو اچھا ہے"
URDU4U.COM
"نہیں بھائی' میں کہاں جاؤں گی۔ فطرت چھوٹا ہے' ذکیہ اکیلی ہے۔"
اس کے باوجود چوہدری سکندر اصرار کر کے ریشماں کو فیصل آباد شہر لے گیا۔ وہاں اسے بینک کی انتظار گاہ میں بٹھایا۔ اندر سے ایک غلط سلط فارم لایا' اس پر ریشماں کے جھوٹے موٹے انگوٹھے لگوائے اور بینک کے اندر جا کر ساری رقم اپنے بریف کیس میں ڈال لی۔
واپسی پر اس نے ریشماں کے حوالے کے لئے فروٹ اور مٹھائی لے دی اور بیچاری زنانہ روایت کے مطابق سارے راستے سسرال والوں کو کوستی اور میکے والوں کو دعائیں دیتی رہی۔
ریشماں واپس گھر آ کر بھلے وقتوں کا انتظار کرنے لگی' وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ گھر کی پونجی ختم ہونے لگی۔ سیم اور تھور سے بچی ہوئی زمین سے وج فصل آئی وہ شرفو لے گیا اور بینک میں جو رقم جمع تھی اس کی آمدنی آنی تھی نہ آئی ریشماں کی پریشانیاں بڑھنے لگیں۔
ریشماں نے ایک مرتبہ پھر گاؤں والوں کے ضمیر پر دستک دی تاکہ وہ شرفو کو ریشماں کا حصہ ادا کرنے پر رضا مند کر سکیں لیکن کسی نے بھی شرفو سے ٹکر لینے کی حامی نہ بھر بلکہ انہوں نے بتایا کہ شرفو ہر کسی سے کہتا پھرتا ہے کہ مرحوم بھائی کی جائیداد پر میرا حق ہے' میرا بھتیجا نابالغ ہے' جوان ہو گا تو دیکھا جائے گا۔ اگر مجھے کچہری میں بھی جانا پڑا تو بیان دوں گا۔
ریشماں نے سوچا کہ اگر گاؤں والے جن کی وہ بہو بیٹی ہے اس کا ساتھ دینے کو تیار نہیں تو کچہری والے اس کے ساتھ کیا انصاف کریں گے۔ جہاں گواہ چاہیۓ' اثر و رسوخ چاہیۓ۔ اگر اس کے پاس یہ تین چیزیں ہوتیں تو کچہری جانے کی کیا ضرورت

تھی۔

ریشماں ایک دن تنگ آ کر فیصل آباد والے بینک میں پہنچ گئی تاکہ اپنی رقم' زیور اور اس کے سود کا پتہ کر سکے' وہاں کھڑکی کے اندر بیٹھے ایک بابو نے پوچھا۔

URDU4U.COM

"مائی' اکاونٹ نمبر؟

"وہ کیا ہوتا ہے"

"کوئی ایسا کاغذ' پرچی یا رسید جس سے پتہ چل سکے کہ آپ کا یہی حساب ہے"

"وہ تو سارے کاغذ مرشد آباد کے چوہدری سکندر کے پاس ہیں"

"مائی پہلے وہ کاغذ لاؤ' ان کے بغیر کچھ پتہ نہیں چل سکتا۔ یہاں ہر کام اکاونٹ نمبر سے ہوتا ہے"

ریشماں مایوس ہو کر واپس چک نمبر ۲۳۰ آ گئی۔

دو تین دن بعد وہ ذکیہ اور فطرت کو لے کر اپنے میکے چلی گئی شرفو اور اس کے گھر والے سمجھے کہ وہ تنگ آ کر گاؤں چھوڑ گئی ہے اور شاید اب نہیں آئے گی۔

میکے پہنچ کر اس نے رقم اور زیور کا کسی سے ذکر نہ کیا' اس نے سوچا کہ اپنی حماقت ظاہر کی تو بھابی الٹا ڈانٹے گی۔ اس نے رات اپنے بھائی کے گھر گزاری اور اگلی صبح چاچی فاطمہ کے گھر چوہدری سکندر کا پتہ کرنے گئی۔

فاطمہ نے بتایا "وہ تو کوئی ایک سال سے گاؤں نہیں آیا۔ کبھی سنتے ہیں' وہ کراچی میں ہے کبھی پتہ چلتا ہے کہ وہ دوبئ چلا گیا ہے۔ وہ پھیرو قسم کا آدمی ہے۔ کبھی یہاں کبھی وہاں۔ اس کا گھر گھاٹ تو کوئی ہے نہیں"

ریشماں چپ ہو گئی۔

فاطمہ نے کہا "تم سے کوئی روپیہ پیسہ تو نہیں بٹور لایا"

"تمہیں کیسے پتہ چلا"

تمہاری طرح کی ستائی ہوئی کئی عورتیں آتی رہتی ہیں۔ خاص کر گاؤں کی وہ عورتیں جو آڑوس پڑوس کے چکوں میں بیاہی ہوئی ہیں"

ریشماں کا دل پھٹنے لگا۔ اس کا جی چاہا کہ وہ کھل کر روئے فاطمہ سے سارے فراڈ کی پوری تفصیلات کہہ دے۔ واپس جا کر اپاہج کو اپنے ظلم و ستم کی داستان سنائے۔

URDU4U.COM

لیکن وہ صابر عورت تھی۔ہر رنج پی گئی۔ خاموشی سے ہر ستم سہ گئی۔ اور کسی سے کچھ کہے سنے بغیر واپس چک نمبر ۲۳۰ چلی گئی کیونکہ اس نے شادی کے وقت اپنی مرحوم ماں سے آخری نصیحت یہی سنی تھی کہ "بیٹی اب تیرا گھر چک نمبر ۲۳۰ ہے۔ تیرا جینا' تیرا مرنا ان کے ساتھ ہے۔ یہاں آنا تو خوش خوش آنا۔ اپنے غم' اپنے بوجھ برساتی نالے کے اس پار ہی چھوڑ آنا۔ اللہ تیرا والی ہو۔"

ریشماں چند دن ور گھر میں بیٹھی زمانے کے ظلم و ستم پر کڑھتی رہی۔

ایک دن پھر اس میں ہمت کی لہر آئی' اس نے ذکیہ اور فطرت کو گھر میں بند کیا۔ ڈیوڑھی کو تالا لگایا اور سیدھی تھانے چلی گئی' وہاں تھانے دار تو نہ ملا لیکن ایک باوردی آدمی مل گیا۔ اس نے رو رو کر اپنا سارا دکھڑا اس سے کہہ سنایا۔ جواب میں صرف ایک سوال آیا۔

"مائی' تم جو کچھ کہہ رہی ہو اس کا کوئی گواہ' کوئی ثبوت؟"

"نہیں پتر' چودھری سکندر کو رقم دینے اور زیور سپرد کرنے کا میرا کوئی گواہ نہیں۔ سوائے اللہ تعالی کے"

"مائی ہمارا قانون اللہ تعالی کی گواہی نہیں مانتا"

"میں قسم کھا سکتی ہوں' میں قرآن اٹھا سکتی ہوں کہ میں جو کچھ کہہ رہی ہوں بالکل صحیح ہے۔

"مائی یہاں قرآن کی گواہی اور قسمیں نہیں چلتیں"

"تو یہاں کیا چلتا ہے"

"یہاں گواہ چلتے ہیں' پیسہ چلتا ہے' اور اثر و رسوخ چلتا ہے۔ اگر تمہارے پاس یہ کچھ ہے تو اپنی رپٹ لکھوا دو ورنہ وہ دروازہ نظر آ رہا ہے۔ چلتی بنو۔ خالی جیب میرا وقت

ضائع نہ کرو"

وہ میلی چادر کی بکل مارے تھانے سے باہر نکل آئی۔

گھر لوٹنے سے پہلے اس نے سوچا کہ کیوں نہ تحصیل دار صاحب کا پتہ کرے جو ۱۲/ اگست کو اس کے گھر آئے تھے اور بڑی عزت سے پیش آئے تھے۔ وہ لوگوں سے تحصیل ہیڈ کوارٹر کا پتہ پوچھتے پوچھتے وہاں پہنچ گئی۔ تحصیل دار کے دفتر کے باہر ایک کارندے نے اسے دھتکار دیا۔ جب اس نے اصرار کیا تو کارندے نے کہا "جا' جا' مائی تحصیل دار صاحب دورے پر ہیں۔ پھر کسی دن پتہ کر لینا' آج نہیں مل سکتے وہ۔"

ریشماں واپس گھر چلی آئی۔ بھوکے بچوں کو کھانا کھلانے کے لئے آٹا گوندھا حسب معمول بڑی احتیاط سے ایک بڑی روٹی اور ایک چھوٹی روٹی (جسے وہ گلی کہتے تھے) پکائی۔ بڑی روٹی کے دو ٹکڑے کئے۔ ایک ٹکڑا ذکیہ کو دیا اور دوسرا فطرت کو' خود گلی پر گزارہ کیا۔ فطرت نے کہا "کیسے کھاؤں؟"

"منہ سے اور کیسے" ریشماں نے غصے سے کہا

"سوکھی روٹی گلے میں پھنس جاتی ہے"۔ فطرت نے بلک کر کہا۔

"گلے میں پھنس جاتی ہے تو وہ پانی کا گھڑا پڑا ہے اٹھ کر پیالہ پانی کا لے لے اور کیا تیرے لئے میں دودھ یا لسی لاؤں گی"

"سالن"

ریشماں نے ایک تھپڑ رسید کرتے ہوئے کہا "آیا سالن کھانے والا' شکر کر اللہ کا جس نے یہ رزق دیا ہے اگر تیرے چچا شرفو کے اختیار میں ہوتا تو یہ لقمہ بھی تیرے منہ سے چھین لیتا"

فطرت بات سمجھے بغیر کچی پکی بے ذائقہ روٹی پانی کی مدد سے چبانے لگا۔ یہ دونوں یتیم بچے کبھی باسی ٹکڑے کھا کر اور کبھی بھوکے پیاسے ہی سو جاتے اور ریشماں تفکرات کے سمندر میں ڈوب جاتی۔ چارپائی پر لیٹے لیٹے نجات کے راستے تلاش کرتی رہتی۔ لیکن

اس گھمبیر تاریکی میں اسے روشنی کی کوئی کرن دکھائی نہ دیتی۔ میکے کی طرف دیکھتی تو اپاہج بھائی کے سوا اسے کوئی نظر نہ آتا سسرال میں شرفو کا اثر و رسوخ غالب تھا' کچہریوں میں اللہ اور قرآن کی گواہی قابل قبول نہ تھی۔ وہ جائے تو کہاں جائے۔ کدھر جائے۔ ڈوب مرے۔ مر کھپ جائے۔

URDU4U.COM

جب اس کی سوچ پر مایوسی غالب آنے لگتی تو وہ بچوں کے مستقبل کا خیال کر کے کمر ہمت باندھ لیتی اور دل ہی دل میں کہتی "نہیں میں انہیں بھکاری اور گداگر نہیں بننے دوں گی۔ میں خود مروں گی نہ انہیں مرنے دوں گی۔ یہ میرے مرحوم شوہر کی نشانی ہیں۔ میں دل و جان سے ان کی پرورش کروں گی۔ پوری روٹی نہیں تو آدھی روٹی سے پالوں گی دودھ سے نہیں تو پانی سے پا لوں گی"

ایک رات وہ انہی خیالوں میں ڈوبی ہوئی تھی کہ اسے چھت پر کسی شخص کا ہیولا نظر آیا۔ وہ ڈر کر اٹھ بیٹھی' رات خاصی فگز رچکی تھی' لوگ بہت پہلے عشا کی نماز

پڑھ چکے تھے' کیا یہ کوئی چور ہے؟ ڈاکو؟۔ ریشماں اپنے دفاع کے لئے اٹھ کر ڈنڈا ڈھونڈنے لگی اتنے میں سایہ سیڑھیاں اتر آیا۔

"میں رابعہ ہوں" (یہ ریشماں کی پڑوسن تھی جو پچھواڑے میں رہتی تھی)

"تم نے تو مجھے ڈرا ہی دیا۔ رابعہ' اس طرح چوروں کی طرح آنے کی کیا ضرورت تھی"

"تم نہیں جانتی ریشماں۔ شرفو کی عادت کو' جو کوئی تیری پاس آتا ہے وہ اس کے خلاف ہو جاتا ہے وہاں تو میں تمہیں بتانے آئی تھی کہ میں تیرے غم جانتی ہوں' تم زمانے سے تنگ آ کر کبھی کرموں پکارتی ہو اور کبھی اللہ تعالٰی کو آواز دیتی ہو لیکن تیری فریاد سن کر نہ کرموں قبروں سے اٹھ کر آیا نہ اللہ تعالٰی عرش سے اتر کر تیری مدد کو پہنچا۔ مجھے تو تمہاری مصیبتوں کا ایک ہی حل نظر آتا ہے"

"وہ کیا"
"شرفو سے نکاح کر لو۔ دو بیویاں اسلام میں ویسے بھی جائز ہیں"
"شرفو کا نام نہ لینا میرے سامنے۔ رابعہ۔ شرفو سے بڑا شیطان میں نے کوئی نہیں دیکھا

URDU4U.COM

میرا مستقبل شادی سے نہیں فطرت اور ذکیہ سے وابستہ ہے' میں انہی کے لئے جیوں گی اور انہیں کے لئے مروں گی"
"سوچ لو' بہن۔ اگر اللہ اور اس کے فرشتے مدد کے لئے نہ پہنچیں تو انسانوں کو شیطانوں سے سمجھوتہ کرنا ہی پڑتا ہے۔ آگے تمہاری مرضی!"
"میرا ایمان اتنا کمزور نہیں رابعہ۔ اگر تم اس کا پیغام اس کی مرضی سے لے کر آئی ہو تو جا کر اس سور' کتے اور ذلیل کو بتا دو کہ میں اس کے منہ پر تھوکنے کو بھی تیار نہیں" رابعہ نے اٹھتے ہوئے کہا "اگر میں نے یہ سب کچھ اسے بتا دیا تو وہ تمہاری بوٹی بوٹی کر دے گا"
"ایسی جرات اس جیسے ذلیل کتوں میں نہیں ہو سکتی۔"
رابعہ جس راستے سے آئی تھی اسی راستے سے واپس چلی گئی۔
اگلی صبح ریشماں مولوی نیک عالم سے درخواست لکھوانے مسجد میں گئی مولوی صاحب ابھی ابھی نماز فجر کے بعد تلاوت قرآن پاک سے فارغ ہوئے تھے' انہوں نے خندہ پیشانی سے ریشماں کا استقبال کیا لکڑی کے تخت پوش پر بیٹھا اور پوچھا۔
"آج کیسے راستہ بھول گئیں' ریشماں"
"مولوی جی۔ درخواست لکھوانی تھی"
"کس کے نام" "اللہ کے نام"
"مذاق نہ کرو' ریشماں! درخواست تو لوگ ڈپٹی کمشنر کے نام لکھواتے ہیں' پولیس کپتان کے نام لکھواتے ہیں' گورنر کے نام لکھواتے ہیں مگر تم....."
"میں نے ان سب کے نام درخواستیں بھیجی ہیں' میرے پاس ڈاک خانے کی رجسٹری کی یہ رسیدیں ہیں۔ مگر ان کا کوئی جواب نہیں آیا۔ کہتے ہیں جب تک درخواست پیروی

URDU4U.COM

نہ کی جائے کچھ نہیں بنتا۔ بھلا میری طرف سے پیروی کون کرے گا۔ میں بڑی مجبور اور لاچار ہو کر آپ کے پاس آئی ہوں۔ آپ پانچوں وقت اللہ کا نام لیتے ہیں۔ سارے گاؤں کو نماز پڑھاتے ہیں۔ خدا کے واسطے میری درخواست اس تک پہنچا دو جس نے مجھے، آپ کو اور ہم سب کو پیدا کیا ہے۔ وہ ہمیں پیدا کر کے کیوں بھول گیا ہے۔

کیوں بھول گیا ہے؟"

"ایسا نہ کہو۔ یہ کلمہ کفر ہے"

"میں زمانے سے اتنی تنگ آ چکی ہوں مولوی صاحب کہ اب مجھ میں کلمہ حق کہنے کی ہمت نہیں۔ میں تنگ آ کر، بہت ہی پریشان ہو کر، کلمہ کفر کہنے پر مجبور ہوئی ہوں۔ میرے بچے تین دن سے بھوکے ہیں، میں ایک ہفتے سے پانی اور باجرے کے دانوں پر گزارہ کر رہی ہوں۔ میں کہاں جاؤں، کدھر جاؤں؟ میری فریاد کوئی نہیں سنتا۔ اللہ بھی گونگا، بہرہ اور اندھا ہو گیا ہے۔"

"چپ رہو، ریشماں۔ چپ رہو۔ خدا کے عذاب سے ڈرو۔"

"اس سے بڑا عذاب میرے لئے اور کیا ہو گا کہ میرے خاوند نے ایک نیک کام کے لئے جان دی اور آج اس کے بچے بھوک سے بلبلا رہے ہیں۔"

"بچوں کی بھوک کا بھی علاج ہو سکتا ہے۔"

"اللہ تیرا بھلا کرے، جلدی بتا۔ جلدی"

"عقد ثانی کر لو"

"وہ کیا ہوتا ہے؟"

"دوسرا نکاح"

"کس سے؟"

جس سے چاہو، ویسے میں بھی یہ نیکی کرنے کو تیار ہوں۔"

ریشماں کو شدید جھٹکا لگا لیکن وہ ضبط کر گئی۔

"مگر آپ کی تو بیوی ہے، مولوی صاحب"

"ہے تو سہی لیکن وہ ذرا بیمار سی رہتی ہے۔ ویسے اسلام عقد ثانی کی اجازت دیتا ہے۔

اسلام میں "عورتوں کا مقام" نامی کتاب میں لکھا ہے کہ اسلامی جنگوں میں مسلمان شہید ہو گئے تو مردوں کو ایک سے زیادہ شادیاں......" ریشماں کو مولوی صاحب کی باتوں سے اتنا صدمہ پہنچا کہ وہ ان کی بات مکمل ہونے کا انتظار کئے بغیر چلی گئی۔

ریشماں نے گھر جا کر پچھلی کوٹھڑی میں پڑا ہوا لوہے کا بکس کھولا اس میں سے ڈبیہ سمیت تمغہ نکالا۔ بغل میں دبایا۔ ذکیہ اور فطرت کو جھوٹی تسلی دے کر حسب معمول گھر میں بند کیا اور خود فیصل آباد شہر چلی گئی۔

وہ ایک صراف کے پاس گئی' بکل میں سے خوبصورت ڈبیا نکال کر اسے دکھائی اور کہا "بھائی اس تمغے کا جو کچھ بنتا ہے مجھے دے دو' پیسوں کی سخت ضرورت ہے"

سنار نے ایک نظر تمغے کو دیکھ کر کہا۔ "بی بی یہ تانبے کا ہے اس کا کچھ نہیں مل سکتا"

یہ کہہ کر اس نے تمغہ ریشماں کو واپس کر دیا ریشماں کا جی چاہا کہ اسے نالی میں پھینک دے' ایسے تمغے کا کیا فائدہ جو نہ اس کی بھوک مٹا سکتا ہے نہ اس کے مصائب کو کم کر سکتا ہے۔ لیکن کچھ سوچ کر اس نے ڈبیہ کو دوبارہ بغل میں چھپا لیا۔

وہاں سے تحصیل دار صاحب کا دفتر قریب ہی پڑتا تھا وہ وہاں چلی گئی۔ باہر کھڑے چپڑاسی نے پہلے کی طرح اسے دھتکار دیا لیکن ریشماں نے ہمت نہ ہاری اس نے تمغے والی ڈبیہ دکھائی اور کہا تحصیل دار صاحب مجھے جانتے ہیں انہوں نے مجھے خود کہا تھا کہ تم جب چاہو میرے پاس آ سکتی ہو"

تحصیل دار صاحب نے اسے کرسی پر بٹھایا' ٹھنڈا شربت پلایا' اس کی ساری داستان غم سنی اور کہا:

"میں آپ کے سارے غم تو دور نہیں کر سکتا۔ اگر کوئی خاص کام میرے لائق ہو تو کہو میں کرنے کو تیار ہوں"

"مجھے شہر میں کوئی کام دلوا دیں۔"

"کیا کام کرو گی؟"

"میں گھر کا سارا کام کر سکتی ہوں' کھانا پکانا' صفائی' جھاڑ پونچھ' برتن مانجھنا کپڑے دھونا"

تحصیل دار صاحب نے نوکری دلانے کا وعدہ کر لیا۔

URDU4U.COM

ریشماں سہ پہر کو واپس چک نمبر ۲۳۰ پہنچی تو گاؤں کے باہر ہی شرفو اسے مل گیا' اس نے پیشہ ور غنڈوں کی طرح اس کا راستہ روک کر پوچھا۔

"کہاں گئی تھی۔ تو"

"تو کون ہوتا ہے۔ پوچھنے والا"

"میں اس گاؤں کا چوہدری ہوں۔ کرموں کا بھائی ہوں' تم جس طرح روز معصوم بچوں کو اندر بند کر کے پھرتی رہتی ہو کبھی بینک میں جاتی ہو۔ کبھی تحصیل میں جاتی ہو۔ کبھی مولوی صاحب سے ملتی ہو کبھی کسی اور کے پاس چلی جاتی ہو۔ تم نے تو ہمارے خاندان میں ناک کٹوا دی ہے۔ ہماری عزت خاک میں ملا دی ہے"

"عزت کے رکھوالے بنے پھرتے ہو۔ ذلیل' کتے۔ ہٹ جاؤ میرے راستے سے"

"ہائیں تیری یہ جرات" یہ کہہ کر شرفو نے سر عام ریشماں کو پیٹنا شروع کر دیا۔ وہ نڈھال ہو کر گر پڑی۔ گاؤں والوں نے بڑھ کر اس کی جان بچائی۔

وہ گاؤں جسے ادیب اور شاعر جنت نظیر لکھتے ہیں' ریشماں اور اس کے دو بچوں کے لئے دوزخ بن گئی۔ وہ آخر کار چبھتے طعنے' چیختے فاقے' جنس زدہ مولوی اور انا خوردہ شرفو کو پیچھے چھوڑ کر کوچ کر گئی۔ کرموں کی ڈیوڑھی پر تالا پڑ گیا۔

تحصیل دار کی مہربانی سے ریشماں کو فیصل آباد شہر کے جس میں نوکری وہ شریفوں کا گھر تھا۔ شیخ رفیق احمد شہر کے معزز اور عمر رسیدہ بزنس مین تھے۔ ان کی اپنی تو کوئی فیکٹری یا کارخانہ نہ تھا لیکن اکثر کارخانوں کا مال انہی کے ہاتھوں سے گزر کر صارفین تک پہنچتا تھا۔ وہ ٹیکسٹائل اور کپاس کے تھوک کے بیوپاری تھے۔ شہر میں ان کی بہت بڑی دکان اور کئی گودام تھے۔

شیخ رفیق کئی دفعہ حج کر چکے تھے۔ انہوں نے چھوٹی سی ڈاڑھی رکھی ہوئی تھی جس کے زیادہ تر بال سفید تھے۔ ان کا قد درمیانہ چہرہ نورانی تھا۔ وہ عموماً شلوار کرتہ اور سفید ہی پگڑی باندھتے تھے۔ پگڑی کو کبھی کلف نہیں لگواتے تھے۔ اس لئے ان کی ململ کی پگڑی بھی ان کی شخصیت کی طرح ملائم تھی۔ وہ کچہری بازار میں اپنی وسیع دکان میں تخت پوش پر گدا بچھا کر اور گاؤ تکیہ لگا کر بیٹھتے تھے۔ دن بھر ٹیلیفون سنتے' حقہ پیتے' ظہر اور عصر کی نماز ساتھ والی مسجد میں ادا کرتے اور مغرب سے پہلے گھر واپس آ جاتے۔ ان کے قابل اعتماد کارکن ان کے بعد بھی کام کرتے رہتے۔

شیخ صاحب کی کوٹھی امین پور بازار کے پیچھے عیدہ گاہ کے قریب واقع تھی۔ اس کے دونوں طرف سڑک لگتی تھی۔ لیکن کوٹھی کارہائی حصہ سڑک سے ہٹ کر اندر کی طرف تھا۔

رہائشی کمروں کے پیچھے ایک وسیع صحن تھا جس کے آخری سرے پر دو سرونٹ کوارٹر تھے جن کا راستہ پچھلی گلی میںب ھی کھلتا تھا۔ اگرچہ نوکروں کو سامنے والے گیٹ سے آنے جانے کی ممانعت نہیں تھی لیکن زیادہ تر وہ پچھلا دروازہ ہی استعمال کرتے تھے۔ جھاڑو لگانے والا' دودھ دینے والا' کپڑے دھونے والا اور اس قبیل کے دوسرے لوگ عموماً پچھلی گلی سے آتے جاتے تھے۔ البتہ اخبار والا سامنے والے گیٹ سے آتا اور سائیکل سے اترے بغیرا خبار ہوا میں لہرا کر اندر پھینک جاتا۔ گھر کا کوئی نہ کوئی ملازم اخبار اٹھا کر کوٹھی کے گول برآمدے میں پڑی میز اور کرسیوں پر ڈال دیتا اور اندر شیخ صاحب کو بیڈ روم میں پہنچا دیتا۔

اللہ تعالٰی نے شیخ صاحب کو بہت سی نعمتوں سے نوازا تھا' ان کے پاس دولت تھی' صحت تھی' عزت تھی لیکن بدقسمتی سے اولاد کوئی نہ تھی۔ انہوں نے ساری عمر ایک ہی بیوی پر قناعت کی اور جوانی میں رشتہ داروں اور دوستوں کے اصرار کے باوجود اولاد کی خاطر بھی دوسری شادی نہ کی۔ ساجدہ پچھلے بیس برسوں سے ان کی رفیق تھیں اور آخری دم

تک ان کا ساتھ دینا چاہتی تھیں۔

ساحرہ نے گھر کی رونق کے لئے اپنی چھ سات سالہ بھانجی نسرین پال رکھی تھی تا کہ اتنا بڑا گھر اسی سونا سونا نہ لگے۔ نسرین ایک خوبصورت' چست اور ذہین بچی تھی جو تتلی کی طرح سارے گھر میں پھدکتی رہتی تھی۔

URDU4U.COM

اگرچہ ساحرہ کی شخصیت اب بھی بہت جاذب تھی لیکن اگر اس کی موجودہ عمر سے دس پندرہ سال منفی کر کے دیکھا جائے تو وہ واقعی ساحرہ لگتی تھی۔ لانبا قد' کمر تک لٹکے ہوئے لانبے بال' پتلی کمر جو بچے نہ ہونے کی وجہ سے اب بھی پتلی تھی۔ ابھرا ہوا سینہ جو بانجھ ہونے کی وجہ سے اپنی جگہ محکم اور پائیدار تھا۔ ڈھلتی جوانی کے بس دو ہی آثار تھے ماتھے کے اوپر دائیں کنپٹی پر لٹکتی ہوئی سفید بالوں کی لٹ اور گلے میں جھریوں کے دو تین ہار جو گردن جھکانے سے پانچ چھ ہار بن جاتے تھے۔

ساحرہ ایک پڑھی لکھی سلجھی ہوئی خاتون تھی جس کے چہرے پر اولاد کی حسرت نہ ہوتی تو وہ آج بھی دو شیزاؤں کو مات کر دیتی۔ ساحرہ (جو بیگم شیخ کے نام سے زیادہ جانی جاتی تھی) زندگی کی ایک اور ہی ڈگر کی عاری ہو چکی تھی۔ نمازیں' روزے' زکوہ میلاد' خیرات' غریب پروری! اس کے علاوہ شیخ صاحب کے ساتھ رہتے رہتے اب وہ بھی خاموش اور سنجیدہ ہو گئی تھی وہ اکثر شلوار قمیص اور کبھی کبھی ساڑھی پہنتی تھی۔ سلجھے ہوئے رنگوں کی ساڑھیوں میں اس کی سلجھی ہوئی شخصیت اور بھی نکھر آتی تھی۔ وہ بہت کم تقریبات میں جاتی تھی لیکن اس کے ہاں متوسط اور غریب طبقے کی عورتیں اکثر رہتی تھیں۔ شیخ صاحب کا زیادہ وقت کاروبار کی نذر ہو جاتا تھا اس لئے گھر کا سارا کاروبار بیگم صاحبہ کے ہاتھ میں تھا۔

بیگم شیخ نے ریشماں اور اس کے دو بچوں کو ایک سرونٹ کوارٹر دے دیا۔ کوارٹر میں پہلے ہی ایک چارپائی' ایک سٹول اور ایک کرسی رکھی تھی۔ اب اس نے وہاں ایک اور

چارپائی اور بستر کے لئے پرانے کپڑے وغیرہ بھجوا دیئے۔ ریشماں کو یہ کوٹھڑی بہت بڑی پناہ گاہ لگی۔ اس کو اپنے گاؤں والے کھلے کھلے گھر کی نسبت اس تنگ کمرے

URDU4U.COM

میں بہت زیادہ تحفظ کا احساس ہوا۔
اس نے خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا اور بیگم شیخ کی نگرانی اور ہدایت میں گھر کا سارا کام سنبھال لیا۔
شیخ صاحب کے گھر میں دو اور ملازم تھے ایک بوٹا خاں' جو گھر کا کام کاج کرتا تھا۔ مہمانوں کی تواضع کرتا تھا۔ باہر سے سودا سلف لاتا تھا اور ساتھ والے سرونٹ کوارٹر میں اکیلا رہتا تھا۔ ریشماں کے آ جانے سے اسے باورچی خانہ کے کام سے چھٹی مل گئی تھی۔ اب اس کے ذمے صرف باہر کا کام کاج' مہمانوں کی دیکھ بھال اور شیخ صاحب کی خدمت رہ گئی۔ باورچی خانے کا کام' گھر کی صفائی' چیزوں کا رکھنا اٹھانا اور بیگم شیخ کی خدمت کرنا ریشماں کے سپرد تھا۔ دوسرا گھریلو ملازم فضل حسین ڈرائیور تھا جو زیادہ تر شیخ صاحب کے ساتھ رہتا تھا دوپہر کو کار پر گھر سے کھانا لے جاتا تھا اور شام کو شیخ صاحب کو گھر چھوڑ کر چھٹی کر جاتا تھا۔ وہ مقامی آدمی تھا اور شیخ صاحب کی کوٹھی کے قریب ہی کہیں اپنے مکان میں بیوی بچوں کے ساتھ رہتا تھا۔
شیخ رفیق اور ان کی بیگم جو خود اولاد کی نعمت سے محروم تھے۔ ریشماں کے بچوں سے بہت پیار کرتے تھے۔ خاص کر فطرت سے جو عمر میں چھوٹا ہونے کی وجہ سے بہت دلارا لگتا تھ۔ اس کا رنگ گورا اور آنکھیں بھوری تھیں۔ وہ اکثر مسکراتا رہتا لیکن باتیں بہت کم کرتا تھا۔ اس میں چار پانچ سال کے بچوں کا چلبلا پن نہ تھا۔ جس کی وجہ سے گھر والے عموماً قیمتی چیزیں سنبھالنے کی فکر میں لگے رہتے تھے۔ فطرت اول تو کوٹھی کے اندر جاتا ہی نہیں تھا اور اگر جاتا بھی تو اپنی ماں کی شلوار کا پلو تھام کر کھڑا رہتا تھا۔ بیگم شیخ سے اسے اپنے پاس بلاتیں تو وہ مسکراتا ہوا چلا جاتا لیکن پوچھے بغیر کچھ نہ کہتا۔ وہ شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیر دیتیں۔ کبھی گال تھپتھپا دیتیں اور کبھی

فروٹ یا مٹھائی کا ٹکڑا تھما دیتیں۔ لیکن وہ اپنی ماں کی منظوری کے بغیر کچھ بھی قبول نہ کرتا البتہ ریشماں کا اشارہ پاتے ہی وہ بیگم شیخ کی دی ہوئی چیز لے لیتا اور واپس

URDU4U.COM

کوارٹر کی طرف چلا جاتا۔

شیخ اور بیگم شیخ کی مہربانی سے فطرت کو میونسپل کمیٹی کے سکول میں داخل کرا دیا گیا۔ ان کو یونیفارم کا رواج نہیں چلا تھا۔ فطرت جو کپڑے گھر میں پہنتا وہی پہن کر سکول چلا جاتا۔ البتہ ریشماں ہفتے میں دو دفعہ اس کے کپڑے دھو دیتی تا کہ سکول میں کوئی یہ نہ سمجھے کہ یہ ایک بیوہ ماں کا بیٹا ہے۔

ذکیہ جو اب بارہ سال کی ہو چکی تھی۔ گھر داری میں اپنی ماں کا ہاتھ بٹاتی تھی۔ ایک آدھ دفعہ بیگم شیخ نے ریشماں سے کہا کہ اسے بھی سکول میں داخل کرا دو لیکن اس نے جواب دیا ”نہیں بیگم صاحبہ! یہ پڑھ لکھ کر کیا کرے گی۔ ہمارے خاندان میں ویسے بھی لڑکیوں کی پڑھائی کا رواج نہیں۔ میرے ساتھ ہی ٹھیک ہے۔ گھر کا کام سیکھ جائے گی یہی کافی ہے“

”جیسے تمہاری مرضی“ بیگم شیخ نے لڑکی کے بارے میں زیادہ دخل دینا مناسب نہ سمجھا۔

یوں ریشماں نے اپنی نئی زندگی کا آغاز کیا جس میں اسے اور اس کے بچوں کو مفت کھانا اور رہنے کے لئے مفت کمرہ مل گیا تھا۔ رتے بستے گھر سے پہننے کو پرانے کپڑے بھی مل جاتے تھے۔ اس کے علاوہ ریشماں کی بیس روپے ماہوار تنخواہ مقرر تھی جو وقت گزرنے کے ساتھ بڑھتی گئی۔ ریشماں اس رقم سے بھی کچھ نہ کچھ بچا لیتی تھی۔

سکول میں فطرت کو بڑے شفیق استاد ملے۔ ویسے تو ان کا رویہ سب بچوں کے ساتھ اچھا تھا لیکن جب انہیں پتہ چلا کہ فطرت کے باپ نے ایک اجنبی لڑکی کی آبرو بچانے کے لئے جان دے دی تھی اور گورنمنٹ نے اسے بہادری کا تمغہ دیا تھا تو ان کا التفات اور بھی بڑھ گیا۔ وہ فطرت کو ٹاٹ پر بٹھاتے حالانکہ ٹاٹ کم ہونے کی وجہ سے کئی بچے ننگی زمین پر بیٹھتے تھے بعض بچے گیلی اور ٹھنڈی زمین سے بچنے کے لئے گھر سے

پٹ سن کی پرانی بوری' پھٹی ہوئی دری کا ٹکڑا دہرا کیا ہوا پرانا کھیس وغیرہ ساتھ لے آتے تھے۔ لیکن فطرت کی طرح بہت سے بچے ایسے تھے جو گھر سے بیٹھنے کے لئے کچھ

URDU4U.COM

ساتھ نہیں لا سکتے تھے۔

گیروی رنگ کی شلوار قمیض پہنے فطرت اکثر زمین پر بیٹھا تختی لکھتا رہتا۔ منشی دین محمد اس کے پاس پاؤں کے بل بیٹھ کر اسے سکھاتے کہ "ح" کی گولائی اس طرح ہونی چاہئے اور "ک" کی "کشش" اس طرح تھوڑی سی توجہ اور محنت سے فطرت کی لکھائی بہت بہتر ہو گئی۔

حساب کے سوال زیادہ مشکل نہ تھے۔ جمع' تفریق' ضرب اور تقسیم کے سوال جو بار بار آتے تھے مشق کرنے سے فطرت کو ازبر ہو گئے تھے۔

پرائمری سطح پر فطرت کو سب سے زیادہ دلچسپی اردو سے تھی (ان دنوں انگریزی پرائمری درجے کے بعد شروع ہوئی تھی) اسے اپنی جماعت کا اردو کا قاعدہ خاص کر اس کی نظمیں زبانی تھیں۔ وہ کسی وقت بھی استاد کے اشارے پر اٹھ کر کوئی نظم بھی زبانی سنا دیتا تھا۔ ایک دفعہ اسٹنٹ انسپکٹر آف سکولز' سکول کے معائنے پر آئے تو استاد کا اشارہ پاتے ہی فطرت نے اسماعیل میرٹھی کی یہ نظم فر فر سنا دی۔

سچ میں راحت ہے آسانی
سچ سے ہوتی نہیں پشیمانی
ہے برا جھوٹ بولنے والا
آپ کرتا ہے اپنا منہ کالا

فطرت چوتھی جماعت میں تھا کہ ایک دن پانچویں جماعت کے ساتھ بیت بازی کا مقابلہ ہو گیا۔ دونوں طرف سے تڑ تڑ شعر سنائے گئے۔ جب چوتھی جماعت "م" کے ایک شعر پر رک گئی تو فطرت نے فوراً یہ شعر پڑھ کر اپنی جماعت کو فتح سے ہمکنار کر

دیا۔

میرے اللہ! برائی سے بچانا مجھ کو
نیک جو راہ ہو اس راہ پر چلانا مجھ کو

URDU4U.COM

اس کے علاوہ فطرت کو کئی مضامین زبانی یاد تھے مثلاً "حق کی فتح" "نیکی کا بدلہ" "خدمت میں عزت" "خوشامدی کی سزا" اور "محنت کا پھل" وغیرہ۔ وہ "بزم ادب" میں ان سبقوں کے اقتباسات ہیڈ ماسٹر کو بھی سنا چکا تھا۔

موسم سرما کی ایک صبح کا ذکر ہے۔ اگرچہ سورج بادلوں کی اوٹ سے نکل آیا تھا لیکن گذشتہ رات سخت بارش کی وجہ سے ہوا میں خنکی بہت تھی۔ کچھ بچے ہوا سے بچنے کے لئے دیوار کی اوٹ میں کھڑے ہو کر سبق یاد کر رہے تھے۔ فطرت اپنی کتاب ہاتھوں میں لئے پڑھ رہا تھا:

"پاکستان قائداعظم نے بنایا۔ یہ ایک آزاد اور خود مختار ملک ہے۔ اس کا بنیادی نظریہ نظریہ اسلام ہے۔ یہ مسلمانوں کا ملک ہے جو اللہ اور اس کے رسولؐ کی پیروی کرتے ہیں۔ اسلام ہمیں عدل' انصاف اور غریبوں کی مدد کا سبق دیتا ہے"

اتنے میں ایک سرکاری اہلکار بھاگا بھاگا آیا اور اس نے ہیڈ ماسٹر صاحب کو اطلاع دی کہ وزیر اعلی تھوڑی دیر بعد ٹاؤن ہال میں ممتاز شہریوں سے ملنے کے لئے ادھر سے گزر رہے ہیں۔ راستے میں آپکا سکول پڑتا ہے۔ ممکن ہے وہ تھوڑی دیر کے لئے ادھر آ نکلیں۔ یہ ان کی پرانی عادت ہے۔

ہیڈ ماسٹر نے دوسرے استادوں سے مشورہ کیا کہ کیا کرنا چاہئے۔ کسی نے کہا ہمیں فوراً بچوں کو لگا کر سکول کی صفائی کروا دینی چاہئے۔ کسی نے کہا کہ دھوپ میں میز اور کرسی بچھا کر سٹیج بنا دیا چاہئے تاکہ اگر وہ تقریر کرنا چاہیں تو آسانی سے طلبہ اور اساتذہ کو مخاطب کر سکیں۔ کسی نے لاؤڈ سپیکر لانے کا مشورہ دیا اور کسی نے گلدان

اور دریاں اکٹھی کرنے کی طرف توجہ دلائی۔ قبل اس کے کہ یہ لوگ کسی حتمی فیصلے پر پہنچتے ایک موٹر سائیکل سوار "ہوٹر" بجاتا ہوا گزر گیا جس سے صاف پتہ چلتا تھا کہ

URDU4U.COM

وزیر اعلیٰ کی سواری زیادہ دور نہیں۔ لہٰذا سارے مشورے چھوڑ چھاڑ کر تمام استاد اپنی اپنی کلاس میں چلے گئے۔ تھوڑی دیر بعد وزیر اعلیٰ انگریزی سوٹ' ہیٹ اوور کوٹ پہنے تشریف لائے۔ ان کے ساتھ کمشنر' ڈی سی' اور دوسرے بڑے بڑے لوگ تھے۔ انہوں نے سکول پر ایک سر سری نظر ڈالی۔ ہیڈ ماسٹر سے ایک دو سوال پوچھے اور کہا۔

"ہم کوئی کلاس دیکھنا چاہتے ہیں"

"سب کلاسیں حاضر ہیں۔ جس میں چاہیں تشریف لے چلئے"

وزیر اعلیٰ بڑے بڑے افسروں کے ساتھ آٹھویں جماعت کے سیکشن اے میں گئے۔ وہاں ایک دو لڑکوں سی کچھ پوچھا۔ پھر پانچویں جماعت کی طرف مڑے' وہاں دو تین بچوں سے بات کی۔ آخر میں انہوں نے دیوار کے ساتھ کھڑے فطرت اور ساتھیوں کو دیکھا تو انکی طرف متوجہ ہوئے۔ فطرت کتاب کھولے پہلے واہا سبق ہی دہرا رہا تھا۔

"پاکستان ایک اسلامی ملک ہے۔ اسلام ہمیں عدل' انصاف اور غریبوں کی مدد کا سبق دیتا ہے"

وزیر اعلیٰ نے جو اتنے کپڑوں کے باوجود سردی سے ٹھٹھر رہے تھے کہا "ہاں بچو' ہمیں بتاؤ کہ ہمیں ہم سکول کو کیا تحفہ دیں"

سب بچے خاموش ہو گئے

وزیر اعلیٰ نے اپنی پیش کش دہرائی' کمشنر' ڈی سی اور دوسرے افسر بچوں کے جواب کا انتظار کرنے لگے۔

"بولو' بیٹا' بولو' ڈرو نہیں۔ مانگو' کیا چاہئے" وزیرا علی صاحب نے اسیک بار پھر کہا۔

وزیر اعلیٰ نے جن بچوں کی طرف منہ کر کے تیسری بار یہ پیش کش دہرائی ان میں فطرت بھی شامل تھا۔ اس نے جواب دیا

"ٹاٹ"

"ٹاٹ" وزیراعلی نے ساتھ کھڑے کمشنر سے پوچھا "وٹ ٹاٹ"(What Taat)

کمشنر خاموش رہا۔ فطرت نے جواب دیا

"ہمیں ٹاٹ لے دیں۔ نیچے سے زمین بہت ٹھنڈی لگتی ہے۔ سردیوں میں خاص کر بارشوں میں گیلی ہو جاتی ہے"

URDU4U.COM

وزیر اعلی نے از راہ عنایت ٹاٹ مہیا کرنے کا حکم دیا اور چلے گئے

ادھر ریشماں کی زندگی ایک ٹھہرے ہوئے جوہڑ کی طرح بیت رہی تھی وہاں نہ شرفو تھا نہ گاؤں کا امام مسجد' نہ پڑوسن رابعہ کے مشورے تھے نہ گاؤں والوں کے طعنے' وہ چپ چاپ شہر کے ایک گوشے میں امن و امان کی زندگی بسر کر رہی تھی اسے یہاں صرف ایک مرتبہ پریشانی کا سامنا کرنا پڑا اور وہ بھی شیخ صاحب کے ملازم بوٹا خان سے جو کہنے کو تو کنوارا تھا لیکن ادھیڑ عمر کو پہنچتے پہنچتے اتنے پاپڑ بیل چکا تھا کہ اس کے چہرے سے جوانی اور کنوارہ پن غائب ہو چکے تھے' ابوہ گندہ ادھیڑ عمر اور متروک سا شخص لگتا تھا جسے شخص صاحبنے شاید کسی کے کہنے پر ملازم رکھ چھوڑا تھا اس کی عمر چالیس سال کے لگ بھگ ہو گی' وہ ایک دن چھوڑ کر شیو بناتا تھا اور جس دن شیو کا ناغہ کرتا اس روز اس کی داڑھی کے بال ریت کے سفید ذروں کی طرح اس کے گالوں اور ٹھوڑی پر چمکتے رہتے تھے' وہ بہت کم نہاتا تھا اور دانت تو شاید ہی کبھی صاف کرتا تھا' پتہ نہیں اس میں کیا خوبی تھی کہ شیخ رفیق صاحب جیسے پارسا اور صاف ستھرے شخص نے ایسے گندے اور مشکوک شخص کو گھر میں جگہ دے رکھی تھی۔

شاید اس کا کردار اتنا مشکوک نہ ہو کیونکہ وہ اس گھر میں کئی سال سے رہ رہا تھا اور کبھی کسی نے اس کی شکایت نہیں کی تھی اسے مشکوک تو اس کی صرف ایک حرکت نے بنا دیا تھا جو اس نے ریشماں سے کی تھی۔ ہوا یوں کہ چھٹی کی دن بوٹا اپنے کوارٹر کے باہر سگریٹ پی رہا تھا ریشماں اپنی پناہ گاہ سے نکل کر کام کاج کے لئے

 © Urdu4U.com

کوٹھی کی طرف جانے لگی تو بوٹا خان نے سگریٹ کا دھواں اس کی طرف پھینک دیا۔

ریشماں نے نفرت سے اس کی طرف دیکھا تو اس نے فلمی انداز میں کہا "سنو ہنیو! اتنا غصہ' اتنا غصہ!! ہم تو پہلے ہیمر چکے ہیں" ریشماں نے اس یکطرفہ ڈائیلاگ کا کوئی جواب نہ دیا صرف یہ سوچ کر رہ گئی کہ چودھری شرف دین (عرف شرفو) اور مولوی نیک عالم گاؤں میں ہی نہیں شہروں میں بھی ہوتے ہیں۔ بعد میں ریشماں نے مناسب وقت پر اس کا ذکر بیگم صاحبہ سے کر دیا جنھوں نے بوٹا خان کی ڈانٹ ڈپٹ کر کے معاملہ رفع دفع کر دیا۔ اس کے بعد بوٹا خان نے کبھی ایسی حرکت نہ کی۔

ریشماں اپنا کام جان مار کر کرتی' صبح نماز سے ایک گھنٹہ پہلے اٹھتی' سردیوں میں سب سے پہلے باورچی خانے میں شیخ صاحب اور بیگم صاحبہ کے وضو کے لئے پانی گرم کرتی' پھر چائے بناتی' ناشتہ تیار کرتی اور جب شیخ صاحب اور بیگم صاحبہ فارغ ہو جاتے و خود ناشتہ کرتی۔ کچھ نہ کچھ ذکیہ اور فطرت کو کھلا دیتی۔ وہ ان کے لئے صبح ہی صبح انڈے اور پراٹھے تو نہ بنا سکتی اور نہ مالک اور نوکر کے درمیان فرق ہی کیا رہ جاتا لیکن کبھی خشک روٹی کا ٹکڑا' کبھی بچا ہوا توسٹ' کبھی رات والا سالن' کبھی لسی اور کبھی چائے کی پیالی ضرور مل جاتی۔ یہ ناشتہ غریبانہ سہی لیکن گاؤں والی حالت سے بہتر تھا جہاں ناشتہ تو کجا فاقوں کی نوبت آ جاتی تھی۔ ریشماں اب اپنے مقدر سے خوش اور اپنے حالات سے مطمئن تھی۔

دن بھر کام کر کے جب وہ اپنے دو بچوں کے ساتھ سرونٹ کوارٹر میں بیٹھتی تو اپنی چھوٹی سی کائنات پر بڑی خوش ہوتی۔ وہ ذکیہ اور فطرت کو آپس میں شرارتیں کرتا دیکھ کر مسکراتی رہتی۔ زیادہ تر ذکیہ ہی فطرت کو چھیڑتی۔ فطرت بال کٹوا کر آتا تو وہ تبصرہ کرتی "امی امی دیکھا آپ نے ہمارے کوارٹر میں چوہا گھس آیا ہے' چوہا" فطرت جوابی حملہ کرتا "امی سوچنے کی بات یہ ہے کہ چوہے سے زیادہ خطرہ ہوتا ہے یا چڑیل سے" یہ نوک جھونک جلد ہی ہاتھا پائی میں بدل جاتی اور ریشماں آگے بڑھ

کر بیچ بچاؤ کرا دیتی۔ اس کے بعد فطرت اپنے سکول کی کتابیں اور تختی وغیرہ نکال کر بیٹھ جاتا اور ذکیہ' بیگم شیخ کی سکھلائی کے مطابق کڑھائی کی مشق کرنے لگتی۔ جب

URDU4U.COM

وہ کڑھائی وغیرہ سے فارغ ہو جاتی تو چارپائی پر اپنی ماں کے پاس جا بیٹھتی' اس کے پاؤں دباتی' تھکی ہوئی ٹانگیں سہلاتی اور اگر اس کا سر دکھتا تو سر دبا دیتی۔ سردیوں میں ماں بیٹی باتیں کرتی کرتی ایک ہی چار پائی پر سو جاتیں۔ دونوں کے وزن سے دھنتی ہوئی چارپائی اور دھنس جاتی اور ذکیہ دوسرے چوتھے روز اس کی ادوین کس دیتی۔

بیگم صاحبہ کو ریشماں پر پورا اعتماد تھا' وہ گھر کے معاملات میں اس پر پورا انحصار کرتی تھیں گیارہویں شریف کا ختم ہو یا میلاد کی محفل یا شب برات کی شیرینی بیگم صاحبہ بوٹا خان سے چیزیں منگوانے کی بجائے پیسے ریشماں کے حوالے کر دیتیں کہ جاؤ خود دیکھ کر بازار سے ضرورت کی چیزیں لے آؤ۔ بوٹا خان کو کیا پتہ کہ شیرینی میں کون سی چیزیں کتنی مقدار میں ڈالنی ہے' ریشماں خود بازار سے چیزیں تو خرید لاتی اور بقیہ پیسے بیگم صاحبہ کے حوالے کر دیتی' بیگم صاحبہ نے کبھی اس سے حساب نہ پوچھا کون سی چیز کتنی لائی ہو یا کتنے کی لائی ہو' ریشماں بھی اس اعتماد کو کبھی ٹھیس نہ پہنچاتی۔

ماہ و سال اسی سکون اور اعتماد کی فضا میں گزرتے گئے اور فطرت پرائمری پاس کر کے مڈل درجے میں پہنچ گیا۔

فطرت مڈل درجے میں پہنچ کر پڑھائی میں اور چمک اٹھا جس کی وجہ سے استاد اور بھی خیال رکھنے لگے لیکن اساتذہ میں اس کی یہ مقبولیت طالب علموں کے لئے وجہ حسد بن گئی' وہ جلدی جلدی آتے اچھے اچھے ڈسک خود سنبھال لیتے اور فطرت کے لئے ہلتا ہوا ڈسک اور ٹوٹی ہوئی کرسی چھوڑ دیتے۔ کلاس روم سے باہر بھی ان کا یہ رویہ ایسا ہی تھا۔ ہاف ٹائم میں ایک ہی فٹ بال سے ساری کلاس کھیلنے کی کوشش کرتی تو کمزور لڑکے عموماً پیچھے رہ جاتے' اگرچہ فطرت جسمانی لحاظ سے اتنا کمزور بھی نہیں تھا لیکن دوسرے مشٹنڈوں کی طرح منہ زور بھی نہیں تھا' ایک دو مرتبہ اس نے زور لگا کر گیند چھینا

چاہی تو جمشید نے جان بوجھ کر اس کی ٹانگ میں ایسا اڑنگا مارا کہ وہ منہ کے بل گر گیا' اس نے اٹھ کر بدلہ لینے کی کوشش کی تو جمشید کے دوست جاوید' کریم اور صابر آ گئے۔ انہوں نے مل کر فطرت کی پٹائی کر دی۔ فطرت نے ماسٹر سے شکایت کی تو انہوں نے لڑکوں کو صرف تنبیہہ کر کے چھوڑ دیا۔ تنبیہہ کے الفاظ سے فطرت کے زخم مندمل نہ ہو سکے اور وہ دل میں ایک اور داغ سجا کر خاموش رہ گیا۔

ایک دفعہ "ہاف ٹائم" کے دوران فطرت اور اس کے ساتھ درخت کے نیچے زمین پر خانے بنا کر "پانسہ" کھیل رہے تھے کہ مجید عبدالرحمن گیند کے تعاقب میں ادھر آ نکلے اور جاتے جاتے بھاری بوٹوں سے سارا پانسہ اور اس کی گوٹیں بکھیر گئے۔ فطرت اور اس کے ساتھی بدلہ لینے لڑکوں کے پیچھے بھاگے تو وہ ہوہا' ہوہا" کرتے سکول سے باہر بھاگ گئے۔ وقفے کے بعد سکول دوبارہ لگا تو یہ کھلنڈرے لڑکے کلاس میں واپس ہی نہ آئے۔

سکول میں فطرت کے دوست صرف چار پانچ تھے۔ یعقوب' صادق' بشیر' شاہد (عرف کٹا' ان میں سے فطرت کی زیادہ تر دوستی شاہد کے ساتھ تھی جو کبھی کبھی اس کے گھر بھی آ جاتا تھا لیکن فطرت اور اس کی ٹولی کبھی بھی جمشید اور اس کی پارٹی کا غلبہ نہ توڑ سکی۔

دوسروں کی زیادتیاں سہنا فطرت کی عادت بن گئی تھی۔ اب وہ ماسٹر جی سے شکایت کرنے یا زبردستی کرنے والے لڑکوں سے بدلہ لینے کی بجائے ہر بات برداشت کرنے کی کوشش کرتا۔ فطرت کی عمر کے لڑکے کے لئے یہ رویہ اختیار کرنا بہت مشکل تھا۔ لیکن فطرت کی خوبی یہ تھی کہ وہ جذبات کی رو میں بھی برے بھلے کی تمیز ملحوظ رکھتا تھا۔ اسے اکثر اپنی ماں کی نصیحت یاد آتی تھی کہ "بیٹا! کسی سے لڑائی جھگڑا نہ کرنا ہر چیز برداشت کرنا۔ جی لگا کر پڑھنا" ماں کی نصیحت نے فطرت کو پڑھائی میں تیز اور لڑائی میں کمزور بنا دیا تھا اور کوئی ایسی حرکت نہیں کرنا چاہتا تھا جس سے اس کی شکایت اس کی ماں تک پہنچے اور اس کی دل آزاری ہو۔ یہ سوچ اگرچہ روایتی لحاظ سے آٹھویں جماعت کے

طالب علم کی سوچ سے مطابقت نہیں رکھتی تھی لیکن شاید زمانے کے تھپیڑوں نے فطرت کو وقت سے پہلے ہی سمجھ دار بنا دیا تھا۔

URDU4U.COM

فطرت کی ماں کی خواہش تھی کہ وہ پڑھ لکھ کر اوور سنیئر بنے کا خیال بہت پرانا تھا' ریشماں دو تین مرتبہ فطرت کے باپ کرم دین کے پاس اوکاڑہ' دیپالپور اور سرگودھا جا چکی تھی اس نے کرم دین کی زبانی کئی بار اس قسم کے جملے سنے تھے کہ اوور سنیئر صاحب کا حکم یہ ہے کہ فلاں کام فوراً کیا جائے۔ اوور سنیئر صاحب نے بلایا ہے۔ اوور سنیئر کا پیغام آیا ہے۔ تب سے ریشماں کے دل میں یہ خواہش پرورش پا رہی تھی کہ وہ اپنے بیٹے کو اوور سنیئر بنائے۔ ایک دو مرتبہ اس نے کرم دین مرحوم کی زبانی ایس ڈی او صاحب کا ذکر سنا تھا لیکن صرف ایک دو مرتبہ' ریشماں کا خیال تھا کہ جس افسر کا ذکر کم ہو وہ چھوٹا افسر ہوتا ہے اور جس افسر کا ذکر زیادہ ہو وہ بڑا ہوتا ہے۔ وہ اپنے فطرت کو بڑا افسر دیکھنا چاہتی تھی یعنی اوور سینئر!

یہی وجہ تھی کہ وہ جب نویں جماعت میں پہنچا تو اس نے ماسٹر جی کے مشورے سے سائنس اور ڈرائنگ کے مضامین اختیار کئے حالانکہ دو اردو اور فارسی نسبتاً آسان سمجھے جاتے تھے اور ان میں نمبر بھی اچھے خاصے آ جاتے تھے۔ خوش قسمتی سے فطرت کو بہت اچھے ڈرائنگ ٹیچر مل گئے (فطرت اور حقیقت استادوں کے معاملے میں ہمیشہ خوش قسمت رہا)' انھوں نے اس کا اردو خط دیکھا تو بہت خوش ہوئے' فطرت نے بتایا کہ یہ پرائمری سیکشن کے منشی دین محمد کی دین ہے جنھوں نے مجھے تختی لکھنا سکھایا۔ ڈرائنگ ماسٹر ذوالفقار نے کہا "اس سے پتہ چلتا ہے کہ تمھارے ہاتھ میں صفائی ہے۔ تم اچھی ڈرائنگ کر سکو گے"

ہائی کلاسز میں اگرچہ انگلش ٹیچر وقار صاحب' ریاضی کے استاد بدر صاحب اور دوسرے سارے اساتذہ فطرت کو اس کی ذہانت اور شرافت کی وجہ سے بہت پسند کرتے تھے لیکن اس پر سب سے زیادہ محنت ڈرائنگ ماسٹر ذوالفقار نے کی' جس نے اسے پنسل تراشنے

اور اس کی صحیح نوک بنانے سے لے کر لکیریں کھینچے اور دائرے بنائے تک ہر کام سکھایا' یہ ماسٹر ذوالفقار کی تربیت کا ہی اثر تھا کہ تھوڑے عرصے میں فطرت صاف ستھری لکیریں کھینچنے گا۔ ماسٹر ذوالفقار اس ہونہار طالب علم اور زیادہ توجہ دینے لگے اور ان کی نگرانی میں فطرت کی صلاحیتیں اور زیادہ چمکنے لگیں' وہ فالتو وقت میں اپنی پسند کی چیزوں کی ٹیڑھی میڑھی تصویریں بناتا رہتا۔ کبھی سکول کے صحن میں کھڑے درخت کی اور کبھی انگلش ٹیچر کی۔ ساتھی لڑکے کئی دفعہ متعلقہ استاد کے پاس شکایت بھی جا کرتے کہ "ماسٹر جی! فطرت نے آپ کا کارٹون بنایا ہے" وہ فطرت کو فوراً طلب کرتی اس کی سرزنش کرتے اور فطرت سزا سے چنے کے لئے کبھی کاغذ پھینک دیتا اور کبھی نگل جاتا کیونکہ اس سکول میں ڈنڈے برسانے کابہت فیشن تھا۔ شفیق استاد شفقت پر تے تو اپنی جیب سے نکال کر یا اپنے کام سے اتار کر قلم یا پنسل بھی شاگرد کو دے دیتے اور جلا میں آتے تو دونوں ہاتھ باہر نکلکر خوب ڈنڈے برساتے۔ فطرت اپنے استادوں کا ادب بھی بہت کرتا تھا اور ان سے ڈرتا بھی بہت تھا۔

فطرت دسویں جماعت میں تھا کہ پہلی بار اس کی زندگی میں رومانس کی ہلکی سی آنچ پیدا ہوئی۔ یہ کوئی روایتی قسم کا عشق نہیں تھا جو رومانی ناولوں یا سستی فلموں میں نظر آتا ہے بلکہ ایک دھیمی سی آنچ تھی جو پندرہ سولہ سال کی عمر میں صرف یہ احساس دلانے کے لئے پیدا ہوتی کہ جوانی دہلیز پر کھڑی ہے۔
زندگی میں پہلی مرتبہ جس لڑکی نے دلچپی لینا شروع کی وہ نسرین تھی جسے وہ پچھلے نو سال سے جانتا تھا۔ ان نو دس سالوں میں اگرچہ وہ ایک ہی گھر میں رہے۔ ساتھ ساتھ پلے بڑھے اور عمر کے ایک ہی جتنے سال اکٹھے گزارے لیکن ان کی پرورش کے خطوط بالکل متوازی رہے۔ نسرین صبح کے وقت اپنی پسند کا ناشتہ کرتی' اپنے پسند کے کپڑے پہنتی' کار میں سکول جاتی اور ہر قسم کے نازو نعمس ے فیض یاب ہوتی' اس کے

برعکس فطرت بچی کچی روٹی (باسی یا تازہ) کھا کر پیدل سکول جاتا' میلے گیروی رنگ کے کپڑے پہنتا' سکول میں کبھی ٹاٹ اور کبھی مٹیالی زمین پر بیٹھتا۔ دن بھر امیر اور طاقتور لڑکوں کی جھڑکیں کھاتا اور سہ پہر کو گندے چہرے اور گندے کپڑوں سمیت واپس سرونٹ کوارٹر میں آ جاتا۔

URDU4U.COM

فطرت نے جب سے ڈرائنگ سیکھی تھی' اس کو انسانی چہرے بنانے کا بہت شوق ہو گیا تھا' کبھی وہ بوٹا خان کا مونچھوں والا چہرہ بناتا اور کبھی شیخ صاحب کا ڈاڑھی والا نورانی چہرہ۔ اکثر ان چہروں اور اصلی چہروں میں بہت کم مماثلت ہوتی لیکن فطرت کو یہ اطمینان تھا کہ چہرے کی ہر چیز اپنی جگہ پر ہے' کان کی جگہ کان' آنکھ کی جگہ آنکھ اور ہونٹ کی جگہ ہونٹ۔ اگر آنکھ ذرا بڑی چھوٹی ہو جاتی' ہونٹ ذرا سا لٹک جاتا یا مونچھ ضرورت سے زیادہ اکڑ جاتی تو وہ اس سے دل برداشتہ نہیں ہوتا بلکہ ایک کے بعد دوسرا اور دوسرے کے بعد تیسرا چہرہ بناتا رہتا۔ متواتر مشق اور ماسٹر ذوالفقار کی راہنمائی میں چند مہینوں کے اندر اندر فطرت نے اس کام میں اچھی خاصی مہارت حاصل کر لی۔

فطرت نے زندگی میں پہلی مرتبہ دل لگا کر جو پنسل اسکیچ بنایا وہ نسرین کا تھا۔ موٹی موٹی آنکھیں' بھرے بھرے گال' گالوں میں مسکراہٹ کا ہلکا سا گڑھا' بالوں کی لٹ ماتھے پر لٹکتی ہوئی۔ چہرہ ہشاش بشاش! فطرت کا خیال تھا کہ وہ ایک تحفے کے طور پر یہ تصویر نسرین کو پیش کرے گا۔ وہ اس کی داد دے گی' شکریہ ادا کرے گی اور طبقاتی فرق کو بھول کر اس کی محبت کا جواب محبت سے دے گی لیکن ساتھ ہی ساتھ اسے ڈر بھی لگتا تھا کہ اگر نسرین نے بیگم صاحبہ سے شکایت کر دی تو انہوں نے گھر سے نکال دیا جائے گا۔ اس کی پڑھائی کھٹائی میں پڑ جائے گی اس کی ماں کون یا ٹھکانہ ڈھونڈنا پڑے گا۔

سوچ سوچ کر اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنی محبت کی ترجمان یہ تصویر ضرور علیحدگی میں نسرین کو پیش کر دے گا' چنانچہ وہ موقع کی تلاش کرنے لگا' ایک شام نسرین کی بہت

ساری سہیلیاں آئی ہوئی تھیں‘ گھنٹے دو گھنٹے تک پوری گھر میں ہل چل مچی رہی‘ چائے بسکٹ اور کیک استعمال ہوتے رہے اور فطرت تاک لگائے اپنے کوارٹر میں بیٹھا رہا کہ یہ محفل ختم ہو اور وہ اپنے ارمانوں کا اظہار کرے۔ آخر خدا خدا کر کے پارٹی ختم ہوئی‘ نسرین اپنی سہیلیوں کو الوداع کرنے گیٹ تک گئی جب اندر آنے لگی تو فطرت نے برآمدے کی اوٹ میں فوراً اسے تصویر پیش کر دی اس کے ساتھ ہی اس کا دل دھک دھک کرنے لگا‘ نسرین نے تصویر کو ایک نظر دیکھا اور پوچھا‘ یہ کس کی تصویر ہے اور مجھے کیوں دکھا رہے ہو؟"

"نسرین! بھولی نہ بنو۔ میں نے بڑے ارمانوں کے ساتھ یہ تصویر بنائی ہے"

"مگر کیوں"

"کیونکہ تم مجھے بہت اچھی لگتی ہو۔ بہت پیاری!"

لمحے بھر کو فطرت سکتے کے عالم میں رہا کہ وہ اس کی محبت کا جواب محبت میں دیتی ہے یا سیدھی جا کر بیگم صاحبہ سے شکایت کر دیتی ہے لیکن نسرین کا رد عمل کچھ اور ہی تھا اس نے جھڑک کے انداز میں کہا۔

"ہمارے ٹکڑوں پر پلنے والے۔ ہماری نوکرانی کے پتر! تمہاری یہ مجال آئندہ ایسی حرکت کی تو کوارٹر سے نکالوا دوں گی"

یہ جواب سن کر نہ صرف فطرت کے ارمانوں پر پانی پھر گیا بلکہ اسے اپنا مستقبل خطرے میں نظر آنے لگا۔ وہ چپکے سے اپنے کوارٹر میں آ گیا اور نسرین پہلے کی طرح مٹکتی مٹکتی کوٹھی کے اندر چلی گئی۔ دو تین دن فطرت ڈرا ڈرا سا رہا۔ کوٹھی کی طرف بھی نہ گیا کہ کہیں بیگم صاحبہ کا سامنا نہ ہو جائے‘ لیکن جب ادھر سے کوئی جھاڑ جھڑک یا سرزنش موصول نہ ہوئی تو وہ سمجھ گیا کہ نسرین نے یا تو اپنی خالہ سے اس کا ذکر نہیں کیا‘ یا پھر خالہ نے اسے کوئی اہمیت نہیں دی۔ بہرحال بات آئی گئی ہو گئی اور فطرت کے اولین رومان کی کلی کھلنے سے پہلے ہی مرجھا گئی‘ البتہ اس واقعے نے حساس

فطرت کی طبیعت پر گہرا اثر چھوڑا۔

اس واقعہ کے چند روز بعد فطرت اپنے کمرے میں بیٹھا کتاب پڑھ رہا تھا دراصل وہ کتاب پڑھ نہیں رہا تھا' کتاب اس کے سامنے کھلی ہوئی تھی اس کی نظریں صفحے پر جمی ہوئی تھیں لیکن اس کے خیالات نسرین والے واقعہ کے بارے میں گردش کر رہے تھے' ذکیہ جو حسب عادت ماں کی چارپائی پر بیٹھی اس کے پاؤں اور پٹھے داب رہی تھی فطرت کو یوں سنجیدہ بیٹھے دیکھتی رہی۔ اتنے میں اسے شرارت سوجھی' اس نے ماں سے کہا'

"امی امی آپ کو ایک تازہ خبر سناؤں"

فطرت سمجھا کہ وہ واقعہ جسے وہ ہر کسی سے چھپائے ہوئے تھا شائد ذکیہ کو معلوم ہو گیا ہے۔ کیونکہ ذکیہ کئی دفعہ نسرین کے ساتھ باتیں کرتی دیکھی گئی تھی' فطرت نے اس کا منہ بند کرنے کے لئے پہلے ہی کہہ دیا:

"نہیں امی' یہ یونہی بکواس کرتی رہتی ہے"

"کیا ہوا بیٹا!" ذکیہ بولی! "امی میں نے ابھی واقعہ تو بتایا ہی نہیں' فطری کو کیسے معلوم ہو گیا کہ یہ بکواس ہے یا نہیں"

فطرت نے لقمہ دیا اس لئے کہ تم رات کو جب بھی کوئی ایسی بات کرتی ہو تو بکواس ہی کرتی ہو"

کل رات تو میں نے تمہاری ڈرائنگ کی تعریف کی تھی۔ کیا وہ بھی بکواس تھی؟"

"بس بند کرو بک بک' مجھے پڑھنے دو"

"میں تم سے کب بول رہی ہوں' میں تو اپنی امی' پیاری امی سے بات کر رہی تھی"

فطرت خاموش ہو گیا اس نے نظریں دوبارہ کتاب پر جما دیں لیکن اس کے کان ذکیہ کی طرف تھے۔ ذکیہ اونچی اونچی سرگوشی میں جو فطرت بھی سن سکتا تھا کہا:

"امی وہ جمعدارنی ہے نا جمعدارنی"

"ہاں' بیٹی!"

اس کے ساتھ کبھی کبھی ایک بیٹی بھی ماں کا ہاتھ بٹانے آ جاتی ہے نا"

"ہاں! آج بھی آئی ہوئی تھی۔ پھر کیا ہوا' وہ اکثر آتی رہتی ہے"

URDU4U.COM

"ہوا یہ کہ آج وہ فطری کی طرف بڑے غور سے دیکھ رہی تھی۔ للچائی ہوئی نظروں سے۔ وہ اس سے شادی"

فطرت جھلا کر بولا' امی منع کرو اپنی لاڈلی کو۔ یہ مجھے بھگنوں کے ساتھ نتھی کر رہی ہے۔ کمینی کہیں کی!"

"بہنوں کو یوں نہیں کہا کرتے بیٹا۔ تم بھی ایسی باتیں مت کیا کرو ذکیہ!"

انہیں تنبیہہ کرنے کے بعد ریشماں نے اپنے خوابوں کو الفاظ پہناتے ہوئے کہا!

"میں تو بہو بیاہ کر لاؤں گی اپنی مرضی سے۔ خوبصورت' پیاری سی' تابعدار سی۔ جو میری خدمت کرے اور میرے فطرت کے ساتھ سجے بھی"

ستمبر کا مہینہ تھا' قوم ابھی ابھی قائداعظم کا "یوم وفات" پر انہیں خراج ادا کرنے اور ان کے سنہری اصولوں پر کار بند رہنے کا عہد کر کے فارغ ہوئی تھی کہ ریشماں کے چھوٹے سے خاندان پر ایک ایسی آفت آن پڑی جس نے فطرت کے کچے اور حساس ذہن پر دائمی نقوش ثبت کر دیئے۔

ہوا یوں کہ ۱۱ ستمبر کو ۱۲ بجے کے قریب ذکیہ کوارٹر سے نکل کر کوٹھی کے باورچی خانہ میں گئی جہاں اس کی ماں دوپہر کا کھانا پکانے میں مصروف تھی' ذکیہ کے ہاتھ میں سوئی اور چھوٹا سا دھاگہ جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ سلائی کڑھائی کا کام کر کے آئی ہے' اس نے ماں سے کہا:

"امی! میز پوش کا درمیانی پھول بناتے بناتے گلابی دھاگہ اچانک ختم ہو گیا ہے' میں جا کر بازار سے لے آوں"

"اس میں جلدی کیا ہے آرام سے کوارٹر میں بیٹھ' فطری آنے ہی والا ہو گا' تجھے دھاگہ لا دے گا۔"

"امی اسے دو بجے چھٹی ہوتی ہے' گھر آتے ہی کوئی کام بتائیں تو منہ بسورنے لگتا ہے' میرے گلاب کے پھول کی صرف دو پتیاں رہ گئی ہیں۔ بازار کونسا دور ہے' پانچ منٹ کی بات ہے۔ میں فٹا فٹ بابا نور دین کی دوکان سے دھاگہ لے کر آئی"

URDU4U.COM

"کھوتے جتنا تمہارا قد ہو گیا ہے' تم سمجھتی کیوں نہیں' دوپہر کے وقت یوں جوان لڑکیوں کا اکیلے بازار جانا اچھا نہیں لگتا"

"واہ امی آپ بھی کمال کرتی ہیں' آج کل جوان لڑکیاں بازار میں کاریں چلاتی پھرتی ہیں اور آپ اپنی ذکو کو دھاگہ لینے بازار نہیں جانے دیتیں' میں کوئی ٹماٹر ہوں کہ کوئی ٹوکری سے اٹھا کر ہڑپ کر جائے گا۔ میں ذکیہ ہوں۔ ریشماں کی بیٹی جسے لوگ شیرنی سمجھتے ہیں شیرنی"

"چل چل باتیں نہ بنا' جلدی سے دھاگہ لے کر واپس آ اور دوپہر کے کھانے کے لئے برتن لگا"

"ابھی آئی امی" کہہ کر ذکیہ باہر نکل گئی۔

امین پور بازار اپنی پوری آب و تاب پر تھا۔ بازار کے دونوں طرف دکانیں کھلی تھیں گاہکوں کی بھیڑ تھی' بازار سے سائیکل' تانگے اور رکشے گزر رہے تھے' ایک آدھ کار بھی نظر آ رہی تھی۔ ایک سکوٹر والا ایک پاؤں زمین پر اٹکائے ریڑھ ہٹانے کے لئے بار بار ہارن بجاتا رہا لیکن اس کے پتلے ہارن کا کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا بالا آخر ریڑھے والا اپنی مرضی سے وہاں سے ہٹا اور ٹریفک بحال ہو گئی۔

بابا نور دین کی چھوٹی سی دکان تھی جس میں کڑھائی بنائی کی تقریباً چیز مل جاتی تھی' دو تین برقعہ پوش عورتیں پہلے ہی لیس' ربن اور گوٹہ کناری خرید رہی تھیں۔ ذکیہ بھی گندی نالی پر بنی ہوئی سیڑھی کو پھلانگ کر دکان پر جا کھڑی ہوئی' بابا نور دین نے کہا "بیٹی ایک منٹ۔ ابھی دیتا ہوں' ان بیبیوں کو فارغ کر لوں"

ذکیہ انتظار کرنے لگی۔

تین چار منٹ کے بعد ذکیہ چھوٹے سے خاکی لفافے میں گلابی دھاگہ سنبھالے دکان سے

اتری اور تیز تیز قدموں سے گھر کی طرف روانہ ہو گئی' ابھی وہ بازار کی نکڑ مڑ کر گلی میں داخل ہونے والی تھی کہ دو غنڈوں نے اسے اچک کر کار میں ڈال لیا اور عیدہ گاہ کی طرف بھاگ گئے۔ ذکیہ شور مچاتی رہی' زور زور سے چیخیں مارتی رہی لیکن غنڈوں نے اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا تھا اور فوری اثر کرنے والی کوئی دوا سونگھا کر اسے بے ہوش کر دیا تھا چند لمحوں میں ساری کاروائی مکمل ہو گئی اور کار والے غنڈے نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

گاہکوں اور دکانداروں سے بھرے بازار میں کسی نے غنڈوں پر ہاتھ نہ ڈالا' کسی نے ان کا تعاقب نہ کیا' ابتدائی لمحوں میں چند لوگ صرف یہ دیکھنے کے شوق میں کہ کیا ہو رہا ہے آگے بڑھے پستول دیکھ کر پیچھے ہٹ گئے' یوں لوگوں کے دیکھتے دیکھتے چند غنڈے جوان ذکیہ کو بھرے بازار سے اٹھا کر لے گئے۔

ادھر ذکیہ کی ماں کو تشویش ہوئی کہ وہ ابھی تک واپس کیوں نہیں آئی' اس نے کھانا پکا کر باورچی خانے میں ہی رکھا کہ آ کر بیگم صاحبہ کو پیش کرتی ہوئی پہلے ذکیہ کا پتہ کر لوں وہ بازار میں آئی تو دکاندار اور گاہک سہمے ہوئے تھے' عجیب دہشت کا سماں تھا اسے ذکیہ کہیں نظر نہ آئی' ریشماں سیدھی بابا نور دین کی دکان پر گئی' دکاندار نے اسے بتایا کہ ذکیہ ابھی ابھی گلاب کا پھول مکمل کرنے کے لئے دو تولی دھاگے لے گئی ہے۔

''کب؟''

''بس یہی پندرہ بیس منٹ پہلے۔ کیا وہ گھر نہیں پہنچی؟''

''نہیں''

''اوہ اوہ ظلم ہو گیا''

''کیوں بابا کیا ہوا۔ کیا ہوا؟''

''ہونا کیا تھا ذکیہ بیٹی کے جانے کے چار پانچ منٹ بعد بازار کے اس طرف شور ہوا'

دو فائر بھی سننے میں آئے' دکان سے نکل کر پوچھا کہ بھئی کیا ہوا' یہ شور۔ یہ فائر کیسا تو لوگوں نے بتایا کہ غنڈے کسی جوان لڑکی کو زبردستی اٹھا کر لے گئے۔ خدا نہ کرے' خدا نہ کرے یہ ذکیہ بٹی ہو"

URDU4U.COM

یہ سنتے ہی ریشماں نے کہرام مچا دیا۔ وہ "ذکیہ۔ میری ذکیہ" پکارتی چیختی چلاتی دکان سے نکلی اور بھرے بازار میں اپنا سر اور سینہ پیٹنے لگی' وہ زور زور سے بین کرتی جاتی اور ہائے ذکیہ' ہائے ذکیہ پکارتی جاتی۔ کسی نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ نہ تھاما کسی نے اسے تسلی نہ دی۔ بلکہ ہر کوئی اپنی جگہ' چپ' مبہوت اس کا واویلا سنتا رہا۔

وہ اسی طرح بازو سر پر لہراتی' روتی' بین کرتی شیخ صاحب کی دکان پر جا پہنچی جو دوسری طرف کچہری بازار میں تھی' اسے اس حال میں دیکھتے ہی شیخ صاحب اپنے گدے سے اٹھے اور پوچھنے لگے:

"کیوں بہن' تم کدھر! کیا ہوا؟"

"او بھائی میرے' میں لٹ گئی' میں تباہ ہو گئی' میری ساری عمر کی کمائی چھن گئی۔"

"کیا ہوا' بہن! کیا ہوا' کچھ بتاؤ بھی"

"کیا بتاؤں شیخ صاحب' میں کیا بتاؤں بھرے بازار میں غنڈے ذکیہ کو اٹھا کر لے گئے میری ذکیہ کو جس کو میں نے بیٹوں کی طرح پالا تھا' لٹ گئی' میں تباہ ہو گئی۔"

شیخ صاحب نے یہ واردات سنتے ہی دکان چھوڑ دی اور ریشماں کو تسلی دیتے ہوئے سیدھے تھانے چلے گئے' چھوٹا تھانیدار انہیں دیکھ کر احتراماً کھڑا ہو گیا' دونوں کو کرسی پیش کی' ریشماں کی زبانی سارا واقعہ سنا' ایف آئی آر لکھی اور غنڈوں کے خلاف سخت کاروائی کا یقین دلایا۔

ریشماں نے بے تابی سے پوچھا:

"کب مل جائے گی میری ذکیہ۔ تھانے دار صاحب"

"بہت جلد ماں جی' بہت جلد' تم فکر نہ کرو' شیخ صاحب تمہارے ساتھ آئے ہیں ہم مغویہ

کی بازیابی میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھیں گے' میں ابھی تھانہ صدر کو اطلاع کرتا ہوں اور ایس پی صاحب آتے ہیں تو وائرلس پر تمام سڑکوں کی ناکہ بندی کرواتے ہیں' کہاں جائیں گے یہ بدمعاش ہم فیصل آباد کا چپہ چپہ چھان ماریں گے"

URDU4U.COM

"میری ذکیہ کب ملے گی مجھے۔ تھانیدار صاحب" ریشماں نے روتے ہوئے فریاد کی "بہت جلد' ماں جی' بہت جلد' ہم پوری کوشش کریں گے"

تھانے میں رپورٹ لکھوانے کے بعد شیخ صاحب واپس دکان پر جانے کی بجائے ریشماں کے ساتھ گھر آ گئے۔ اپنی بیوی کو سارا واقعہ سنایا' اس نے بھی ریشماں کو گلے لگا کر اس کے ساتھ افسوس کیا اور ذکیہ کی بازیابی کے لئے پوری پوری کوشش کا یقین دلایا۔ لیکن ریشماں اس واقعہ سے ایسی ہل گئی تھی کہ اس کے آنسو تھمنے میں نہیں آتے تھے' اس نے اس دوپہر کو کھانا کھایا نہ شام کو۔ وہ اس سے اگلے روز بھی ذکیہ کے سوگ میں بھوکی رہی' کہیں تیسرے دن بیگم شیخ کے اصرار پر ریشماں نے رزق کا پہلا نوالہ حلق سے نیچے پھینکا۔

فطرت پر اس سانحہ کا اثر کچھ کم نہ تھا' وہ بھی رویا اس نے بھی فریاد کی۔ لیکن اپنی ماں کی طرح سر بازار نہیں۔ بین کر کے نہیں۔ سر پر بازو لہرا کر نہیں بلکہ چپکے چپکے آنسو بہا کر' اپنے کوارٹر کی تاریک کونے میں چھپ کر' اندر سے دروازے کی کنڈی چڑھا کر' فطرت جواب شعوری عمر میں داخل ہو چکا تھا اور چند ماہ بعد دسویں جماعت کا امتحان دینے والا تھا اس واقعہ کو سمجھنے سے قاصر تھا اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ غنڈوں نے بھرے بازار میں اتنی عورتوں اور لڑکیوں کو چھوڑ کر صرف ذکیہ پر ہاتھ کیوں ڈالا' کیا وہ اس کی تاک میں تھے؟ کیا وہ کسی بھی جوان لڑکی کی تلاش میں تھے اور ذکیہ ہی انہیں ہاتھ آئی تھی؟ پھر اس کو دس سال پہلے کا واقعہ یاد آ گیا جب اس کے مرحوم باپ نے ایک اجنبی لڑکی کی عزت بچانے کے لئے اپنی جان کی بازی لگا دی تھی۔ آج' دس بعد' اس کی جوان بیٹی کو سر بازار اٹھا لیا گیا اور کسی شخص

نے اسے بچانے کی کوشش نہ کی' کیا دس سالوں میں انسانی قدریں بدل گئی ہیں؟ کیا اب اس دنیا میں اجنبی لڑکیوں کی عزت بچانے والے کرموں ختم ہو گئے ہیں۔ اسے ان

URDU4U .COM

سوالوں کا کوئی تسلی بخش جواب نہیں سوجھ رہا تھا۔

پھر اسے اچانک خیال آیا کہ دس سال پہلے جن غنڈوں سے اس کے باپ کی جھڑپ ہوئی تھی' ان میں سے ایک پکڑا گیا تھا' اس پر مقدمہ چلا اور دس سال کی قید با مشقت کی سزا سنائی گئی تھی۔ کیا وہی ڈاکو آج بدلہ لینے آیا تھا۔ کیا وہ جیل سے چھوٹ کر اسی تاک میں رہا کہ وہ کرموں کی بیٹی کو اغوا کرے اور رہائی کے بعد اس نے پہلا کام یہی کیا۔ انتقام! انتقام!

شاید ہمارے معاشرے کی بنیادی قدر معافی اور در گزر نہیں' انتقام ہے۔ نہ معاشرہ چوروں اور ڈاکوؤں کو معاف کرتا ہے اور نہ چور اور ڈاکو معاشرے کو معاف کرتے ہیں۔

اس کے بعد ریشماں اور فطرت نے تھانے کی کئی چکر لگائے۔ کبھی شیخ صاحب کے ساتھ اور کبھی ان کے بغیر لیکن پولیس نے کچھ نہ کیا۔ ہر دفعہ طفل تسلیاں دے کر اور مغویہ کی جلدبازیابی کا وعدہ کر کے ٹال دیا۔

ایک دن ریشماں کو پتہ چلا کہ پولیس کا کوئی بڑا افسر لاہور سے دورے پر آیا ہوا ہے۔ اس نے موقع غنیمت جانا' پرانے بکس سے تمغہ نکالا اور سیدھی تھانے پہنچ گئی' باہر گیٹ پر ایک کانسٹیبل نے اسے روک لیا' ریشماں نے چمکتا ہوا تمغہ اسے دکھایا اور کہا کہ صاحب نے مجھے خود بلوایا ہے۔

وہاں اور بھی بہت سے لوگ تھے۔ پولیس کے چھوٹے بڑے افسر' مقامی انتظامیہ کے لوگ' معززین شہر اور کچھ تماشائی۔ ریشماں نے پنجابی زبان میں اپنی داستان غم سنائی اور رو رو کر انصاف کی اپیل کی' آئی جی صاحب نے ایس پی سے کیس کے بارے میں پوچھا تو اس نے بڑی تفصیل سے پولیس کی کارگردگی بیان کر دی' ساری تفصیل کا خلاصہ یہ تھا کہ تین ہفتے کی کوشش کے باوجود غنڈوں کا کوئی پتہ نہیں چل سکا۔

ریشماں مایوس ہو کر تھانہ سے باہر نکلی تو اس نے تمغہ ڈبیہ سمیت گندی نالی میں پھینک

 © Urdu4U.com

دیا۔

صبح چند چھینٹے پڑنے سے موسم بہت خوشگوار ہو گیا تھا' بادل اب تک آسمان پر چھائے ہوئے تھے اور لڑکوں نے "فائن ڈے" کا شور مچا کر کالج بند کروا لیا تھا۔ مزے کی بات یہ تھی کہ فیصل آباد میں کوئی ایسا مقام نہ تھا جہاں ایسے سہانے موسم میں جایا جاتا' لہٰذا "فائن ڈے" کے بہانے کالج بند کروانے کا مطلب "فائن ڈے" منانا نہیں تھا بلکہ محض چھٹی کرنا تھا۔ اکثر لڑکے پہلے پیریڈ کے بعد ہوسٹل چلے گئے یا اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہو گئے۔ فطرت کا واپس سرونٹ کوارٹر میں جانے کو جی نہ چاہا لہٰذا وہ کالج کے پیچھے فٹ بال گراؤنڈ میں بیٹھ کر چارلس ڈکنز کا ناول "ڈیوڈ کاپر فیلڈ" پڑھنے لگا۔

فیصل آباد کا یہ ڈگری کالج لاہور جانے والی سڑک کے کنارے واقع تھا جس کی وجہ سے کالج کے سامنے بہت شور رہتا تھا۔ البتہ کالج کی عمارت کے پچھلی جانب بڑا سکون تھا' ہاکی' فٹ بال اور کرکٹ کے گراؤنڈ بھی اس طرف تھے۔ گراؤنڈ کے آس پاس شیشم کے اونچے اونچے سینئر درخت تھے' جنہوں نے طلبہ کی کئی نسلوں کو اپنے سایہ تلے پڑھتے دیکھا تھا' ان درختوں کے نیچے سیمنٹ کے بنچ بنے ہوئے تھے جن پر بیٹھ کر پڑھا بھی جا سکتا تھا اور کھیلوں کے موسم میں میچ بھی دیکھا جا سکتا تھا' دو تین بنچ بیچ میں سے ٹوٹ گئے تھے' ان کی بجری نکل چکی تھی اور زنگ آلود سریا اپنی جگہ صاف نظر آ رہا تھا' گراؤنڈ کے اس پر کھیتوں میں الگ تھلگ کالج ہوسٹل واقع تھا جس میں مختلف دیہات سے آنے والے لڑکے بڑی خوشی سے ٹھہرتے تھے اور بی۔ اے یا بی۔ ایس سی کر کے چلے جاتے تھے فطرت ناول کی دنیا میں پوری طرح مگن تھا کہ کسی نے چپکے سے اس کے دائیں کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ یہ ارشد تھا جو حال ہی میں اس کا دوست بنا تھا اور چند ہفتوں کے اندر اندر اس کے بہت قریب آ گیا تھا۔ وہ فطرت اور اس کی زندگی میں گہری دلچسپی لیتا تھا' اگرچہ پچھلے تین سالوں میں فطرت نے کالج میں کئی دوست بنا لئے تھے۔ نواز' محمود' غفور' صاحبداد' رحیم پیرزادہ اور نصیر تارڑ' لیکن وہ ارشد کو سب

سے نیا اور سب سے قابل اعتماد دوست سمجھتا تھا۔
ارشد فیصل آباد کے ایک کھاتے پیتے صنعتی خاندان کا چشم و چراغ تھا۔ اس کے خاندان میں نوکری کرنے کا رواج نہ تھا بلکہ وہ نسل در نسل دوسروں کو نوکر رکھتے آئے تھے۔ ایسے گھرانوں کے بعض بچے بہت ہی الجھے ہوئے ہوتے ہیں اور بعض سلجھے ہوئے۔ ارشد کا شمار سلجھے ہوئے متین لڑکوں میں ہوتا تھا جو پڑھائی میں بھی سنجیدہ تھا اور عمومی رویے میں بھی۔ شاید طبیعتوں کی یہ متانت ہی ارشد اور فطرت کو ایک دوسرے کے قریب لے آئی تھی۔

Urdu4U.COM

ارشد کے آتے ہی فطرت نے ناول الٹا کر گھاس پر رکھ دیا اور ارشد کا ہاتھ کھینچ کر اسے اپنے ساتھ گھاس پر بٹھا لیا۔
ارشد نے کہا "تم ہر وقت افسانوی دنیا میں کھوئے رہتے ہو' سچ پوچھو تو مجھے افسانوی کردار بالکل اچھے نہیں لگتے' ان سے کہیں دلچسپ کردار ہماری حقیقی زندگی میں مل جاتے ہیں۔"
فطرت نے کہا "اگر تم ادبی بحث کے موڈ میں ہو تو میں تمہیں بتا سکتا ہوں کہ افسانوی کردار حقیقی زندگی کے کرداروں سے کہیں زیادہ حقیقی ہوتے ہیں' ہڈسن نے اپنی کتاب "ادب سے ایک تعارف" میں لکھا کہ"
"یار چھوڑو ان کتابی حوالوں کو۔ مجھے تم اپنی بقیہ کہانی سناؤ" "چھوڑو بھئی' میری کہانی میں کیا پڑا ہے۔ ہم سے کہیں زیادہ ستم رسیدہ لوگ اس دنیا میں موجود ہیں بلکہ اس اسلامی جمہوریہ پاکستان میں رہتے ہیں' کس کس کی سٹوری سنو گے' کس کس کے ساتھ ہمدردی کرو گے"
"مجھے فی الحال اپنے عزیز اور جگری دوست فطرت کی سٹوری سے دلچسپی ہے ہاں تو پچھلی مرتبہ تم نے اپنے بچپن کہانی قسطوں میں سنانے کے بعد یہ افسوس ناک خبر سنائی تھی کہ ذکیہ کو غنڈے اٹھا کر لے گئے بھرے بازار سے۔ پھر کیا ہوا؟"
"ہونا کیا تھا' ذکیہ کو واپس ملنا تھا' نہ ملی"
"اور شیخ صاحب نے بھی کچھ نہ کیا"

"ان سے جو کچھ ہو سکتا تھا انہوں نے کیا' مجھے ساتھ لے کر کئی مرتبہ ایس۔ پی صاحب کے پاس گئے' وزیر اعلیٰ' آئی۔ جی پولیس اور گورنر صاحب کو تار بھجوائے"

URDU4U.COM

"ان تاروں کا کچھ اثر ہوا"

"اثر کیا ہوتا۔ وہ تاریں گھوم پھر کر دوبارہ اسی ایس۔ پی اور اسی تھانے دار کے پاس پہنچ جاتیں اور وہ اپنا بنا بنایا جواب بھیج کر کاروائی پوری کر دیتے"

"گویا ذکیہ بہن کو آپ لوگوں نے رائٹ آف کر دیا"

"کیسی باتیں کرتے ہو' ارشد' کبھی بہنوں کو بھی رائٹ آف کر سکتا ہے یہ تو ایسا زخم ہے جو کبھی مندمل نہیں ہو گا۔ یہ بوجھ تو میں ساری عمر اپنے سینے پر اٹھائے پھروں گا" ارشد نے موضوع بدلتے ہوئے کہا "پڑھائی پر تو اثر نہیں ہوا"

"اثر ہو لیکن صرف اس حد تک کہ میرے استادوں کو توقع تھی کہ میں پنجاب میں فرسٹ آؤں گا لیکن میں صرف ہائی فرسٹ ڈویژن میں پاس ہو سکا' ساڑھے آٹھ سو میں سے ۷۱۹ نمبر آئے میری اس کامیابی میں ڈرانگ ٹیچر ذوالفقار صاحب کا بڑا ہاتھ تھا' یار وہ بڑے عظیم ٹیچر تھے' یہی وہ استاد تھے جنہوں نے مجھے سکھایا کہ پنسل سے لکیر کھینچتے وقت کلائی کو کس زاویئے سے گھمانا چاہئے اور دائرے کی گولائی میں کن کن باتوں کا خیال رکھنا چاہئے کہنے کو تو وہ صرف ڈرائنگ سکھائی بلکہ اپنے پاس سے ڈرائنگ کے اعلیٰ نمونے بھی دکھائے جو انہوں نے اپنی تربیت کے دوران حاصل کئے تھے' ان کا خیال تھا اور میں سمجھتا ہوں درست خیال تھا کہ انسان اگر لکیر' قوس اور دائرے کو سمجھ لے تو وہ ڈرائنگ میں کبھی مار نہیں کھا سکتا"

"اچھا تو ۷۱۹ مارکس لے کر تم نے کیا کیا"

"کرنا کیا تھا' میری والدہ کی شروع سے خواہش تھی کہ میں پڑھ لکھ کر اوور سنیر بنوں اور میں نے اس مقصد کے لئے میٹرک میں ڈرائنگ لی تھی لیکن ذوالفقار صاحب نے میری ایسی تربیت کہ مجھے کاغذ پر لیٹی ہوئی لکیریں جاندار دکھائی دینے لگیں' قوسوں

سے مجھے کسی نا مکمل چیز کا احساس ہونے لگا اور دائرے میں مجھے پوری کائنات نظر آنے لگی۔ میرا جی چاہا کہ میں اور پڑھوں' آرٹسٹ بنوں غریبوں اور ستم زدہ لوگوں کے غموں' اندوھوں اور محرومیوں کی عکاسی کروں لیکن یہ باتیں میری ان پڑھ ماں کی سمجھ سے بالا تھیں لیکن بھلا ہو شیخ صاحب کا کہ انہوں نے میرے مارکس دیکھ کر کالج میں میرے داخلے کی حمایت کر دی اور میری ماں کو بھی قائل کر لیا"

URDU4U.COM

ارشد خاموشی سے سنتا رہا۔

"کالج میں پہنچ کر میں نے آرٹس میں داخلہ لے لیا۔ میری جہالت کا یہ عالم تھا کہ میں آرٹس کو آرٹ کی جمع سمجھتا تھا میرا خیال تھا کہ میں آرٹس پڑھ کر تمام فنون پر حاوی ہو جاؤں گا لیکن کالج میں آ کر جب مضامین کا انتخاب کرنا پڑا تو ان میں معاشیات' معاشرتی علوم' اسلامیات اور فارسی وغیرہ شامل تھے' میں نے لازمی انگریزی کے علاوہ تاریخ' معاشرتی علوم اور اردو کا انتخاب کر لیا۔ میری اردو ویسے بھی بہت اچھی تھی۔ میں انٹر میں جن استادوں سے پڑھتا رہا ان میں پروفیسر رضوی نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا۔ وہ انگریزی کے استاد تھے لیکن اردو اور فارسی ادب سے بھی واقف تھے' فنون لطیفہ کے بارے میں بھی ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ ان کا لیکچر سنتے وقت یہ امتیاز کرنا مشکل ہو جاتا تھا کہ وہ انگریزی ادب پڑھا رہے ہیں یا تاریخ ثقافت۔ وہ کالج میں صرف دو سال رہے اور ڈاکٹریٹ کے لئے کیمرج چلے گئے۔

"مجھے خوشی ہے کہ تھرڈائیر میں آ کر مجھے پروفیسر یوسف جیسے عالم و فاضل استاد نصیب ہوئے' سچ پوچھو تو انہوں نے پروفیسر رضوی کی کمی پوری کر دی' انہوں نے نہ صرف اچھی کتابوں کی طرف میری رہنمائی کی بلکہ اپنی ذاتی کتابیں بھی مستعار دیں' میں سمجھتا ہوں کہ میں اب جو کچھ بھی ہوں پروفیسر رضوی اور پروفیسر یوسف جیسے مہربان استادوں کی وجہ سے ہوں"

"پھر کیا ہوا؟"

"پھر کیا ہونا تھا تھرڈائیر میں تم جیسے ہونق دوستوں سے پالا پڑا۔ اور مزید سال ڈیڑھ سال

تمہیں برداشت کرنا پڑے گا"
اس مذاق پر دونوں قہقہہ لگاتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے اور شیشم کے بلند و بالا درختوں کے نیچے خشک پتوں پر چلنے لگے۔ خشک پتوں پر چلنا دونوں دوستوں کی مشترکہ ہابی تھی جب وہ بازو میں بازو ڈالے قدم بہ قدم خشک پتوں پر چلتے اور وہاں سے دھیمی صدائیں آتیں تو یہ دونوں دوست بہت محفوظ ہوتے۔ آج بھی وہ یہی مزہ لے رہے تھے تو فطرت نے کہا

URDU4U.COM

"ارشد یار! ہم کتنے خود غرض ہیں"
"یہ انکشاف تم پر اچانک کیسے ہو گیا"
"ان پتوں پر چلتے چلتے ہمارے قدموں سے جو آواز آ رہی ہے مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ گرے پڑے پتوں کا احتجاج ہے۔ اشرف المخلوقات انسان کے خلاف۔ تمہارے اور میرے رویئے کے خلاف۔ لیکن ہم اپنے لطف کی خاطر ان پتوں کو کچلے جا رہے ہیں' کچلے جا رہے ہیں"
ارشد نے ایک دھپہ فطرت کے کندھے پر مارا اور کہا "فلاسفر صاحب! نکل آؤ ان خیالوں سے' حقیقی زندگی میں آؤ حقیقی زندگی میں۔"
اس کے ساتھ ہی ارشد اسے کھینچ کر اپنے سکوٹر تک لے آیا اور کہنے لگا آؤ تمہیں گھر چھوڑ دوں ورنہ زرد پتوں کی چیخوں میں کھوئے رہو گے"
فطرت نے اس کی پیشکش قبول کر لی

بی۔ اے میں فطرت نے فلاسفی اور پولٹیکل سائنس لے رکھی تھی فنون لطیفہ اس کا اختیاری مضمون تھا۔ انگریزی ویسے ہی لازمی تھی۔ اپنے طبعی رجحان کی وجہ سے فطرت انگریزی ادبیات اور فلاسفی میں گہری دلچسپی لیتا تھا۔ لیکن پولٹیکل سائنس اسے خشک مضمون لگتا تھا۔ اس مضمون کو سال ڈیڑھ سال پڑھنے کے باوجود وہ اس سے لطف اندوز نہ ہو سکا۔ اس مضمون کے خلاف اس کا بنیادی اعتراض یہ تھا کہ درسی کتابوں میں پولٹیکل سائنس

کی جو تھیوری پڑھائی جاتی ہے اس کا پاکستانی سیاست سے کوئی تعلق نہیں۔ ہابس' لاک' روسو اور لاسکی وغیرہ کسی ایسی دنیا کی باتیں کرتے تھے جو ابھی پاکستان میں تخلیق نہیں ہوئی تھی۔ ایسے معاشرے میں جہاں جہالت اور غربت کی فراوانی ہو وہاں ووٹ کے تقدس' پارلیمانی نظام' جمہوری اقدار کے احترام اور ووٹوں کے زور پر حکومتیں بنانے اور توڑنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

فطرت نے مغربی مفکروں سے بد دل ہو کر بعض پاکستانی مصنفین کی کتابیں اٹھائیں انہیں غور سے پڑھا لیکن ان کے مطالعے سے بھی یہی انکشاف ہوا کہ انہوں نے مغربی مفکروں کی سوچ کو اپنے الفاظ میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے اور بس! ان میں سے کسی نے بھی مقامی حالات کے مطابق پاکستان کی سیاست پر غور و فکر نہیں کیا اور کوئی ایسی کتاب نہیں لکھی جو فطرت کی نظر میں جچتی ہے۔ چنانچہ وہ پولٹیکل سائنس کی کلاس میں بیٹھ کر یا تو انگریزی ناول پڑھتا رہتا یا پنسل سے اسکیچ بناتا رہتا۔

ایک دن پولٹیکل سائنس کی کلاس میں پروفیسر علوی چار مشہور دساتیر (فرانس' برطانیہ' امریکہ اور سوئٹزر لینڈ) پر لیکچر دے رہے تھے اور فطرت گم سم بیٹھا یہ سوچ رہا تھا کہ ہمارا دستور کب بنے گا۔ علوی صاحب نے چاروں دستوروں کے اچھے اچھے نکات بیان کئے۔ ان کا تقابلی مطالعہ کیا اور لڑکوں کو تلقین کی کہ وہ اس موضوع کی خوب تیاری کر لیں۔ فائنل امتحان میں کم از کم بیس نمبر کا ایک سوال اس پر ضرور آئے گا۔

فطرت کا ذہن کہیں اور پھر رہا تھا اس نے کاپی پنسل نکالی اور سٹیج پر لیکچر دیتے علوی صاحب کو ماڈل سمجھ کر ان کا اسکیچ بنانے لگا۔ علوی صاحب کافی دیر تک دیکھتے رہے کہ فطرت کے ہاتھمیں پکڑی ہوئی پنسل بائیں سے دائیں جانب حرکت کرنے کی بجائے اوپر نیچے گردش کر رہی ہے جیسے کوئی آوٹ لائن میں شیڈنگ کر رہا ہو۔ وہ فوراً اسٹیج سے نیچے اترے اور فطرت کی چوری پکڑ لی' وہ اسے پرنسپل کے پاس لے گئے۔ ساری کلاس حیران رہ گئی اور فطرت کی کالج بدری کا انتظار کرنے لگی۔

پروفیسر علوی نے فطرت کو پرنسپل کے سامنے پیش کرتے ہوئے کہا:
"سر' دیکھ لیجئے اسے چہیتے شاگرد کی کرتوت۔ آپ پھر گلہ کرتے ہیں کہ پولٹیکل سائنس کا رزلٹ اچھا نہیں آتا"
"کیوں' کیا کیا اس نے"
"اس کے ہاتھ کی کاپی دیکھ لیجئے۔ برخوردار دستور کے بارے میں لیکچر کے دوران میرا اسکیچ بناتے رہے۔ یہ کیا خاک پاس ہوں گے"
"اچھا' آپ اسے میرے پاس چھوڑ جایئے" پرنسپل نے کہا۔
پروفیسر علوی فطرت کو پرنسپل کے حوالے کر کے خود غصے کی حالت میں واپس کلاس میں چلے گئے۔
"بیٹھو" پرنسپل صاحب نے فطرت سے کہا۔
وہ اکڑوں کرسی کے اگلے کنارے پر ٹک گیا۔
"آرام سے بیٹھو"
فطرت نے تعمیل ارشاد کی۔ اس نے اپنا جسم تو کرسی پر ڈھیلا چھوڑ دیا لیکن اس کی روح ابھی تک ٹنگی ہوئی تھی۔
پرنسپل نے کہا
"دیکھو' فطرت' میں تمہارے حالات سے اچھی طرح واقف ہوں۔ تم یہاں ساڑھے تین سال سے پڑھ رہے ہو۔ کالج میگزین کو سنوارنے اور یہاں کی ادبی سرگرمیوں کو پروان چڑھانے میں تم نے اہم خدمات انجام دیں ہیں۔ میں تمہاری ذہانت' مطالعہ اور متانت کی قدر کرتا ہوں۔ لیکن یہ یاد رکھو کہ کورس کی کتابیں نہیں پڑھو۔ کمزور مضمونوں پر اور زیادہ توجہ دو۔ ایک دفعہ تم نے بی۔ اے کا مرحلہ طے کر لیا تو بے شک اپنی مرضی کے مطابق ایم۔ اے انگریزی یا ایم۔ اے فائن آرٹس میں داخلہ لے لینا۔ لیکن فی الحال پڑھو۔ میرے بیٹے پڑھو۔ کورس کی کتابیں پڑھو۔ پولٹیکل سائنس فلاسفی اور انگریزی پر توجہ دو۔ تصویریں بعد میں بناتے رہنا۔"

پرنسپل کی پند و نصیحت کا انداز اس قدر مشفقانہ تھا کہ فطرت پر اس گفتگو کا گہرا اثر ہوا۔ اس نے درسی کتابوں کی طرف زیادہ توجہ دینا شروع کر دی۔

URDU4U.COM

ارشد کا گھر ان گھرانوں میں سے تھا جہاں دولت کی فراوانی اخلاقی اقدار کو پگھلا دیتی ہے۔ پشت ہا پشت سے چلی آنے والی خوشحالی نے ارشد کے گھر والوں کا رہن سہن خاصا بدل دیا تھا۔ اگرچہ ان دنوں فیصل آباد پس ماندہ اضلاع میں شمار ہوتا تھا لیکن ارشد کے گھر جا کر انسان یہ بھول جاتا تھا کہ وہ فیصل آباد میں ہے یا لاہور میں۔ ان کے گھر میں زنانہ اور مردانہ حصوں کی کوئی تخصیص نہیں تھی۔ بہت بڑا ڈرائنگ روم تھا جس میں بہت پرانا مگر خوبصورت قالین بچھا ہوا تھا۔ بلکہ ایک قالین کی بجائے دو بڑے بڑے قالین پہلو بہ پہلو یوں بچھائے گئے تھے کہ سارا فرش چھپ گیا تھا۔ صوفوں اور کرسیوں کی ترتیب کچھ اس طرح تھی کہ تین تین چار چار آدمی ایک ہی کمرے میں علیحدہ علیحدہ محفل جما سکتے تھے۔ لڑکیوں اور لڑکوں کے دوست آزادانہ گھر میں آتے جاتی تھے۔ میوزک سنتے تھے۔ پکنک کے پروگرام بناتے تھے۔ کافی پیتے تھے اور پہروں گپ شپ لگاتے رہتے تھے۔

اگر ارشد کا دوست نہ ہوتا تو فطرت کبھی بھی اس گھر تک رسائی حاصل نہ کر پاتا۔ ارشد اسے نہ صرف کئی مرتبہ اپنے گھر لے گیا بلکہ اس نے اپنے ماں باپ اور بہنوں سے اس کا تعارف بھی کرا دیا۔ ارشد دو بہنوں کا اکلوتا بھائی تھا اور گھر والے اس کی اور اس کے دوستوں کی بڑی قدر کرتے تھے۔ اس کی دونوں بہنیں عمر میں اس سے بڑی تھیں۔ اور دونوں کنواریت ھیں۔ زہرہ ارشد سے ایک سال سوا سال بڑی تھی لیکن پتہ نہیں کیوں ذرا مرجھائی مرجھائی سی لگتی تھی۔ فرح ارشد سے چار سال بڑی ہونے کے باوجود بڑی ترو تازہ لگتی تھی اس کا قد لمبا اور گردن صراحی دار تھی۔ وہ سر کے بال کٹوانے کی وجہ سے اور بھی خوبصورت اور لمبی لگتی تھی۔ اس کی آنکھیں موٹی اور نقش تیکھے تھے۔ اس کا رنگ بہت گورا نہیں تھا۔ لیکن اسے کسی طور سانولا بھی نہیں

کہا جا سکتا تھا۔ بس ہلکا سا نمکین! لیکن جوانی کی گداز میں یہ نمکین رنگ بھی ملاحت میں بدل گیا تھا۔ موٹی موٹی آنکھوں میں مسکراہٹ ہر وقت کھیلتی رہتی جیسے انہیں مسکرانے کے سوا کوئی کام ہی نہیں۔ باتیں کرتے وقت اس کی لمبی گردن میں ہلکی سی لچک محسوس ہوتی جیسے کچی شاخ لہرا رہی ہو۔ یہ لچک چہرے پر کھیلتی مسکراہٹ کے ساتھ مل کر عجب دل موہ لینے والا انداز اختیار کر لیتی تھی۔

"یہ میرے دوست اور کلاس فیلو فطرت ہیں۔ بہت اچھے آرٹسٹ اور پامسٹ"

ارشد کی زبانی یہ تعارف سن کر اس کی دونوں بہنیں خوشی سے کھلکھلا اٹھیں۔ امیر گھرانوں کو خوش طبعی کے لئے آرٹسٹ اور پامسٹ ہمیشہ درکار ہوتے ہیں۔ تا کہ وہ تصویروں میں ان کے چہروں کو اور حسین بنا سکیں اور ان کی قسمت کا حال ان کے خوابوں کے مطابق بتا سکیں۔ دونوں بہنوں نے فوراً اپنی اپنی خواہشات کا اظہار کر دیا۔

"میں پورٹریٹ بنواؤں گی" زہرہ نے کہا

"میں قسمت کا حال پوچھوں گی" فرح نے گردن کو لچک دی

"بھئی۔ ٹھہرو تو' فطرت پہلی بار آخری مرتبہ تو نہیں آیا یہاں۔ اکثر آتا رہتا ہے اور آتا رہے گا۔ میں نے سوچ آج ان سے آپ لوگوں کا تعارف کرا دوں کیا یاد کرو گی کہ بھائی رکھتے تھے۔ اور وہ بھی مجھ جیسا" ارشد نے خود ستائی میں تقریر کر دی۔

اس روز تو فطرت کی جان جلدی چھوٹ گئی اور وہ چائے وغیرہ پی کر واپس چلا آیا لیکن اگلی ملاقاتوں میں مصوری اور پامسٹری کا اصرار بڑھنے لگا اور فطرت نے دونوں احکامات کی تعمیل شروع کر دی۔ زہرہ کو ایک پنسل اسکیچ بنا دیا جو اس نے اپنے کمرے میں لٹکا لیا اور فرح کو حسین مستقبل کے خواب دکھانے شروع کیے جن کی اسے تمنا تھی۔

دو چار ملاقاتوں کے بعد فطرت کو یوں لگا کہ اس کے دل کا کوئی ٹکڑا ارشد کے گھر میں کہیں اٹک گیا ہے۔ وہ محسوس کرنے لگا کہ فرخ کے گداز جسم اور جوان حسن کا جادو اس پر چل چکا ہے لیکن اس نے اس جذبے کو سختی سے دبا دیا کیونکہ ارشد

اس کا بہترین دوست تھا اور وہ اس کی بہن کے متعلق دل میں کسی قسم کا کوئی برا خیال لانا نہیں چاہتا تھا حالانکہ جس ماحول میں ارشد اور اس کے گھر والے رہتے تھے اس میں اس قسم کی احتیاطیں غیر ضروری اور دقیانوسی سمجھی جاتی تھیں۔

ایک دن قسمت کا حال بتانے کے لئے فطرت نے فرح کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑا تو اسے چھوڑنا ہی بھول گیا۔ اگرچہ فطرت کے ہاتھ میں فرح کے دائیں ہاتھ کی انگلیوں کے صرف پور ہی تھے لیکن اسے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ ساری کائنات اس کے ہاتھوں میں آ گئی ہے۔ اس نے قسمت کا حال جاننے کے بہانے فرخ کی ہتھیلی کے ابھاروں کو دبایا و وہ دب کر دوبارہ اپنی جگہ پر آ گئے اور خون کا دورہ بھی بحال ہو گیا۔ فطرت کو یہ ہاتھ بہت گداز اور نسوانی حرارت سے بھرپور لگا۔ اس کا جی چاہا کہ وہ فرح کے پورے ہاتھ کو اپنے بھرپور ہاتھ میں لے کر خوب بھینچے۔ اسے خوب مسلے اور اسکا سارا گداز نچوڑ لے۔ لیکن زہرہ نے یہ کہہ کر فطرت کے خیالوں کا تانا بانا توڑ دیا کہ "فطرت بھائی' میری ایک سہیلی کا بھی پورٹریٹ بنا دیں گے نا"

فطرت نے سوچے سمجھے بغیر "ہاں" کر دی حالانکہ وہ زہرہ اور اس کی سہیلی کی بجائے فرح اور اس کے گداز ہاتھ میں کھویا ہوا تھا۔

جوں جوں فطرت کا ارشد کے گھر آنا جانا بڑھتا گیا اس کے اضطرار میں اضافہ ہوتا گیا۔ اسے یوں محسوس ہونے لگا کہ اس کے دل کے تار کہیں الجھ گئے۔ لیکن اسے اچانک نسرین کا خیال آیا جس نے اس کی معصوم محبت کو اس طعنے کے ساتھ ٹھکرا دیا تھا کہ وہ ایک نوکرانی کا بیٹا ہے اور سرونٹ کوارٹر میں رہتا ہے۔ یہ حقیقت تو فرح کو بھی معلوم تھی۔ فطرت نے سوچا کہ ارشد کے گھر والے شیخ صاحب سے بھی زیادہ امیر ہیں اگر اس نے اظہار محبت کی جرات کی تو پتہ نہیں فرح کی طرف سے کیا جواب ملے۔ لیکن آغاز جوانی میں اس کے جذبات اتنے شدید تھے کہ کوشش کے باوجود اپنے آپ کو فرح سے الگ نہ کر سکا۔

ایک دن وہ ارشد کے گھر گیا تو فرح لان میں بیٹھی فیشن میگزین دیکھ رہی تھی فطرت

نے ارشد کے متعلق پوچھا تو فرح نے روایتی مسکراہٹ اور بولتی آنکھوں سے اسے بتایا کہ "وہ کسی دوست کو ریلوے اسٹیشن پر چھوڑنے گیا ہے' آتا ہی ہو گا' تم آؤ بیٹھو"

URDU4U.COM

وہ لمحے بھر کو جھجکا پھر جرات کر کے فرخ کے پاس خالی کرسی پر بیٹھ گیا۔

"اکیلی بیٹھی ہیں' آج"

گھر والے کسی کے ہاں گئے ہیں۔ کوئی منگنی ونگنی کا چکر ہے۔ میرا موڈ نہیں تھا۔ میں نے اپنی سہیلی کو فون کر دیا تھا۔ اس نے فوراً آنے کا وعدہ کر لیا تھا لیکن خبیث ابھی تک آئی نہیں۔"

"کس کی منگنی؟"

"میری نہیں۔ کم از کم میں اتنی بات اعتماد سے کہہ سکتی ہوں"

فطرت نے اسے ایک حوصلہ افزا اشارہ سمجھا اور ذرا جرات کر کے کہا۔

"اگر آپ برا نہ منائیں تو کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ نے ابھی تک اپنی منگنی یا شادی کیوں نہیں کروائی؟"

"تم تو آرٹسٹ ہو' فطرت' تم جانتے ہو کہ ہر شخص کا کوئی نہ کوئی آئیڈیل ہوتا ہے۔"

"ہاں ہاں ہوتا ہے۔ آپ کا آئیڈیل کیا ہے؟"

"ایک خوش ذوق' خوش پوش نوجوان' جسے ادب شاعری اور پامسٹری کا شوق ہو' باتیں کرے تو اس کے منہ سے پھول جھڑیں۔ لان میں بیٹھے تو لان سجے' ہارڈی' ڈکنز' شکسپیئر' شیلے اور کیٹس کی باتیں کرے۔

"اور وہ دیکھنے میں ہینڈ سم ہو۔ بارعب ہو"

فطرت دل ہی دل میں اس پیمانے کے مطابق اپنے آپ کو پرکھتا رہا اور ہر نوجوان کی طرح اپنے آپ کو ہینڈ سم' خوش ذوق اور خوش پوش سمجھتا رہا۔

"کیا میں آپ کا ہاتھ دوبارہ دیکھ سکتا ہوں؟"

"یہ معلوم کرنے کے لئے کہ ایسا نوجوان میری قسمت میں ہے یا نہیں" فرح نے کہا۔

"یہی سمجھ لیں"

فرح نے بہت سی مسکراہٹوں اور گردن کے ہلکے سے خم کے ساتھ اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔

آج فطرت نے فرح کا ہاتھ اک نئے انداز سے پکڑا جیسے انگریزی فلموں یا ڈراموں میں ایک ڈیوک ایک شہزادی کا ہاتھ تھامتا ہے اور پھر حسینہ سے اپنی آرزو کا اظہار کرتے ہوئے شہزادی کے ہاتھ کو اپنے ہونٹوں تک اٹھاتا ہے اور اسے بوسہ دیتا ہے۔ شہزادی مسکرا کر ڈیوک کی پیشکش قبول کر لیتی ہے۔

شاید فطرت اسی قسم کے خیالوں میں گم تھا۔ اس نے فرح کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا جھک کر اسے بوسہ دے دیا۔ محبت و احترام سے بھرا بوسہ!

فرح نے غصے اور تکبر سے بھرا ہوا تھپڑ فطرت کے منہ پر دے مارا اور سختی سے "ذلیل' کمینے' گھٹیا لوگوں کو منہ لگاؤ تو ان کا دماغ ہو خراب ہو جاتا ہے کمینہ کہیں کا۔ دفع ہو جا یہاں سے" وہ یہ کہہ کر اٹھی اور تیز تیز قدم اٹھاتی کوٹھی کے اندر چلی گئی۔

فطرت فوراً باہر نکل آیا۔

اچھا ہوا کہ ابھی تک نہ ارشد ریلوے اسٹیشن سے واپس آیا تھا نہ فرح کی سہیلی پہنچی تھی۔

نسرین کے بعد فطرت کی غربت پر یہ دوسرا طمانچہ تھا۔

بی۔ اے کے امتحان بخیر و خوبی ختم ہوئے تو امیر لڑکوں نے مختلف پروگرام بنانا شروع کر دیئے۔ ارشد نے تو شروع سے ہی کسی پروگرام کی شرکت کرنے سے معذرت کر لی کیونکہ اس کے ابا جی ٹیکسٹائل کی نئی مشینری خریدنے انگلینڈ جا رہے تھے اور وہ ارشد کو ساتھ لے جانا چاہتے تھے تاکہ وہ ابھی سے اس کام میں دلچپی لینے لگے۔ ویسے بھی بی۔ اے کرنے کے بعد ارشد اپنے والد کے کاروبار میں عملی طور پر شریک ہونے والا تھا ان دنوں ایسے گھرانوں کے لئے بی۔ اے تک کی تعلیم کافی سمجھی جاتی تھی۔

بہت سے لڑکوں نے مری جانے کا پروگرام بنایا۔ چند ایک کاغان جانے کا سوچ رہے تھے۔ فطرت کے دوستوں کا خیال تھا کہ شہروں کے ہنگاموں سے دور کافرستان جایا جائے تا کہ ذرا مزہ بھی آئے گا' نواز محمود اور تارڑ کافرستان والی تجویز کی حمایت میں تھے۔ نواز نے جس کا سارا خاندان ٹرانپورٹ کے شعبے سے متعلق تھا یہ پیشکش کیکہ "میں اپنے ٹرانسپورٹ پول سے ایک کار لے لوں گا۔ ابا جی نے پہلے ہی مجھ سے وعدہ کر رکھا ہے کہ امتحانات کے بعد وہ میری کے مطابق مجھے سیر کے لئے بھیجیں گے اور کار پر بھیجیں گے۔ اگر میں آپ لوگوں کا بتاؤں گا تو وہ اور خوش ہوں گے کہ میں آوارہ گردی نہیں کروں گا اور آپ لوگوں کی حفاظت میں رہوں گا۔ پتہ نہیں اب تک وہ میری حفاظت کے متعلق کیوں پریشان رہتے ہیں جیسے میں کوئی بچہ ہوں۔" باقی سب لڑکوں نے چندہ جمع کیا۔ نواز نے گھر سے کار لے لی اور یوں چاروں دوست۔ فطرت' نواز' محمود اور تارڑ کافرستان روانہ ہو گئے۔

انہوں نے راستے میں راولپنڈی اور پشاور میں پڑاؤ کیا اور تیسرے روز چترال پہنچ گئے۔ وہاں انہوں نے ترچ میر ہوٹل میں قیام کیا اور وادی کافرستان میں جانے کے لئے جیپ کا بندوبست کرنے لگے۔ کیونکہ اس سے آگے کار نہیں جا سکتی تھی۔

اسی ہوٹل میں ایک غیر ملکی ٹورسٹ پارٹی ٹھہری ہوئی تھی جنھوں نے جیپوں کا بندوبست تو کر لیا تھا لیکن کسی مقامی یا پاکستانیس اتھی کی تلاش میں تھے کیونکہ انہی دنوں ایک اخبار میں کسی غیر ملکی سیاح کے قتل کی خبر چھپی تھی جس سے غیر ملکی باشندے ذرا محتاط ہو گئے تھے۔ چنانچہ اس پارٹی نے ان نوجوانوں کی معیت کو غنیمت جانا اور ایک ساتھ وادی کی سیر کا پروگرام بنا لیا۔

ٹورسٹ پارٹی آٹھ افراد پر مشتمل تھی۔ چار مرد اور چار عورتیں جو آپس میں میاں بیوی نہیں تھے۔ بس سیر و تفریح کے لئے ایک گروپ کی شکل میں نکل آئے تھے۔ ان میں سے ایک چھریرے بدن کی مس کرٹی تھی جو کبھی نرسنگ کے پیشے سے متعلق رہی تھی اور اب "مکھیوں اور مچھروں کے اس ملک میں پورے گروپ کی صحت کا خیال

رکھنے پر مامور تھی۔
چاروں مردوں اور چاروں عورتوں کے نام اور تلفظ یاد رکھنا فیصل آباد کے ان لڑکوں کے لئے ذرا پیچیدہ مسئلہ تھا۔ اس لئے انہوں نے اپنی مرضی سے ان کے نام رکھ لئے۔
URDU4U.COM
ذرا فربہ جسم والی کانام "مس گول گپا" رکھ دیا اور پتلی دبلی کا نام" مس بھنڈی توری" ایک لڑکی جو ذرا رسیلی تھی اسے "مس گلاب جامن" کہنے لگے اور جو سب سے بد شکل تھی اس کا نام "شاہ پری" رکھ دیا۔
اسی طرح مردوں کے نام بابا لومڑ' انکل کیک پیس اور مسٹر پول والٹ رکھ دیئے۔ ان مردوں میں سے جو بڈھا تھا اور باری باری ساری لڑکیوں پر ہاتھ پھیرتا رہتا تھا اسے "بابا ٹھرکی" کہنے لگے۔ یہ ولایتی لوگ جو سیرو تفریح کے لئے نکلے تھے ان نئے ناموں سے بڑے محفوظ ہوئے۔ کبھی کبھی وہ ان کا مطلب پوچھتے تو فطرت یا نواز غلط سلط ترجمہ کر کے انہیں کوئی حسین سا مطلب سمجھا دیتے۔ مثلا مس "گول گپا" نے اپنے نام کا مطلب پوچھا تو نواز نے کہا "ہماری زبان میں اس کا مطلب ہے "بیوٹی کوئین" مس گول گپا اپنی تعریف سن کر اور گول گپا ہو گئی۔
وادی کا فرستان تین حصوں پر مشتمل تھی اور مختلف حصوں کے درمیان ایک ایک پہاڑی حد فاضل کا کام دیتی تھی۔ لہٰذا ایک وادی کی سیر کے بعد دوسری وادی میں جانے کے لئے پھر وادی فکا فرستان کے آغاز پر آنا پڑتا تھا۔ پہلا دن تو فیصل آبادی لڑکوں نے ان غیر ملکی سیاحوں کے ساتھ خوشی خوشی گزار لیا لیکن جب دوپہر کو انہیں بسکٹوں' پنیر اور کافی پر گذاراہ کرنا پڑا تو روٹی' سالن اور لسی کے عادی لڑکوں کو ان کے ساتھ رہنا گھاٹے کا سودا لگا۔ تارڑ جو ایک ہی دن میں مس بھنڈی توری سے تھوڑا تھوڑا الجھ گیا تھا' گروپ کی علیحدگی کی مخالفت کرنے لگا لیکن دوسرے تین دوستوں نے اسے زبردستی اپنی طرف کھینچ لیا۔ چنانچہ جب غیر ملکی سیاحوں نے دریا کے نارے ہموار جگہ پر اپنے نارنجی خیمے لگانے شروع کئے تو یہ چاروں دوست ایک ریسٹ ہاؤس میں چلے گئے۔ ریسٹ

ہاؤس میں صرف دو چار پائیاں تھیں لہٰذا چاروں نے بغیر چار پائی کے برآمدے میں سونے کا فیصلہ کیا۔

صبح اٹھے تو انہیں کافرستان کی مشہور زمانہ کافر لڑکیوں کی تلاش ہوئی جو جلد ہی کامیاب ہو گئی۔ وہ ریسٹ ہاؤس سے برساتی نالے کے ساتھ ساتھ جا رہے تھے کہ کیلاش لڑکیوں کا ایک غول نظر آیا۔ وہ ریوڑ چرا رہی تھیں۔ ان کے ساتھ کوئی مرد نہیں تھا۔ نواز نے ادھر ادھر نظر دوڑائی تو کھیتوں میں کام کرتے کیلاش مرد بھی دکھائی دیئے جس سے نواز کے ارادوں پر کچھ کچھ اوس پڑ گئی۔ لیکن وہ جرات کر کے لڑکیوں کے پاس چلا گیا اور ان سے بلا جھجک باتیں کرنے لگا۔ وہ باتیں کرتا جاتا تھا اور لڑکیاں اس کی بات سمجھے بغیر جواباً مسکراتی جاتی تھیں۔ ذرا فاصلے پر فطرت' محمود اور تارڑ نواز کی "فتوحات" کا جائزہ لے رہے تھے۔

نواز نے واپس آ کر رپورٹ دی کہ وہ غیر مردوں سے قطعاً نہیں کتراتیں بلکہ بات کرتی وقت برابر مسکراتی رہتی ہیں۔ انہیں کسی قسم کا حجاب نہیں۔ چاہو تو اپنی اپنی مرضی لڑکی کا انتخاب کر سکتے ہو۔ فطرت نے کہا "ہاں بچو کھلی چھٹی ہے' جو چاہے کرو' لیکن اس کافر نوجوانوں کا خیال رکھو جو کلہاڑی سے اخروٹ کا درخت کاٹتے ہوئے بار بار ہماری طرف دیکھ رہا ہے" "اس کی ایسی تیسی" نواز نے پنجابی بھڑک کا مظاہرہ کیا۔

آگے گئے تو ایک جگہ تین چار کافر لڑکیاں برساتی نالے میں کپڑے دھو رہی تھیں اور ان سے کوئی سو گز دور ایک حسینہ چٹان پر بیٹھی بال سکھا رہی تھی۔ نواز نے کہا

"تارڑ' تم ذرا لیٹ ہو گئے"

"کیسے؟"

"وہ تو نہا دھو کر کپڑے پہن چکی ہے۔ اب تو بال سکھا رہی ہے۔"

محمود نے کہا "دنیا امید پر قائم ہے"

محمود نے کیمرہ کھولا اور فطرت چٹان پر بیٹھی حسینہ کے پاس جا کھڑا ہوا۔ وہ نہا دھو کر دوسری کافر لڑکیوں سے کافی بہتر لگ رہی تھی۔ اس کے جسم سے ریوڑ چرانے والی

لڑکیوں جیسی بدبو بھی نہیں آ رہی تھی لیکن فطرت نے محسوس کیا کہ جوانی کے باوجود اس پر جوانی کا روپ نہیں۔ اس کے نقش تیکھے مگر گال پچکے ہوئے تھے۔ آنکھیں موٹی لیکن کسی قسم کی امید یا اشتیاق سے عاری! فطرت نے لڑکی کے ساتھ کھڑی ہو کر پوز بنایا اور محمود کے کھٹ سے تصویر اتار لی۔ چٹان پر بیٹھی حسینہ نے فوٹو کا معاوضہ طلب کرنے کے لئے دست سوال پھیلا دیا "بخشیش' بابو بخشیش!" فطرت نے اتنے سادہ اور بے داغ حسن کو یوں ہاتھ پھیلاتے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

URDU4U.COM

دوسرے روز وہ افغانستان کے بارڈر کی طرف نکل گئے جہاں سرحد سے کوئی دس بارہ میل ادھر ایک غیر ملکی ٹیم کیلاش لڑکیوں کے ڈانس فلما رہی تھی۔ چھ لڑکیاں اپنے قبائلی لباس پہنے' ایک دوسرے کے بازو میں بازو ڈالے دھیمے قدموں پر ناچ رہی تھیں اور درمیان میں دو مفلوک الحال کیلاش مرد بنسری اور ڈھولک بجا رہے تھے۔ فیصل آباد پارٹی بھی وہاں کھڑی ہو گئی۔ نواز' محمود اور فطرت تو لڑکیوں اور ڈانس دیکھنے لگے اور تارڑ ڈانسنگ پارٹی کے پیچھے چلا گیا تاکہ کسی طرح فلم میں اس کا فوٹو بھی آ جائے۔ فلم کے پروڈیوسر نے ہاتھ کے اشارے سے اسے وہاں سے ہٹ جانے کو کہا اور وہ کھسیانا ہو کر واپس آ گیا۔

ایک روز وہاں گھومتے ہوئے ایک چترالی شخص فیصل آباد پارٹی کو مل گیا۔ اس نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ وہ سیزن میں ادھر اکثر پھیرا لگاتا ہے تاکہ باہر سے آنے والے مہمانوں کی خدمت کر سکے۔ پتہ چلا کہ وہ مترجم کا کام بھی انجام دے سکتا ہے اور مقامی رسم و رواج کے بارے میں ضروری معلومات بھی فراہم کر سکتا ہے۔ یہ چاروں لڑکے اسے لے کر گھاس کے ایک تختے پر بیٹھ گئے۔ اس نے پہلے تو وہ معلومات دہرائیں جو وہ سفید فام سیاحوں کو مہیا کرتا رہتا تھا پھر اس نے کہا "آپ کی کوئی خدمت؟"

نواز نے کہا "پنجاب میں وادی کافرستان کے بارے میں بڑے عجیب و غریب کہانیاں مشہور ہیں"

"مثلاً"

"مثلاً یہ کہ یہاں کی وادی ہی نہیں لڑکیاں بھی بڑی حسین ہوتی ہیں اور بہت سستی مل جاتی ہیں"

"ہاں آپ نے صحیح سنا ہے' لڑکیاں بہت مل جاتی ہیں اور سستی مل جاتیہیں لیکن بدکاری کے لئے' شادی کے لئے"

URDU4U.COM

محمود نے پوچھا "وہ کیسے؟"

اس نے جواب دیا "وہ یوں کہ آپ کو چلتے پھرتے جو لڑکی پسند آ جائے' اس کے مالک سے رابطہ قائم کیجئے۔ شادی کا وعدہ کیجئے' اپنے ذمہ دارانہ رویے کا یقین دلائیے اور بھاؤ چکا لیجئے۔

"آج کل کیا ریٹ ہو گا۔ اچھی قبول صورت لڑکی کا" نواز نے پوچھا

"پہلے تو دو تینسو روپوں مین لڑکی مل جاتی تھی اب وہ ڈیڑھ ڈیڑ ز دو دو ہزار کی بات کرتے ہیں"

محمود نے نارڑ کو چھیڑا "کیوں ہے موڈ' نارڈ دی گریٹ؟"

"نہیں یار' سودا مہنگا ہے فی الحال"

فطرت نے اس مذاق کو رد کرتے ہوئے سنجیدہ سوال کر دیا

"لیکن مجھے تو ان چار دنوں میں ایک بھی لڑکی ایسی نہیں ملی جو صحیح معنوں میں حسین ہو"

"سارا قصور غربت کا ہے بابو جی۔ یہاں کی لڑکی پر چودہ پندرہ سال کی عمرمیں جوانی کا شائبہ سا آتا ہے اور جاڑے کی دھوپ کی طرح جلدی ڈھل جاتا ہے یہاں کی عورت خوراک کی کمی کی وجہ سے پچیس تیس سال کی عمر میں بوڑھی ہو جاتی ہے۔ اگر شادی ہو جائے تو سترہ اٹھارہ سال کی عمرمیں ایک بچے کی پیدائش ہی اس کی جوانی کو ختم کر دیتی ہے۔"

فطرت سوچتا رہ گیا کہ پاکستان کی یہ حسین و جمیل وادی جس کے دور دور تکچرچے ہیں کس قدر افلاس کی ماریہ وئی ہے جہاں باپ چند سوٹکوں کے عوض اپنی بیٹی کو اجنبی مردوں کے ہاتھوں فروخت کرنے کو تیار ہو جاتا ہے اور یہاں بھوک و افلاس کا یہ عالم

ہے کہ حسینہ فوٹو کھنچوانے کے بعد بھیک کے لئے ہاتھ پھیلا دیتی ہے۔
نواز نے کہا "فلاسفر صاحب' کن خیالات میں کھو گئے۔ باقی پارٹی تو کبھی کی جا چکی'
URDU4U.COM
اٹھو' چلیں"
وہ بھی واپس ریسٹ ہاؤس چلے گئے۔

ساتویں روز فیصل آباد کے یہ چاروں دوست کافرستان کی تیسری اور آخری وادی میں اترنے لگے تو انھیں پہاڑی کی چوٹی نارنجی رنگ کے خیمے نظر آ گئے جو دریا سے ذرا ہٹ کر ہموار زمین کے قطعے پر نصب کیے گئے تھے۔ سب نے تقریباً ایک زبان ہو کر اپنے مشاہدے کا اعلان کیا۔ "وہ رہے ولایتی لوگ۔ بابا ٹھرکی اور مس گول گپا وغیرہ"
اگرچہ پہلے دن کے تجربے کے بعد وہ ان سے الگ ہو گئے تھے لیکن چترال شہر سے وادی تک کے سفر دوران اور پہلے دن کیمشترکہ سیر میں ان کا آپس میں اچھا خاصا تعارف ہو چکا تھا۔ انھوں نے فیصلہ کیا کہ ان سے دوبارہ رابطہ قائم کیا جائے۔
وہ پہاڑی سے اترے تو وادی کے کنارے پتھروں کے بنے ہوئے ایک ہٹ میں چلے گئے جہاں ایک چوکیدار موجود تھا۔ انھوں نے کہا " بابا' لوگ اس وادی میں کچھ کھاتے پیتے ہیں"
"ہاں بیٹا' کیوں نہیں۔ کھائے پیئے بغیر کیسے زندہ رہیں گے؟"
"وہ کیا کھاتے ہیں؟"
"یہ دیکھیں نا' موسمی پھل' خوبانی' سیب' لوکاٹ' اس کے علاوہ یہاں مکئی ہوتی ہے۔ اور چترال سے گندم بھی آ جاتا ہے مگر آپ کیوں پوچھ رہے ہیں"
نواز نے آگے بڑھ کر کہا
"بابا' سیدھی بات یہ ہے کہ ہمیں بھوک لگی ہے اور تھک بھی گئے ہیں۔ کھانے کا کچھ بندوبست ہو سکتا ہے"
"ہاں بابو جی' پیسے سے سب کچھ ہو سکتا ہے"

نواز نے جیب سے دس دس روپے کے تین نوٹ اس کے حوالے کئے اور کہا "یہ لو بابا"
"کیا کھاؤ گے بابو جی؟"
"بس جو مل جائے۔ مرغ' مرغی' بکرا' بکری۔ اگر کچھ نہ مل سکے تو آلو دال یا سبزی۔ سخت بھوک لگی ہے۔"
URDU4U.COM
"فکر نہ کریں آپ۔ کس وقت کھانا کھائیں گے۔"
"جس وقت تیار ہو جائے"
وہ سب کھانا کھا کر نارنجی خیموں کی طرف چلے گئے۔ ولائتی لوگوں نے کیمپ لگانے کے لئے بڑی اچھی جگہ کا انتخاب کیا تھا۔ صاف ستھرے قطعہ زمین کے ارد گرد پھل دار درختوں کا جھنڈ تھا اور درختوں کے جھنڈ سے پھوٹنے والے چشمے کا ٹھنڈا اور تازہ پانی خیموں کے پاس ایک نالی میں سے گزرتا ہوا دریا میں جا گرتا تھا۔ نواز نے چشمے کے پانی کو چھوا اور فوراً اپنا ہاتھ کھینچ لیا جیسے اسے بچھو نے کاٹ لیا ہو۔ محمود چیخا "نواز کیا ہوا"

"یار یہ تو بہت ٹھنڈا پانی ہے۔ انتہائی ٹھنڈا"
سب دوستوں نے باری باری پانی کو چھوا اور نواز کی طرح فوراً پیچھے کھینچ لیا۔ البتہ تارڑ نے بہادری دکھانے کے لئے انگلی گرتے پانی کے نیچے رکھ دی اور کہا "یار ٹھنڈا تو ہے لیکن اتنا ٹھنڈا نہیں" دوسروں نے کہا "ہاں ضد اور ڈھیٹ پن پر ٹھنڈا یا گرم کچھ اثر نہیں کرتا۔"
سب نے مل کر قہقہہ لگایا کہ خیمہ بستی بھی ان کی طرف متوجہ ہو گئی۔ انہوں نے دور سے ہاتھ ہلا کر "ہائی ہائی" کہا اور ان لڑکوں نے جواباً ہاتھ سے اشارہ کیا کہ ہم آپ ہی کی طرف آ رہے ہیں۔
نیچے اترتے ہوئے جب وہ خیموں کے قریب پھل دار درختوں کے پاس پہنچے تو فطرت نے ٹہنی سے لٹکتا ہوا ایک سیب توڑا اسے رومال سے پونچھا اور اپنے تیز دانت نرم نرم رسیلے سیب میں پیوست کر دیئے۔ اتنے میں خیمے سے زور دار زنانہ آواز آئی
"فٹرٹ! Dont' eat, Dont' eat it." (اسے مت کھائیو' اسے مت کھائیو) فطرت نے

جبلی طور پر اپنے دھنسے ہوئے دات رسیلے سیب سے فوراً باہر کھینچ لئے اور خیمے کی طرف دیکھا جہاں مس کرٹی کھڑی مسکرا رہی تھی۔

URDU4U.COM

وہ سب نیچے اتر گئے اور کافرستان کی اس حسین وادی میں فیصل آباد ولایت سے مل گیا۔ ہر ایک نے ایک ایک ہلکا پھلکا سٹول لے لیا اور اس پر بیٹھ گئے۔ فطرت اور مس کرٹی جسے وہ "مس بھنڈی توری" کہتے تھے ایک صاف ستھری چٹان پر پاؤں لٹکا کر بیٹھ گئے کیونکہ سٹول کم تھے اور لوگ زیادہ۔

وہ سب آپس میں گپ شپ لگانے لگے۔ نواز مسل گول گپا سے منتھی ہو گیا۔ تارڑ مس شاہ پری کی باتوں میں دلچپی لینے لگا اور محمود "بابا ٹھرکی" سے مذاق کرنے لگا۔

فطرت اور کرٹی اپنی باتوں میں مصرف ہو گئے۔

فطرت نے بیٹھے ہی پوچھا

"تم نے مجھے بہت ہی رسیلے سیب سے محروم کر دیا۔ کیوں؟"

"یو سیب کھانا حفظان صحت کے اصولوں کے خلاف ہے"

".یکن میں نے تو آپ کے سامنے اسے درخت سے توڑا تھا۔ ترو تازہ"

"ہاں' تروز تازہ سیب میں بھی جراثیم ہو سکتے ہیں۔ انہیں دھوئے بغیر نہیں کھانا چاہئے لائیے میں آپ کی پیوری ٹیب (Puri-tab) ملے ہوئے پانی سے دھو دوں۔ پھر آپ بے شک کھائیے جتنے جی چاہیں"

فطرت اس احتیاط پر مسکرایا بھی اور خوش بھی ہوا کہ چلو کسی نے تو اس کی صحت کا خیال کیا۔ وہ خالص مشرقی نوجوان تھا اس نے اس توجہ کو عشق کی ابتدا سمجھتے ہوئے کہا

"لیکن مس کرٹی! آپ تو اپنی ٹیم کی صحت کا خیال رکھنے آئی تھیں۔ آپ کو میری صحت یا حفاظت کا خیال کیسے آ گیا"

کرٹی نے بالکل غیر جذباتی انداز میں جواب دیا

"لیکن انسانی صحت تو بہت قیمتی ہوتی ہے۔ خواہ کسی کی بھی ہو"

"تھینک یو' مس کرسٹی"

اس کے بعد وہ تھوڑی دیر وہیں چٹان پر بیٹھے باتیں کرتے رہے اور دوسرے ساتھی اپنی اپنی دلچسپی میں مگن رہے۔ اتنے میں کرسٹی اور فطرت اٹھ کھڑے ہوئے اور ایکدوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے وادی کی طرف چل دیئے۔ کرسٹی نے اپنے ساتھیوں سے کہا We will be back soon.(ہم ابھی آتے ہیں) سب نے جواب "بائی بائی" کہہ کر انہیں رخصت کر دیا لیکن فیصل آبادی دوست برداشت نہ کر سکے تارڑ نے جل کر کہا "شرم کرو' فطرت میم بھی پھنسائی تو بھنڈی توری۔ شرم کرو یار' شرم کرو' فیصل آباد کا نام بدنام کر دیا ہے۔ آرٹسٹ بنے پھرتے ہو۔ ذوق دیکھو اس کا"

محمود نے کہا "جلومت' تارڑ' عیش کرنے دو اسے' پہلی دفعہ اپنی معاشرتی گھٹن سے وہ آزاد ہوا ہے۔ جانے دو۔ پھرنے دو اسے۔ رسی لمبی کر دو اس کی"

محمود اور تارڑ کی یہ بحث جاری رہی اور فطرت اور کرسٹی درختوں کے جھنڈ کے پیچھے اوجھل ہو گئے۔ نواز نے جھک کر درختوں کے تنوں کے درمیانی وقفے میں عقابی نگاہوں سے فطرت اور کرسٹی کا خاصی دور تک تعاقب کیا۔ گھٹنوں سے نیچے نیچے فطرت کی پتلون اور کرسٹی کا سکرٹ دکھائی دیتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد یہ حصے بھی آنکھوں سے اوجھل ہو گئے۔

دراصل چترال سے کافرستان آتے ہوئے پہلے روز ہی فطرت اور کرسٹی میں باہمی دلچسپی کی ایک بات نکل آئی تھی۔ فطرت نے اسے بتایا تھا کہ وہ فنون لطیفہ میں دلچسپی رکھتا ہے اور پینٹنگ کو اپنا کیریئر بنانا چاہتا ہے۔ فی الحال گریجویشن کا امتحان دیا ہے۔ اگر پاس ہو گیا تو فائن آرٹس میں پوسٹ گریجویشن کرنا چاہتا ہے۔ کرسٹی نے اسے اپنے متعلق صرف اتنا بتایا تھا کہ وہ میلان میں ایک آرٹ ڈیلر کی دکان میں فرنٹ ڈیسک پر کام کرتیہ ے فطرت اسے فن پاروں کی سیلز گرل سمجھا۔ لیکن کرسٹی کو سیلز گرل یا گرل کہنا زیادتی تھی کیونکہ وہ خاصی پکی عمر کی عورت تھی۔ ہو گی کوئی پینتیس چالیس سال کی۔ اس کا جسم چھریرا اور اس کے نقش پتلے تھے۔ خاص کر اس کے ہونٹ تو

سیب کی قاش سے بھی باریک تھے۔ اس کے چہرے کی جلد پتلی مگر ملائم تھی۔ باتیں کرتے ہوئے اس کی گردن کی سامنے والی ہڈیاں بہت نمایاں ہو جاتی تھیں۔

URDU4U.COM

پہلے تو ان کی باتوں کا موضوع ان کا اپنا اپنا ملک اور وہاں کے رسم و رواج رہے لیکن بالا آخر فطرت نے گفتگو گھما پھرا کر کرسٹی پر مرکوز کر دی۔ کیونکہ وہ میلان سے زیادہ کرسٹی میں دلچسپی رکھتا تھا اور اس کے متعلق مزید جاننا چاہتا تھا۔

چلتے چلتے تھک گئے تو ایک چشمے کے پاس گھنے درختوں کی چھاؤں میں بیٹھ گئے۔ انہوں نے جوتے اتار کر الگ رکھ دیئے اور ٹھنڈے پانی سے اپنے پاؤں تازہ کرنے لگے۔ صبح ہلکی سی خنکی کی وجہ سے کرسٹی نے جو پتلا سویٹر پہن رکھا تھا اب اسے بھاری محسوس ہونے لگا۔ اس نے اتار کر اسے پتھر پر رکھ دیا۔

"کرسٹی کیا آپ مجھے اپنے متعلق کچھ اور نہیں بتا سکتیں۔ اپنے ماضی' اپنے بچپن اور جوانی کے متعلق"

"بتا تو سکتی ہوں لیکن تم یہ سب کچھ سن کر مجھ سے نفرت کرنے لگو گے۔ شاید تم واپس کیمپ تک میرا ساتھ دینا بھی پسند نہ کرو۔ فرٹ"

"نہیں' تم فکر نہ کرو۔ تم بتاؤ تو سہی' مجھے تم میں دلچسپی ہے۔ میں تمہار متعلق اور جاننا چاہتا ہوں۔ اور"

کرسٹی نے کہا

"جیسا کہ میں پہلے بتا چکی ہوں میرا ملک اٹلی ہے۔ میں اٹلی کے شہر نیپلز میں پیدا ہوئی دوسری جنگ عظیم کے دوران میں اپنے ماں باپ اور دو بھائیوں کے ساتھ رہتی تھی۔

میرے دونوں بھائی عمر میں مجھ سے بڑے تھے۔ ایک چودہ سال کا اور دوسرا سولہ سال کا۔ میں اس وقت گیارہ بارہ سال کی تھی۔ میرا باپ ایک فیکٹری میں ملازم تھا اور میری ماں گھر کا کام کاج کرتی تھی۔ پہلے وہ بھی کہیں ملازمت کرتی تھی لیکن میری پیدائش کے بعد اس نے باہر کا کام چھوڑ کر گھر کا کام سنبھال لیا تھا۔"

"ہم اٹلی کے دوسرے متوسط گھرانوں کی طرح ہنسی خوشی دن گزار رہے تھے۔ بھائیوں کا ارادہ تھا کہ وہ سیکنڈری لیول کرنے کے بعد کالج جوائن کریں گے اورمیرے دل میں نرس بننے کا شوق تھا میں نے اس عمر میں جتنی کتابیں پڑھی تھیں ان میں نرس کا کردار مجھے بہت پسند آیا۔ بیماروں اور زخمیوں کی خدمت کرنے والی' دوسروں کے دکھ بانٹنے والی' اوروں کے اندوہ کم کر کے خوشی محسوس کرنے والی میں نے اپنی اس آرزو کا ذکر کئی بار اپنی ماں سے بھی کیا وہ ہمیشہ میری سوچ کی تائید کرتی تھی"

"پھر"

"پھر جنگ شروع ہو گئی۔ گریٹ وار" (جنگ عظیم؟

"وہ تو آپ کے شہر سے بہت دور تھی؟"

"ہاں شروع شروع میں جنگ کے شعلے ہمارے شہر سے بہت دور تھے۔ ہم صرف اخباروں میں پڑھتے تھے اور ریڈیو پر سنتے تھے کہ ہٹلر کی فوجیں مشرق کی طرف پھیل رہی ہیں۔ انہیں فتح پر فتح حاصل ہو رہی ہے۔ اتحادیوں کو شکست ہو رہی ہے اور وہ ہر جگہ پسپا ہو رہے ہیں۔"

"پھر کیا ہوا"

"پھر وہ ہوا جو نہیں ہونا چاہئے تھا۔ جو کبھی نہیں ہونا چاہئے"

آخری جملہ کہہ کر کرسٹی پہاڑوں کی چوٹیوں کی طرف دیکھنے لگی۔ فطرت نے غور سے اس کے چہرے کی طرف دیکھا' وہ پیلا پڑ چکا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔"

فطرت نے جذباتی انداز میں کرسٹی کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا "کیوں' کیا ہوا' کرسٹی ڈائیر کرسٹی Are you all right?" (تم ٹھیک تو ہو نا)

کرسٹی نے اپنے آپ پر قابو پایا اور فطرت کے اصرار پر بقیہ کہانی سناتے ہوئے کہا

"ہمارے گھر سے پہاڑ اسی طرح دکھائی دیتے تھے جیسے یہ پہاڑ نظر آ رہے ہیں۔ ہم اپنے گھر میں بیٹھ کر خوبصورت پہاڑوں کا نظارہ کرتے تھے۔ پہاڑوں کی سلسلوں کے بیچوں

بیچ تیرتے ہوئے بادلوں کو دیکھ کر لطف لیتے تھے۔ پھر ایک دن انہی پہاڑیوں سے گذرنے والی سڑک پر نازی آرمی کے ٹینک' ٹرک اور فوجی اتر آئے۔ وہ آگے بڑھے اور ہمارے شہر پر چھا گئے۔ کئی شہروں پر قبضہ کر لیا انہوں نے۔ میری سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ انہوں نے شہر میں ڈیرہ ڈال کر اس کے چپے چپے کو کھنگالنا شروع کیا۔ انہیں جہاں جہاں دشمن کے ہمدردوں یا اس کے ایجنٹوں کا شک ہوا' انہیں توپوں سے اڑا دیا۔ جس کسی نے مزاحمت کی اسے قتل کر دیا۔ اسی جنون میں وہ ہمارے گھر بھی آئے۔ میرے والدین کو قتل کر دیا۔ تو ڈیوڈ کو شوٹ کر دیا' رجرڈ جان بچانے کے لئے بھاگ گیا۔ مجھے نازی فوجی اٹھا کر لے گئے۔ میں اس وقت چودہ سال کی تھی۔ ابھی میری نسوانیت بھی نہیں جاگی تھی۔ ان درندوں نے مجھے ریپ(Rape) کرنا شروع کر دیا۔ پہلے میں درد سے چیخی چلاتی رہی۔ ان سے اپیل کرتی رہی لیکنمیری کسی نے نہ سنی۔ پھر میں بے ہوش ہو گئی۔ جب تک ان وحشتوں کا ہمارے شہر پر قبضہ رہا میں متواتر ان کی درندگی کا شکار ہوتی رہی"

"تم نے بھاگنے کی کوشش نہیں کی"

"کہاں بھاگتی۔ کدھر بھاگتی۔ وہاں کون تھا مجھے بچانے والا۔ ہر طرف فوجی ہی فوجی تھے۔ ہٹلر کے فوجی۔ جرمنی کے محب وطن فوجی انہوں نے ہمیشہ کے لئے میری نسوانیت نچوڑ لی۔ ہمیشہ کے لئے۔ اب اس واقعہ کو پندرہ بیس برس ہو گئے ہیں لیکن مجھی یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ واقعہ ابھی کل کا ہے۔ بالکل کل کا"

یہ درد ناک آپ بیتی سن کر فطرت کے تمام رومانی جذبات سرد پڑ گئے۔ اسے اپنے اندر اپنی مردانگی سلب ہوتی محسوس ہوئی۔

دونوں خاموش بیٹھے چشمے سے ابلنے والے پانی کو پتھر پر گرتے دیکھتے رہے۔ اتنے میں نواز اور مس ڈور تھی ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر ان کے تعاقب میں وہاں آ پہنچے۔ نواز نے دور ہی سے کہا:

"فطرت! ہو گئے فارغ"

"ہاں' نواز ہو گیا فارغ" اس نے سرد آہ کے ساتھ کہا۔

"ہم تو تمہیں لینے آئے ہیں۔ کافی دیر ہو گئی ہے تمہیں نکلے ہوئے۔ کرسٹی کے ساتھی

URDU4U.COM

پریشان ہونے لگے۔ ہم نے سوچا پڑی مشکلوں سے اس آزاد فضا کے ہاتھ میم آئی ہے

پتہ نہیں سفید چمڑی سے کب تک وہ عہد غلامی کا بدلہ لیتا رہے۔ چلو چل کر بے چاری

کو چھڑوا لائیں"

وہ چاروں کیمپ میں چلے گئے۔

اگلے روز فطرت نے اپنے دوستوں سے کہنا شروع کر دیا کہ اب ہمیں واپس چلنا چاہیے۔

تارڑ نے کہا "جی ہاں' تمہارا مشن تو پورا ہو گیا۔ کرسٹی بھی چلی گئی۔ اب تمہیں اس

وادی سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔"

فطرت نے مذاق کا جواب سنجیدگی سے دیا "نہیں یار' پچھلی تین راتوں سے متواتر مجھے ڈراؤنے

خواب نظر آ رہے ہیں۔ خون ہی خون۔ زمین پر پڑی ہوئی لاشیں۔ خون آلود لاشیں۔"

"اور پھر اس اطالوی چڑیل کے ساتھ سنسان وادیوں میں۔ وہ تو تمہارے اعصاب پر سوار

ہو گئی ہے" نواز نے فتویٰ دے دیا۔

بالا آخر فطرت کی بات مانی گئی اور وہ چترال' پشاور اور راولپنڈی میں ایک ایک رات

ٹھہرتے ہوئے واپس فیصل آباد آ گئے۔

بی اے اس کرنے کے بعد فطرت مزید تعلیم کے لئے فیصل آباد سے لاہور روانہ ہوا

تو اس کے پاس صرف دو اثاثے تھے۔ پیشہ ور آرٹسٹ بننے کا قابل شکست عزم اور دو

سو روپے کی رقم جو اس کی ماں نے ان گنت دعاؤں کے ساتھ اس کے حوالے کی

تھی۔ اس کے علاوہ اس کے پاس پرنسپل صاحب کی طرف سے اپنے دو دوستوں کے نام

علیحدہ علیحدہ تعارفی خط تھے جن میں فطرت کے لئے کسی جز وقتی کام کے لئے سفارش

کی گئی تھی۔

اعلیٰ مارکس کی وجہ سے فطرت کو ایم اے (فائن آرٹس) میں داخلہ لینے میں کوئی دقت پیش نہ آئی اور فوراً پنجاب یونیورسٹی سے ملحقہ ایک ہوسٹل میں جگہ بھی مل گئی۔ ان دو بنیادی کاموں سے فارغ ہونے کے بعد فطرت تیسرے بنیادی کام کی طرفم توجہ ہوا یعنی لاہور میں رہنے کے لئے ذریعہ معاش! وہ دونوں خط جیب میں ڈال کر پرنسپل صاحب کے دوستوں کی تلاش میں روانہ ہو گیا۔ ان میں سے ایک بزنس مین تھا جس کی کوٹھی کا پتہ ایبٹ روڈ کے حوالے سے تھا اور دوسرا لاہور کے ایک ممتاز اخبار کا ایڈیٹر تھا۔
چونکہ اخبار کا دفتر تلاش کرنا آسان تھا اس لئے فطرت پہلے وہیں گیا۔ اتفاق سے بزنسمین بھی ایڈیٹر کے پاس آیا ہوا تھا۔ غالباً وہ دونوں پرنسپل شبیر حسین شاہ کے مشترکہ دوست تھے اور آپس میں ملتے رہتے تھے۔
فطرت نے خط اندر بھجوایا اور خود باہر چپڑاسی کے بینچ پر بیٹھ کر انتظار کرنے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد اسے اندر بلوا لیا گیا۔ دونوں حضرات نے خندہ پیشانی سے اس کا استقبال کیا۔ پرنسپل شبیر شاہ سے اپنے دیرینہ تعلقات کا ذکر کیا۔ ان کی خیرت معلوم کی اور فطرت سے پوچھا کہ وہ کون سا کام کرنا چاہے گا"
"جو مل جائے" فطرت نے جواب دیا
"نہیں برخوردار' ایسی بات نہیں۔ بولو تو"
"جی۔ دراصل مجھے معلوم نہیں کہ کون کون سے کام دستیاب ہیں"
دونوں نے باری باری اسے بتانا شروع کیا' ایڈیٹر نے کہا "ایک کام تو ہمارے اخبار میں جونیئر سب ایڈیٹر کا ہے' چھ گھنٹے کی شفٹ ہوتی ہے۔ صبح ۹ بجے سے سہ پہر تک' دوسری تینبج سے رات ۹ بجے سے آخری کاپی مشین پر جانے تک"
بزنس مین نے کہا:
"میری فیکٹری میں پچھلے پہر کوٹ لکھپت آ جایا کرو۔ دن بھر کا حساب کتاب جوڑنے پر تمہیں سو روپیہ ماہوار مل جائے گا۔ اگر ٹائپ کرنا بھی سیکھ لو تو ڈیڑھ سو روپے ماہوار"
فطرت دونوں پیشکش سن کر خاموش ہو گیا۔ ایک طرف اخبار میں چھ گھنٹے کی شفٹ

نبھانا مشکل تھا اور دوسری طرف لاہور سے باہر کوٹ لکھپت جانا اور واپس آنا ناممکن نظر آ رہا تھا۔ اسے گہری سوچ میں دیکھ کر بزنس مین بٹ نے کہا:

URDU4U.COM

"کیوں برخوردار' ان میں سے کوئی نوکری پسند نہیں؟"

فطرت خاموش رہا' وہ کسی نوکر کو ٹھکرا کر اپنا مستقبل خطرے میں ڈالنا نہیں چاہتا تھا' امین صاحب نے اس کی مشکل کا اندازہ کرتے ہوئے کہا:

"اگر کوٹ لکھپت پہنچنا تمہارے لئے مشکل ہے تو ایبٹ روڈ پر میرے گھر آ جایا کرو۔ دو بچوں کو پڑھا دیا کرو اور تمہیں مہینے کا خرچ مل جایا کرے گا۔ پروفیسر شبیر صاحب نے لکھا ہے کہ تمہاری ماہور ضرورت سو روپے کے لگ بھگ ہو گی۔"

"جی ٹھیک ہے"

"تو جب چاہو' ٹیوشن شروع کر دو۔ چاہو' تو کل ہی آ جاؤ۔ یہ ہے میرا کارڈ"

فطرت نے کارڈ پر نام اور ایڈریس غور سے پڑھا اور اگلے روز پانچ بجے شام سے آنے کا وعدہ کر لیا۔

جس ہوسٹل میں فطرت کو جگہ ملی وہ غریب اور متوسط درجے کا تھا۔ اس میں رہنے والے طلبا دیہات یا شہر کے غریب حصوں سے تعلق رکھتے تھے اور ہوسٹل میں تہبند' شلوار یا پاجامہ پہن کر گزارہ کیا کرتے تھے۔ وہاں سلیپنگ سوٹ' ڈریسنگ گاؤن یا اعلی طبقے سے منسوب دوسری فروعات کا دخل نہ تھا۔ پورے ہوسٹل کے لئے بیس بیت الخلا اور تیس غسل خانے تھے اور وہ بھی بالکل دیسی وضع کے۔ بیت الخلا میں فلش سسٹم اسی سال لگایا گیا تھاس اور اسے استعمال کرنے کے لئے "ہدایات" لکھ کر لگا دی گئی تھی۔ مثلاً فلش میں روڑے' اینٹیں یا نہ گلنے والی دوسری چیزیں نہ پھینکیں" اور "بیت الخلاء سے نکلنے سے پہلے فلش کا ہینڈل ضرور کھینچ کر جائیں" وغیرہ۔

ہوسٹل کا ایک مستطیل شکل کی عمارت میں واقع تھا جس کے منہ پر لوہے کا ایک بہت بڑا گیٹ لگا ہوا تھا۔ یہ گیٹ اکثر بند رہتا تھا اور روزانہ کی آمدو رفت کے لئے اس بڑے گیٹ کے اندر ایک چھوٹا گیٹ تھا جس سے سر جھکا کر گزرنا پڑتا تھا۔ گیٹ کے

اندر کی جانب چوکیدار کی چارپائی اور سٹول پڑا رہتا تھا۔ سردیوں میں اس چارپائی پر چوکیدار کا غلیظ بستر سارا دن بچھا رہتا تھا۔

ہوسٹل کا کچن سادہ سا تھا۔ جس میں ہفتے میں تین دفعہ گوشت پکتا تھا اور باقی دنوں میں دال یا سبزی۔ چھٹی کے دن مرغی کا سالن ایک ضیافت سمجھی جاتی تھی۔ ماہوار خرچ پچاس اور ساٹھ روپے کے درمیان آتا تھا۔

جگہ کی کمی کی وجہ سے فرسٹ ایئر' تھرڈ ایئر اور ففتھ ائیر کے طلباء کو علحٰدہ کمرے نہیں ملتے تھے۔ فرسٹ ائیر کے چار چار لڑکے ایک ایک ڈارمٹری میں رہتے تھے اور فائنل ائیر کے طلباء کے پاس الگ الگ کمرے (Cubicle) تھے دوسرے طلباء ایک ایک کمرے میں دو دو تھے۔ فطرت کا روم میٹ محمود تھا جو سرگودھا سے بی۔ اے پاس کرنے کے بعد پولٹیکل سائنس میں ایم اے کرنے آیا تھا۔ کمرے کا کل سامان دو چارپائیاں ایک مشترکہ میز اور کھانے کی دو کرسیاں تھیں۔ چونکہ میز پر کتابوں' کاپیوں اور دوسری چیزوں کا انبار لگا رہتا تھا اس لئے کرسی کو بھی کبھی میز کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا جس کا بڑا ثبوت یہ تھا ایک کرسی کا بید درمیان سے جلا ہوا تھا جہاں کسی نے سالن کی تپتی ہوئی پلیٹ رکھ دی تھی۔

فائن آرٹس ڈیپارٹمنٹ مال روڈ پر واقع پنجاب یونیورسٹی کے جنوب مشرقی کونے میں تھا۔ شعبہ معاشیات اور شعبہ اسلامیات کے درمیان' اس ڈیپارٹمنٹ کی سربراہ ایک بارعب خاتون مسزنادرہ شیخ تھیں جو اپنے بھاری بھرکم جثے اور اتنے ہی بارعب ڈنڈے (کھونڈے) کے لئے مشہور تھیں۔ جسے وہ اکثر ساتھ ساتھ اٹھائے پھرتی تھیں اور Walking Stick (چھڑی) کے طور پر اسعمال کرتی تھیں لیکن طلبا و طالبات میں یہ مشہور تھا کہ یہ ڈنڈا دراصل کوتوال کی لاٹھی ہے جس کے ذریعے وہ اپنے ڈیپارٹمنٹ کا ڈسپلن قائم رکھتی ہے۔ کسی نے آج تک اسے یہ ڈنڈا استعمال کرتے نہیں دیکھا تھا لیکن دنیا میں کچھ چیزیں ایسی بھیہ وتی ہیں جو استعمال کے بغیر ہی اپنا اثر دکھاتی رہتی ہیں۔ "مولا بخش" انہی میں سے ایک تھا۔

مسز نادرہ شیخ کے نائبین میں چار استاد شامل تھے۔ پروفیسر افتخار جو مسز نادرہ شیخ کے بعد سب سے سینئر تھے اور ڈیپارٹمنٹ میں عموماً نمبر ۲ سمجھے جاتی تھے۔ ان نے بعد پروفیسر ڈین' پروفیسر سعید اور پروفیسر سعید اور پروفیسر مس نزہت تھیں۔ موخرالذکرتینوں استاد عہدے کے لحاظ سے لیکچرار تھے لیکن طلبا اور طالبات انہیں پروفیسر ہی کہتے تھے۔

اس سال فطرت کے ساتھ کل ۲۳ طالب علموں نے ایم اے (فائن آرٹس) کے پہلے سال میں داخلہ لیا۔ دس لڑکے اور تیرہ لڑکیوں نے' دو لڑکیاں پچھلے سال کی ففتھ ائیر کلاس سے فیل ہو کر ان کے ساتھ شامل ہو گئیں اور یوں کل تعداد پچیس ہو گئی۔

پہلے دن پروفیسر افتخار نے ساری کلاس کو اکٹھا کر کے عمومی قسم کا لیکچر دیا۔ انہوں نے کہا:

"آپ نے فائن آرٹس میں داخلہ لے کر اپنی زندگی کا اہم ترین فیصلہ کیا ہے۔ یہ فیصلہ صرف مضمون کے انتخاب کی حد تک نہیں۔ یہ درحقیقت زندگی کی راہ متعین کرنے کا فیصلہ ہے۔ میں نہیں جانتا کہ آپ میں سے کس کس نے کس وجہ سے یہ مضمون اپنایا ہے لیکن میں تجربے کی روشنی میں آپ کو بتا سکتا ہوں کہ آپ نے پھولوں کی سیج کا نہیں کانٹوں کے ہار کا انتخاب کیا ہے۔ آپ کو یونیورسٹی میں جو خوشگوار اور خوبصورت ماحول نظر آ رہا ہے۔ یہ دو سال کے بعد آپ کو میسر نہیں رہے گا۔ اس کے بعد آپ میسر نہیں رہے گا۔ اس کے بعد آپ کو زندگی کی حقیقتوں کی طرف پلٹنا ہو گا جو تلخ بھی ہیں اور طویل بھی۔ فن کی دنیا میں افسری نہیں' دنیوی ٹھاٹھ نہیں' رعب نہیں' دبدبہ نہیں' آرام نہیں' آسائشیں نہیں' فن کی زندگی غم کھانے اور خون جگر پینے کی زندگی ہے۔ آپ کینوس پرپینٹنگ کرتے وقت رنگ نہیں خون دل بکھیرتے ہیں۔ پھر کہیں فن پارہ چمکتا ہے۔ میں شروع میں ان مشکلوں سے آپ کو آگاہ کرنا چاہتا ہوں جو ہمارے معاشرے میں آرٹسٹ کام قدر بن چکی ہیں۔ للٰذا آپ ایک بار پھر سوچ لیجئے اور اگر آپ کے اندر دل کے کسی گوشے میں۔ افسرانہ وجاہت' امیرانہ ٹھاٹھ اور

دنیوی آرام و آسائش کی خواہش دبی بیٹھی ہے تو اب بھی یہ ڈیپارٹمنٹ چھوڑ دیجئے۔ کسی اور مضمون کا انتخاب کر لیجئے۔ جسمیں ایم اے کرنے کے بعد آپ مقابلے کے امتحان میں اچھے نمبر لے سکیں۔ سی ایس پی بن سکیں۔ سی ایس پی نہ سہی تو کسی بھی مرکزی سروس میں چلے جائیں۔ کم از کم آرٹسٹ کی نسبت آپ کی زندگی آرام سے گزر جائے گی۔ !Any question" (کوئی سوال)

بھرے بھرے جسم والا ایک شخص کلاس کے درمیان کھڑا ہو گیا۔ اس نے کہا "کیا آپ اپنے آپکو اس شعبے سے وابستہ کر کے پچھتا رہے ہیں؟"

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ لیکن میرے سامنے سینکڑوں ایسی مثالیں موجود ہیں کہ کئی لڑکیاں اور لڑکے بڑے شوق سے اس شعبہ میں آئے۔ ایم اے کیا۔ چند سال برش اور کینوس گھسائے اور Frustrate (شکست خوردہ) ہو کر کہیں چلے گئے۔ انہوں نے اپنا وقت بھی ضائع کیا اور دوسروں کا بھی؟Any more questions" (کوئی اور سوال؟)

ایک دبلا پتلا لڑکا کھڑا ہوا اور لڑکیوں کی طرف ایک طائرانہ نگاہ ڈال کر کہنے لگا "سر' آپ کے خیال میں لڑکیاں اچھی آرٹسٹ ہوتی ہیں یا لڑکے"

پروفیسر افتخار شرارت کو بھانپ گئے انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا

"ادھر اکٹھے ہی ہیں اگلے دو سال کے لئے' فیصلہ کر لیں گے' جلدی بھی کیا ہے۔"

اس کے بعد پروفیسر افتخار نے مزید سوالات کی دعوت دی لیکن کسی نے کوئی سوال نہ پوچھا۔ پھر باری باری تعارف کرانے کو کہا گیا۔ ہر کسی نے اپنا نام' اپنے پرانے کالج کا نام اور بی۔ اے کے مارکس بتائے اور بیٹھ گیا۔

پہلا دن انہی باتوں کی نذر ہو گیا۔

فطرت اپنے ہم جماعتوں کے ساتھ کلاس روم میں بیٹھا پروفیسر افتخار کا لیکچر سن رہا تھا۔ وہ "ہسٹری آف آرٹ" پڑھاتے ہوئے فرما رہے تھے۔

"سہولت کی خاطر آپ آرٹ کی تاریخ کو تین حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ قدیم دور'

وسطی دور اور جدید دور! قدیم دور میں آرٹ کی جو ترقی ہوئی اسے آرٹ کی تکنیک یا مکتبہ فکر کے لحاظ سے نہیں بلکہ ان علاقوں کی نسبت سے پہچانا جاتا ہے جہاں یہ ترقی رو پذیر ہوئی مثلاً مصری آرٹ' ہندوستانی آرٹ' چینی اور جاپانی آرٹ۔

URDU4U.COM

وسطی دور کے آرٹ کی امتیازی خصوصیت مذہب سے اس کا گہرا لگاؤ ہے۔ اس دور میں آرٹ کی وجہ شناخت جغرافیائی علاقے نہیں بلکہ مسلمہ مذاہب ہیں۔ اسی دور میں ہمیں بدھ آرٹ اور عیسائی آرٹ کا عروج نظر آتا ہے جبکہ جدید دور ہمیں مغرب کی طرف لے جاتا ہے۔ جہاں احیائے فنون کی نئی تحریکیں چلیں اور انہیں تحریکوں کے حوالے سے مختلف مکتبہ ہائے فکر وجود میں آئے۔ آپ آگے چل کر فرانس' اٹلی اور سپین وغیرہ میں Imppost-Impressionism اورIressionism کے متعلق پڑھیں گے"

پروفیسر افتخار کا یہ عالمانہ لیکچر پینتالیس منٹ جاری رہا۔ ان کا مکمل پیریڈ ایک گھنٹے کا ہوتا تھا لیکن وہ آخری پندرہ منٹ طلباء و طالبات کے سوالات کے لئے وقف کر دیتے تھے۔ تاکہ ان کے لیکچر کے بارے میں اگر کسی کو شک و شبہ رہ جائے یا کوئی طالبعلم کسی نکتے کی وضاحت چاہے تو اسے مطمئن کیا جا سکے۔

پروفیسر افتخار نے سوالات کی دعوت دی تو سب سے پہلے منیر کھڑا ہوا۔ اس نے تینوں ادوار کے چیدہ چیدہ آرٹسٹوں کے نام پوچھے اور پروفیسر افتخار کے جواب کے مطابق اپنی نوٹ بک میں درج کر لئے۔ اس کے بعد فطرت نے کہا:

"سر' آپ نے آرٹ کی تاریخ کا جو جائزہ پیش کیا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ آرٹ کی ترقی کا رخ مشرق سے مغرب کی طرف رہا ہے یعنی قدیم اور وسطی دور میں اہل مغرب فنون لطیفہ کی دنیا میں بہت پیچھے تھے۔ اب کیا وجہ ہے کہ مشرق فنون لطیفہ کے میدان میں مغرب سے پیچھے رہ گیا ہے؟"

پروفیسر افتخار نے کہا۔

"بہت اچھا سوال ہے۔ آپ چاہیں تو اسے فنون لطیفہ تک محدود رکھنے کی بجائے تمام علوم و فنون تک پھیلا سکتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ پہلے مشرق کو مغرب پر فوقیت تھی اب

مغرب کو مشرق پر برتری حاصل ہے۔"
"مگر کیوں" فطرت نے اصرار کیا
"آپ نے مغربی مفکر اور تاریخ دان ٹوائن بی کا نام ضرور سنا ہو گا وہ کہتا ہے کہ ساری تاریخ ایک دائرے کی شکل میں گھومتی ہے۔ کچھ ملک اور جغرافیائی حصے ایک دور میں دائرے کی اوپر والی سطح پر ہوتے ہیں اور کچھ نیچے والی سطح پر۔ پھر اس گردش کی وجہ سے نچلا حصہ اوپر چلا جاتا ہے اور اوپر والا نیچے آ جاتا ہے"
"تو کیا اس میں انسانی کوشش کا کوئی دخل نہیں ہوتا' یہ سب کچھ نظام قدرت کے تحت اوپر نیچے ہوتا رہتا ہے؟"
"نہیں ایسا نہیں' اس دائرے کو گردش میں رکھنے والی چیز انسانی محنت ہی ہے۔ آپ اسے گول پہیہ سمجھ لیجئے۔ جس طرف سے اس پر کوشش' محنت' علم اور تحقیق کا دباؤ پڑے گا اسی کے مطابق پہیہ گھومنے لگے گا۔ آگے کی طرف یا پیچھے کی طرف"
فطرت بیٹھ گیا تو مس زوبی (اصل نام زبیدہ) اٹھ کھڑی ہوئی۔
"سر' میرا سوال بہت سادہ ہے اور وہ یہ کہ عورتیں صرف دور جدید میں فائن آرٹس کے شعبے میں آئی ہیں یا اس سے پہلے بھی آرٹ کے فروغ میں ان کا کچھ Contribution (حصہ) رہا ہے"
"سچی بات یہ ہے کہ قدیم اور وسطی دور میں خواتین زیادہ نظر نہیں آتیں (مسکرا کر) اس کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ آپ کے لئے Competition (مقابلہ) بہت کم ہے"
فطرت ایک بار پھر اجازت لے کر بولا۔
"سر' میرے خیال میں فائن آرٹس ہی نہیں' کسی بھی تخلیقی عمل کو مردانہ اور زنانہ حصوں میں بانٹ کر ان کا مقابلہ نہیں کرنا چاہئے مثلاً آپ انگلش لٹریچر کو ہی لیجئے۔ آپ چارلس ڈکنز اور تھامس ہارڈی کو ایک پلڑے میں رکھ کر جین آسٹن اور برونٹی سسٹرز سے مقابلہ نہیں کر سکتے۔ ایسا موازنہ Unfair (غیر منصفانہ) ہو گا۔"
"میں آپ سے اتفاق کرتا ہوں" پروفیسر افتخار نے کہا۔

پروفیسر سعید بصری فنون پڑھاتے تھے۔ انہوں نے کلاس میں آتے ہی فطرت کو پہلی صف میں بیٹھ دیکھ کر کہا:

"آپ اپنے سوالوں سے پوری طرح لیس ہیں' نا"

URDU4U.COM

"یس سر"

"تو اپنے ترکش کو سنبھال کر رکھئے۔ پہلے مجھے اپنے لیکچر دینے دیجئے پھر آپ کے سوالات کو دیکھتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔ آپ کہتے ہیں تو لیکچر کے بعد بھی سوال نہیں پوچھوں گا"

"نہیں نہیں' ایسی بات نہیں۔ میں تو آپ کو آپ کے تیکھے سوالوں کی ہی وجہ سے پسند کرتا ہوں Dont be disheartened" (دل نہ چھوڑیئے)

"ٹھیک ہے۔ سر"

پروفیسر سعید نے اپنا لیکچر شروع کرتے ہوئے کہا۔

"جیسا کہ میں آپ کو پچھلے لیکچر میں بتا چکا ہوں سولہویں صدی عیسوی بصری فنون کے فروغ میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے اس سلسلے کا ایک اہم واقعہ بلکہ ایک انقلابی قدم کیمرہ کی ایجاد ہے جو ہر شے کی معروضی طور پر اتنی اچھی عکاسی کرتا ہے کہ اصل اور نقل میں فرق مٹ جاتا ہے لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ کیمرے کی ایجاد کے باوجود نقاش قدرت مصور ختم نہیں ہوئے۔ انہوں نے سائنس کے چیلنج کو قبول کیا اور اپنا سفر جاری رکھا"

تاریخی پس منظر بیان کرنے پر پروفیسر سعید نے خاصا وقت صرف کیا' پھر وہ فنون لطیفہ کے عملی پہلو کی طرف آئے اور انہوں نے فرمایا۔

ج"جس طرح فن تعمیر Silid اورVoid کے امتزاج پر اور فوٹو گرافی لائٹ اور شیڈ کے باہمی ربط پر قائم ہے۔ اسی طرح پینٹنگ کے بنیادی اجزا تین C's ہیں یعنی and circles Cones.cubes لیکن جس طرح محص لائٹ اور شیڈ کو یکجا کرنے سے اچھی تصویر

نہیں بنتی یا صرف خوبصورت الفاظ کو ایک ترتیب میں رکھ دینے سے عظیم شاعری تخلیق نہیں ہوتی۔ اسی طرح محض Cones.cubes and circles کے ہیر پھیر سے اچھی پینٹنگ بنتی۔ کیمرے اور آرٹسٹ میں بنیادی فرق یہی ہے کہ آرٹسٹ کا اپنا دل اور دماغ ہوتا ہے جبکہ کیمرہ بے جان اور میکینکل ہوتا ہے"

URDU4U.COM

پروفیسر سعید اپنا لیکچر مکمل کر چکے تو انہوں نے سوالات کی دعوت دی۔ سب سے پہلے عاصم نے زور زور سے ہاتھ ہلانا شروع کیا۔ پروفیسر صاحب نے اسے سوال پوچھنے کی اجازت دی۔ اس نے کہا

"سر، کیا کیمرے کی کھینچی ہوئی تصویر آرٹ میں شمار نہیں ہوتی"

"ہوتی ہے۔ اب ہونے لگی ہے لیکن یہ بھی تخلیق آرٹ کی سطح پر نہیں آئی۔ یہ پینٹنگ کی جگہ نہیں لے سکتی اور نہ ہی لے سکے گی"

اتنے میں فطرت کھڑا ہو گیا

"سر، کیمرے کی عکس بندی اور آرٹسٹ کی بنائی ہوئی Representational Picture میں اصولی فرق کیا ہوتا ہے؟

پروفیسر سعید نے کہا۔

"بہت Intelligent (عاقلانہ) سوال ہے۔ میں خود اس طرف آنا چاہتا تھا لیکن وقت کم تھا اس لئے اس موضوع پر روشنی نہ ڈال سکا' دراصل کیمرہ انسان کا حریف نہیں بن سکتا۔ جس طرح (نعوذ باللہ) انسان اللہ تعالٰی کا حریف نہیں بن سکتا۔ ایک خالق ہے دوسرا مخلوق۔ کیمرہ زیادہ سے زیادہ کسی Object (اظہار) نہیں کر سکتا۔ کیونکہ کیمرے کے اپنے احساسات نہیں ہوتے اس لئے وہ دوسرے کے ہاتھوں میں دوسرے کے زاویہ نگاہ کے مطابق کسی شے کی عکس بندی تو کر سکتا ہے لیکن وہ احساسات نہیں ڈال سکتا جو ایک حساس آرٹسٹ ہی کر سکتا ہے آپ آگے چل کر پڑھیں گے کہ فن کی دنیا میں ایک Super-Impressionist Stage بھی آتی ہے جب آرٹسٹ کسی بھی مادی شے

 © Urdu4U.com

کا محتاج نہیں رہتا جبکہ کیمرہ ہمیشہ Object کا محتاج رہتا ہے۔"
فطرت نے پروفیسر سعید کی اجازت سے موضوع سے ہٹ کر ایک ضمنی سوال کر دیا: "جب
URDU4U.COM
آرٹسٹ Object کا محتاج نہیں رہتا تو کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ وہ سچائی کو وجدانی کیفیت میں دیکھتا ہے۔"
"فطرت' شاید آپ کو معلوم نہیں کہ حقیقت تو Object کے ذریعے دیکھی جا سکتی ہے لیکن سچائی کا ادراک صرف وجدانی کیفیت میں ممکن ہوتا ہے"

مس نزہت موڈرن آرٹس پڑھاتی تھی اور پینٹنگ کی عملی تربیت بھی دیتی تھی۔ وہ دوسرے استادوں کی طرح سٹیج پر آنے کی بجائے کلاس کے سامنے فرش پر کھڑی ہو جاتی تھی۔ جو باتیں مشترکہ طور پر ساری کلاس سے کہنا ہوتی تھیں وہ سامنے کھڑی ہو کر کہہ دیتی تھی اور ضرورت پڑھنے پر کسی اسکیچ' ایچنگ یا ڈرائنگ پر کام کرنے والے لڑکے یا لڑکی کے پاس بھی جا کھڑی ہوتی تھی۔
اس نے کلاس کے سامنے کھڑے ہو کر لیکچر دینا شروع کیا:
"آج ہم پچھلے سبق کو ذرا آگے بڑھائیں گے اور لائن' کلر اور پوز کے بارے میں بات کریں گے۔ جیسا کہ میں اپنے ابتدائی لیکچروں میں بتا چکی ہوں آرٹسٹ کی کھینچی ہوئی لان بے جان لکیر نہیں ہوتی۔ درحقیقت ہر لائن ان گنت نقطوں سے مل کر بنتی ہے اور ہر نقطعہ اپنی جگہ ایک کائنات ہوتا ہے۔ آپ لائن عمودی بھی کھینچ سکتے ہیں اور افقی بھی۔ لیکن ترچھی لائن عمودی اور افقی لکیروں کی نسبت زیادہ متحرک اور جاندار ہوتی ہے اور یہ بھی یاد رکھئے کہ لائن محض لائن نہیں ہوتی یہ موڈ ظاہر کرنے میں بھی اہم کردار ادا کرتی ہے۔ مثلاً پتلی لکیر نفاست اور تیکھے پن کی علامت ہو گی یہ لائن جتنی لمبی ہو گی اتنی ہی نفیس اور دلکش لگے گی موٹی لکیر کا تاثر جارحانہ ہو گا اور بہت چوڑی لکیر سیاہ پٹی بن کر ماتم کی علامت بن جائے گی۔ اسی طرح کلر کی اپنی

اہمیت ہے۔ کلر لائن سے Emotional (جذباتی) ہوتا ہے لیکن ایک اچھا آرٹسٹ کلر کو لائن کی جگہ اور لائن کو کلر کی جگہ استعمال کر سکتا ہے۔ بلکہ دونوں کے باہمی امتزاج سے ایک نیا تاثر پیدا کر سکتا ہے۔ لائن کی طرح کلر بھی موڈی عکاسی کرتا ہے اور مختلف آرٹسٹوں نے مختلف رنگوں کو مختلف موڈز (Moods) کی علامت کے طور پر استعمال کیا ہے بلکہ ایک ہی رنگ کو پتلا یا گہرا کر کے نئے نئے تاثرات پیدا کئے ہیں۔ موخرالذ کر کی ایک اچھی مثال پکاسو کی بلیو پیریڈ(Blue Period) یا روز پیریڈ(Rose Period) کی تصویریں ہیں کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ایک ہی تصویر میں رنگ گہرے یا ہلکے کرنے سے تصویر کے اثرات بدلے جا سکتے ہیں۔

"تیسرا اہم موضوع ہے پوز جو انسان کی اندرونی کیفیت کا اظہار کرتا ہے مثلاً طمانیت سے سرشار ماں کا پوز کچھ اور ہو گا اور ایک جج' بادشاہ یا سپہ سالار کا پوز کچھ اور ہو گا۔ یہی حال نیوڈ کا ہے۔ ہر نیوڈ ہیجان خیز نہیں ہوتا مثلاً اپالویا St. Sabastian کا نیوڈ۔ نیوڈ مجذوب بھی ہو سکتا ہے اور قلاش محض بھی جس کے پاس پہننے کو کپڑا نہیں"

کلاس میں سے کسی شرارتی لڑکے کی آواز آئی "محبت کے پوز کے بارے میں کیا خیال ہے"

"محبت کے واز بھی بڑے مقدس ہو سکتے ہیں مثلاً حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھیڑ کے میمنوں کے ساتھ' ماں اپنے بچے کے ساتھ۔ خالق اپنی تخلیق کے ساتھ"

لیکچر ختم ہوا تو سوالوں کے خواہشمند لڑکوں اور لڑکیوں نے ایک ایک ہاتھ اٹھا دیا مس نزہت اریب اری انہیں موقع دینے لگی۔

مس آشا نے کہا "کیا نیوڈیکچر فحاشی کے زمرے میں نہیں آتی"

پروفیسر نزہت نے جواب دیا "ہرگز نہیں' فحاشی تصویر میں نہیں' دیکھنے والے کے ذہن میں ہوتی ہے۔ لکڑی کا ایک بے جان ٹکڑایا لکڑی میں پڑا ہوا مخروطی شگاف جنس زدہ تماشائی کے لئے جنس لذت کا باعث ہو سکتا ہے لیکن معروضی لحاظ سے اس کا فحاشی کے ساتھ کوئی تعلق نہیں بنتا"

فطرت نے کہا

"میڈم۔ اگر میں ایک ایسی عورت کی تصویر بناؤں جو ابھی ایک تلخ تجربے سے گزری ہے۔ غنڈے اس کے زیور نوچ کر اور اس کی عصمت تباہ کر گئے ہیں اور وہ نیم برہنہ بے ہوش پڑی ہے تو کیا میری یہ تصویر فحاشی کی بنا پر تنقید کا نشانہ نہیں بنے گی"

"میرے خیال میں تو اس پر تنقید کرنے یا اس کی مذمت کرنے کا کوئی جواز نہیں بشرطیکہ تصویر فنی لحاظ سے پختہ ہو"

"لیکن اگر میری اور آپ کی رائے کے برعکس کوئی شخص اسے فحش تصویر قرار دے کر میرے خلاف مقدمہ دائر کر دے تو آیا عدالت اس تصویر کے خالق کو تحفظ دے سکے گی؟"

"میرے خیال میں تو وہ ضرور دے گی۔"

"اور اگر عدالت نے دلائل سے مغلوب ہو کر آرٹسٹ کو دس سال قید با مشقت سنا دی تو"

"نہیں فطرت' زمانہ اتنا ظالم نہیں ہے۔ فن کے پرستار ہر جگہ اور ہر ملک میں پائے جاتے ہیں۔ آپ تصویریں بنائیے۔ فنی لحاظ سے پختہ بنائیے آپ کو کوئی قید با مشقت یا قید بے مشقت نہیں دے گا"

فطرت کے بعد اشتیاق سے سوال پوچھا

"کیا تصویر میں عنوان یا Captian کی بھی کوئی اہمیت ہوتی ہے"

"سچ پوچھیے تو اچھی تصویر عنوان یا کیپشن کی محتاج نہیں ہوتی۔ پرانے زمانے میں تصویروں پر عنوان نہیں ہوا کرتے تھے۔ لیکن پچھلے دو تین سو سالوں میں جب تصویریں بکنے لگیں تو مصوروں نے خریداروں کی سہولت کے لئے تصویر کے Captian دینا شروع کر دیئے بلکہ بعض مصور تو عنوان کے ساتھ تصویر کی مختصر Description (وضاحت) بھی دینے لگے ہیں جو میرے خیال میں فن پارے کی ہتک ہے۔ ایک اچھی تصویر اپنا تعارف خود ہوتی ہے۔"

"تھینک یو' مس"

یہ کلاس ایک گھنٹہ کی بجائے کہیں ڈیڑھ گھنٹے میں جا کر ختم ہوئی اور وقفے (Break) کا وقت بھی اسی بحث کی نذر ہو گیا۔

URDU4U.COM

پڑھائی میں نمایاں کارکردگی' مطالعہ کی وسعت اور اپنے مخلصانہ رویئے کی وجہ سے فطرت اپنے ہم جماعتوں میں بہت مقبول تھا' جو لڑکے اس کے دائرہ دستی میں شامل ہوئے ان میں منیر' اشتیاق' یعقوب اور عاصم خاص طور پر قابل ذکر ہیں جبکہ لڑکوں میں زوبی (زبیدہ) فرحی (فرحت) اور (عائشہ) نے اس کی طرف خصوصی توجہ دی' فطرت کے ان دوستوں میں زیادہ تر وہ لڑکیاں اور لڑکے تھے جو باہر سے تشریف لائے تھے لیکن یعقوب اور زوبی لاہور ہی کے رہنے والے تھے اور دونوں امیر گھرانوں سے تعلق رکھتے تھے۔ یعقوب کے والد حاجی عبداللطیف میکوڈ روڈ پر واقع ایک سینما گھر کے مالک تھے جبکہ زوبی گلبرک کے ایک امیر گھرانے کی بگڑی ہوئی امیر زادی تھی جو یونیورسٹی میں کسی لمبے منصوبے کے تحت داخل ہوئی تھی اور ایم اے پاس کرنے کا کوئی ارادہ نہ رکھتی تھی اس کے والد اکثر بزنس کے سلسلے میں بیرون ملک رہتے تھے اور اس کے جوان بھائیوں کی اپنی دلچسپیاں تھیں جن میں زوبی جیسی منہ پھٹ بن فٹ نہیں ہوتی تھی' زوبی کی والدہ اگرچہ زندہ تھی لیکن ہائی بلڈ پریشر اور عارضہ قلب کی مریضہ ہونے کی وجہ سے عملی زندگی میں کوئی اہم کردار ادا نہیں کر رہی تھی۔

زوبی کے گھر میں ایک سے زیادہ کاریں تھیں جن میں سے ایک زوبی کے پاس تھی اپنے ڈیڈی کی چہیتی ہونے کی وجہ سے وہ عموماً نئے ماڈل کی کار چلاتی پھرتی تھی اور پچھلے دو تین سالوں سے اسی کار پر یونیورسٹی آیا کرتی تھی۔ پہلے اس نے پولیٹیکل سائنس ڈیپارٹمنٹ میں داخلہ لیا تھا لیکن دو سال بعد اسے بھاری پتھر سمجھ کر چھوڑ دیا تھا پچھلے دو سالوں سے وہ فائن آرٹس ڈیپارٹمنٹ میں تھی اور نئے لڑکوں پر ڈورے ڈالنے کی تاک میں

 © Urdu4U.com

رہتی تھی۔
زوبی شہری لڑکوں سے زخم خوردہ تھی وہ انہیں چالاک' مکار اور عیار لگتے تھے جو شروع شروع میں بھنوروں کی طرح اس کے گرد طواف کرتے پھر اس کے رنگ و بو سے محفوظ ہوتے اور شادی کے جال میں آنے سے پہلے پھر سے اڑ جاتے اور اس پس منظر میں زوبی کو فطرت میں ایک مخلص اور سادہ فلوح شکار نظر آیا جو ذہین بھی تھا اور دیکھنے میں پرکشش بھی' فطرت کا قد تو شروع ہی سے لمبا تھا لیکن ایم اے تک پہنچتے پہنچتے اس کا جسم کچھ کچھ بھر بھی گیا تھا وہ کسی بھی پیمانے سے فربہ نہیں تھا اور نہ ہی کھمبے کی طرح پتلا اور خشک بلکہ اس کے بھرے بھرے جسم میں وہ ساری طراوت موجود تھی جو زوبی جیسی لڑکیوں کو اپنی طرف کھینچ سکتی تھی۔
فطرت کا چہرہ بھی بہت دلکش تھا اس کی بھوری مونچھیں جو خاصی گھنی ہو گئی تھیں اس کے اوپر والے ہونٹ پر ہر وقت سایہ کئے رہتی تھی بھوری مونچھوں اور بھوری آنکھوں کے درمیان اس کی ستواں ناک اور سرخ سپید گال اپنی جگہ بڑے جاذب لگتے تھے جب وہ مسکراتا تھا تو اس کا منہ بند رہتا تھا لیکن آنکھیں اور ہونٹ کھلکھلا اٹھتے تھے اس کے سر کے بال لمبے تھے اور اکثر پیشانی پر لہراتے رہتے تھے لیکن اس نے کبھی ان پر کوئی کریم یا تیل استعمال نہیں کرتا تھا جس کی وجہ سے وہ ایک جگہ بیٹھنے کی بجائے اس کی پیشانی پر ناچتے رہتے تھے اور فطرت انہیں ہاتھ سے پیچھے ہٹاتا رہتا تھا جیسے بعض خواتین کی ساڑھی کا پلو بار بار سینے سے سرک جاتا ہے اور اسے دوبارہ سینے پر اس طرح پھیلا دیتی ہیں کہ وہ زیادہ دیر وہاں ٹھہر نہیں سکتا فرق صرف یہ تھا کہ خواتین سرکتے ہوئے پلو کو خاص جگہ پر پھیلانے کی کوشش کرتی ہیں اور فطرت پھسلتے ہوئے بالوں کو ہٹا کر اپنی جگہ پر پہنچا دیتا تھا۔
کلاسیں شروع ہوئے بمشکل مہینہ ڈیڑھ مہینہ ہوا تھا کہ زوبی نے فطرت کو لائبریری سے پکڑا اور اپنے ساتھ باہر لے آئی فطرت نے عزائم پوچھے تو وہ کہنے لگی "پہلے میرے

ساتھ آیئے پھر بتاؤں گی"

وہ اس کے ساتھ اس کی کار کے پاس آ گیا۔

"بیٹھیے" زوبی نے تقریباً حکم کے انداز میں کہا۔

فطرت دروازہ کھول کر پچھلی نشست پر بیٹھنے لگا تو زوبی نے اس کی کلائی پکڑ کر اپنے ساتھ بٹھا لیا اور آہستہ سے کہا: فطرت دی آرٹسٹ اتنے دقیانوسی نہ بنو۔ فطرت جو پہلے ہی نسرین اور فرح کا زخم خوردہ تھا زوبی کی حوصلہ افزائی کے باوجود سمٹا سمٹا رہا وہ اپنے چھلنی دل میں کوئی اور سوراخ سہنا نہ چاہتا تھا لیکن جس ماحول اور موڈ میں زوبی سے کھینچ کر ڈیپارٹمنٹ سے باہر لے آئی اس میں وہ کسی قسم کی مزاحمت کر کے اپنے آپ کو دقیانوسی اور پس ماندہ بھی ظاہر کرنا نہیں چاہتا تھا۔

جب گاڑی بھاٹی گیٹ سے گزر کر راوی روڈ کی طرف مڑی تو فطرت نے کہا۔ "کیا ارادے ہیں؟"

"وہ تو آپ نے کر لیا اب کیا عزائم ہیں"

"آپ کو دریائے راوی میں پھینکنے کی عزائم ہیں"

اس کے ساتھ ہی زوبی نے گئیر بدلا گاڑی تیز کر دی اور اپنا بایاں ہاتھ فطرت کے ہاتھ پر رکھ دیا فطرت کے جسم میں بجلی کی تیز رو دوڑ گئی زوبی کی نگاہیں اب بھی سامنے تھیں وہ تیز جذبات کے ساتھ ساتھ گاڑی بھی تیز چلا رہی تھی اس کے باوجود اس کا ہاتھ فطرت کے ہاتھ پر تھا جب اس نے محسوس کیا کہ ہاتھ چھونے کے باوجود فطرت کے جذبات میں کوئی ہلچل نہیں مچی تو اس نے فطرت کے ننگے بازو کے نرم نرم بالوں کو سہلانا شروع کر دیا' فطرت سے بھی ضبط نہ ہو سکا اور اس نے زوبی کا ہاتھ اپنی دونوں ہتھیلیوں میں لے کر بھینچ لیا زوبی کے چہرے پر سرخی کی ایک نئی لہر دوڑ گئی اور اس نے سڑک سے نظر ہٹا کر فطرت کی آنکھوں میں دیکھا جو مردانہ جذبات سے اب جاگ اٹھی تھیں' زوبی اپنی فتح پر خوش ہو گئی۔

زوبی نے روای کے کنارے پہنچ کر گاڑی ایک طرف کھڑی اور فطرت کے بازو کا مصنوعی سہارا لے کر راوی کے بند سے نیچے اترنے لگی جہاں گھنے درختوں کا وسیع ذخیرہ تھا یہ درخت دریائے راوی کے مشرق کنارے کو پانی کی کاٹ سے بچانے کے لئے لگائے گئے تھے' اگرچہ ان کے پتے اور اونچی ٹہنیاں اوپر سے ملے ہوئے تھے۔ لیکن ان کے تنوں کے درمیان خاصا فاصلہ تھا جہاں بیٹھنے کے لئے بنچ بنے ہوئے تھے کئی خالی قطعوں پر دری یا قالین بچھا کر پکنک منائی جا سکتی تھی۔ جس طرح زوبی فطرت کا بازو پکڑے اس سے ایک قدم آگے آگے جا رہی تھی اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ جنگل اور اس کا چپہ چپہ کا دیکھا بھالا ہے وہ مناسب جگہ کی تلاش میں آگے بڑھ رہے تھے اور فطرت نے اپنا دایاں بازو زوبی کی کمر کے پیچھے حمائل کر رکھا تھا اس نے غالب کا ایک شعر گنگنانا شروع کیا۔

کاو کاو سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ
صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا

زوبی نے فوراً کہا ”میں نے تو سنا ہے تم اچھے بھلے شاعر ہو' تم نے یہ کونسا Sad song شروع کر دیا اگر گانا ہی ہے تو وہ گاؤ جو مہدی حسن نے گایا۔

گلوں میں رنگ بھرے باد نو بہار چلے
چلے بھی آؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے

ایسے رومانٹک موڈ میں اداس گانا نہیں چلتا اس سے پارٹنر کا موڈ آف ہو جاتا ہے“ بالا آخر درختوں کے ایک جھنڈ میں بیٹھ گئے' زوبی نے بے تکلف ہونے کی کوشش کرتے ہوئے کہا:
”فطرت تم بالکل بدھو ہو“

"پھر"

"جو بدھو کہنے کے باوجود چڑے اسے کیا کہتے ہیں؟"

"کیا کہتے ہیں؟"

"میول" (Mule)

"جسے ہماری زبان میں خچر بولتے ہیں"

"نہیں' خچر میں خچر اپنا پایا جاتا ہے جیسے پروفیسر ڈین اور ہمارے کلاس فیلو منیر ہیں میول میں بڑی معصومیت پائی جاتی ہے جیسے تم؟Don't you agree"

URDU4U.COM

"ہاں' بالکل' میول میں بڑی معصومیت پائی جاتی ہے اور کسی حد تک مظلومیت بھی" "اوہ' لیس' تم بڑے Intelligent ہو"

اتنے میں زوبی نے درختوں کے بیچوں بیچ دور سڑک کی طرف دیکھا' فطرت نے ڈرتے ہوئے پوچھا "کیوں' کوئی آ رہا ہے"

"نہیں ادھر کون آئے گا تم ادھر دیکھو میری انگلی کی سیدھ میں"

فطرت نے زوبی کے زوایہ نگاہ سے اپنا زاویہ نگاہ ملانے کی کوشش کی تو اس کا کان اور گال زوبی کی لٹکتی زلفوں کی زد میں آ گیا اسے یہ خوشبودار کالے سیاہ بال بہت بھلے لگے ان کے لمس سے اسے جھرجھری سی محسوس ہوئی لیکن اس نے اس پر قابو پا لیا اور کہا:

"ہاں کیا ہے ادھر"

"وہ ایک کھوکھا نظر آ رہا ہے"

"ہاں' آ رہا ہے"

"وہاں جا کر لڑکے کو بولو' دو کوک دے جائے' کولڈ اینڈ کنگ سائز"

فطرت نے فوراً تعملی کی' کھوکے والے کو آرڈر پہنچا کر واپس آ گیا' پیچھے پیچھے ایک نوکر بوتلیں اٹھائے پہنچ گیا زوبی نے اسے دس روپے کا نوٹ تھماتے ہوئے کہا "Chandge (بقایا) واپس لانے کی ضرورت نہیں"

"شکریہ میم صاحبہ" وہ درختوں کی پناہ میں بیٹھے ہوئے ٹھنڈا کوکا کولا پی رہے تھے کہ

فطرت کو کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی' اس نے مڑ کر دیکھا تو دو غریب عورتیں جن میں سے ایک کا قد اس کی ماں کے برابر تھا سوکھے تنکے اور پتے اکٹھا کر رہی تھی فطرت انہیں دیکھ کر چونکا لیکن تجربہ کار زوبی نے تسلی دیتے ہوئے کہا:

URDU4U.COM

"یہ غریب عورتیں ہیں' انہیں ہم سے کوئی دلچسپی نہیں' انہیں ایندھن چاہئے یہ بتاؤ تم نے اب تک کتنی لڑکیوں سے رومانس لڑایا ہے"

"دو لڑکیوں سے"

"اوہ سچ۔ میں تو سمجھتی تھی تم بالکل سادہ' شریف"

"ہاں آپ کا اندازہ درست ہے لیکن آپ نے پوچھا تو میں نے سچ سچ بتا دیا"

"پھر کہاں تک پہنچا رومانس ان کے ساتھ"

"بس شروع ہوتے ہی ختم ہو گیا"

"اچھا اسی لئے تم میں ٹریجڈی کا Element زیادہ ہے میں انشاء اللہ تمہارا غم غلط کر دوں گی تم ہمارے ساتھ آیا جایا کرو' تم اپنی ٹریجڈی بھول جاؤ گے"

آدھے دن کی سیر سے جب وہ واپس آ رہے تھے تو داتا دربار کے پاس پہنچ کر فطرت نے کہا مجھے سنٹرل ماڈل سکول کے موڑ پر اتار دینا میں پیدل ہوسٹل چلا جاؤں گا۔

"نہیں' میں تمہیں ہوسٹل تک خود چھوڑ آؤں گی۔"

"نہ نہ' خدا کے لئے ایسا ظلم نہ کرنا۔"

"کیوں' اس میں ظلم کیا کیا بات ہے؟"

"تمہیں نہیں پتہ۔ ہمارے ہوسٹل اور گلبرگ کے کلچر میں بڑا فرق ہے اگر کسی نے مجھے آپ کے ساتھ دیکھ لیا تو میاں صاحب مجھے ہوسٹل سے نکال دیں گے"

"کون میاں صاحب؟"

"ہمارے ہوسٹل کے سپرنٹنڈنٹ"

"مجھے نہیں معلوم تھا فطرت کہ تم اتنے ڈرپوک ہو"

 © Urdu4U.com

"ڈرپوک نہیں' محتاط"

"مجھے ان دونوں میں کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ اچھا یہ بتاؤ کل ہمارے گھر آؤ گے؟ چھٹی اکٹھے گذاریں گے۔ شام کو میں تمہیں ڈراپ کر جاؤں گی۔"

URDU4U.COM

"آپ کے گھر والے گھر پر نہیں ہوں گے' کل؟"

"وہ ہوں گے مگر So What" (پھر کیا؟)

"آپ کے بھائی مجھے قتل تو نہیں کر دیں گے"

"Don't be silly (احمق مت بنو) میرے بھائی اپنی اکلوتی بہن کے کلاس فیلو اور دوست کو کیوں قتل کرنے لگے ... They are the cultred lot"

"لیکن ہماری طرف ایسی باتوں پر جوان بھائی غیرت میں آ کر بہن کے آشنا کو قتل کر دیتے ہیں۔"

"تم چک نمبر ۲۳۰ فیصل آباد کی بات کرتے ہو۔ بھول جاؤ اس کلچر کو' میں گلبرگ میں رہتی ہوں یہاں کوئی غیرت میں آ کر کسی کو قتل نہیں کرتا welcome any time You are (تم کسی وقت بھی آ سکتے ہو)"

"او' کے۔ تھینک یو"

فطرت جب بھی شام کو فارغ ہوتا تھا ٹی ہاؤس چلا جاتا جہاں شہر کے ادیب' شاعر اور دانشور جمع ہوتے تھے فطرت خود تو ابھی لاہور کے ادبی حلقوں میں بطور شاعر متعارف نہیں ہوا تھا لیکن فیصل آباد کے دنوں سے وہ چپکے چپکے شاعری کرتا چلا آ رہا تھا اور کبھی کبھی اپنے پرانے دوستوں یعنی ارشد' تارڑ اور نواز کو سنا بھی چکا تھا لیکن لاہور میں برملا شاعری کرنے کا اسے حوصلہ نہ تھا وہ اپنا ادبی شوق پورا کرنے کے لئے ٹی ہاؤس چلا جاتا تھا جہاں شاعری اور ادب پر بحث ہوتی رہتی تھی۔

لاہور میں پچھلے ایک سالہ قیام کے دوران فطرت نے کئی نئے ناول پڑھ لئے تھے جن میں زیادہ تر یورپی ناول تھے' فلسفہ اور فکشن اب بھی اس کے پسندیدہ موضوع تھے اور

جن مصنفین نے اس عرصے میں اسے خاص طور پر متاثر کیا ان میں اروِنگ اسٹون' چیخوف' خلیل جبران' کامیو' کافکا اور سمرسٹ ماہم نمایاں تھے۔ ان مصنفوں کی فلسفیانہ تحریریں پڑھ پڑھ کر نہ صرف ادبی لحاظ سے فطرت کا بیک گراؤنڈ خاصا وسیع ہو گیا تھا بلکہ آرٹ کو سمجھنے اور پرکھنے کے لئے اس کا نقطہ نظر بھی خاصا نکھر آیا تھا۔

آج ہوسٹل پہنچتے ہی اسے اچانک خیال آیا کہ آج تو ٹی ہاؤس کے بالا خانہمیں ہفتہ وار ادبی محفل ہے کیوں نہ باقی وقت وہاں صرف کیا جائے اس نے ان محفلوں کو ہمیشہ معلوماتی' دلچسپ اور مفید پایا۔

فطرت جب وہاں پہنچا تو ایک صاحب اپنا افسانہ تنقید کے لئے پیش کر چکے تھے اور اس پر بحث ہو رہی تھی ایک نقاد کہہ رہے تھے:

"یہ افسانہ نہیں رپورتاژ ہے۔ بلکہ پورتاژ بھی نہیں ایک صحافتی چیتھڑا ہے یہ اگرچہ جنگ کے پس من طر میں لکھا گیا ہے لیکن جنگ کی واقعاتی سطح سے بلند نہیں ہوتا اسے تخلیقی ادب قرار دینا دراصل تخیقی ادب سے زیادتی ہے"

دوسرے نقاد بولے:

"اس میں ایک جگہ کہا گیا ہے کہ سیزفائر کے بعد عائشہ اپنے تباہ شدہ گھر میں برہنہ پا داخل ہوئی اپنے ویران در و دیوار کو بوسہ دے کر رونے لگی۔ اسلامیہ جمہوریہ پاکستان میں ایک کردار سے خاص کر زنانہ کردار سے برہنہ اور بوسہ جیسے الفاظ منسوب کرنا زیادتی ہے یہ سراسر فحاشی کے زمرے میں آتا ہے سمجھ میں نہیں آتا کہ معمولی سی چوری چکاری کی واردات پر تو لوگوں کو جیلوں میں بند کر دیا جاتا ہے لیکن جو نام نہاد ادیب اور دانشور ملک کی نظریاتی بنیادوں کو کھوکھلا کر رہے ہیں ان کی گرفت کیوں نہیں ہوتی"

افسانہ نگار کی حمایت میں صرف ایک آواز اٹھی وہ صاحب صدر کی تھی' انہوں نے کہا:

"درحقیقت یہ افسانہ کئی لحاظ سے قابل قدر ہے' یہ روایتی قسم کے رومانی واقعات سے

ہٹ کر لکھا گیا ہے اس میں جنگ کی تباہیوں' عورتوں کی بے بسی اور غربت و افلاس کے گہرے زخموں کی عکاسی کی گئی جو اپنی جگہ قابل تعریف ہے' البتہ افسانے کے کچھ پہلو فنی لحاظ سے ناپختہ ہیں۔ مجھے امید ہے کہ نو عمر افسانہ نگار ان کی طرف توجہ دیں گے"

اس کے بعد جناب شبنم لکھنوی نے اپنی تازہ غزل پیش کی جب تک وہ غزل پڑھ کر سناتے رہے لوگ ہر شعر پر داد دیتے رہے لیکن جب بحث کا آغاز ہوا تو یہ داد سراسر بے داد میں بدل گئی' ایک صاحب نے کہا:

"یہ غزل ہماری اردو شاعری کے خلاف ایک احتجاج ہے' اس کی بحر' ردیف اور قافیے کا چناؤ اس طرح کیا گیا ہے کہ اسے غزل کے معروف ڈھانچے میں سمویا نہیں جا سکتا اس کے شعروں کی بندش' الفاظ کا چناؤ اور تراکیب کی بنت اسے غزل کی نسبت نظم کے قریب لے آتی ہے"

صاحب صدر نے جناب جمیل مراد آبادی کو اظہار خیال کی دعوت دی' انہوں نے کہا:

"میرے خیال میں یہ نظم شیکسپئیر کے Blank verse سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہے لیکن جناب شبنم یہ بھول گئے ہیں کہ بلینک ورس جسے ہم آزاد شاعری کہتے ہیں اتنا آزاد نہیں ہوتا اس کے بھی کچھ آداب ہوتے ہیں جن کا اس نظم میں خیال نہیں رکھا گیا۔"

اس کے بعد اس غزل پر خوب لے دے ہوئی اور اس غزل کا بھی وہی حشر ہوا جو اس سے پہلے افسانے کا ہو چکا تھا' یہ بحث بلکہ تنقید رائے تنقید سن کر فطرت نے اپنے دل میں فیصلہ کر لیا کہ وہ اپنی کوئی شعری یا نثری تخلیق اس ادبی حلقے میں کبھی پیش نہیں کرے گی۔

ایم۔ اے (فائنل) کے دنوں کی بات ہے ایک دن مسز نادرہ شیخ نے اپنا بیگ اور ڈنڈا

© Urdu4U.com

نکالا' ڈیپارٹمنٹ کی چالیس سیٹر بس تیار کروائی اور ڈیپارٹمنٹ کے تمام طلبا و طالبات کو اساتذہ سمیت لاد کر مقبرہ جہانگیر کے پاس سپاٹ پینٹنگ کے لئے لے گئی۔

بس مقبرہ جہانگیر کے مغربی کنارے پر جا کر رک گئی۔ لڑکے اور لڑکیوں نے اپنے ایزل' کینوس' پینٹ' گبرش اور دیگر سامان بس سے اتارا اور سنہری گندم کے لہلہاتے کھیتوں میں پھیل گئے کسی نے بیک گراؤنڈ میں مقبرہ جہانگیر رکھا' کسی نے فوراً گراؤنڈ میں کھجور کے درختوں کو سجایا اور کچھ لڑکے اور لڑکیاں مقبرہ جہانگیر کو پیچھے چھوڑ کر آگے کھیتوں میں نکل گئے جہاں نیلا آسمان اور اس کی محرابوں پر اڈتے سفید بادل صاف نظر آ رہے تھے۔ ہر طالب علم نے اپنی اپنی پسند کے مطابق ایزل سجا کر کام شروع کر دیا اساتذہ وقفے وقفے سے ان کے کام کی نگرانی کرنے لگے۔

فطرت کے بائیں جانب قریب ترین ایزل منیر کا تھا' اس نے محسوس کیا کہ فطرت اپنے سامنے کینوس سجائے کھڑا تو ہے لیکن کچھ پینٹ نہیں کر رہا۔ وہ تقریباً آدھ گھنٹہ اس کی طرف وقفوں وقفوں سے دیکھتا رہا۔ فطرت اسے خلاف معمول اکھڑا اکھڑا اور پریشان لگ رہا تھا جب تینوں چاروں استاد طالب علموں کو اپنے اپنے کام میں مشغول چھوڑ کر مقبرہ جہانگیر کی سیر کرنے چلے گئے تو منیر برش ہاتھ میں پکڑے فطرت کے پاس آیا اس نے فطرت کا کورا کینوس دیکھ کر کہا "کیا بات ہے فطرت' تم نے ابھی تک کینوس کو چھوا تک نہیں"

"ہاں یار' کچھ موڈ نہیں بن رہا"

"تم تو پینٹنگ میں ہم سب سے آگے ہو۔ "موڈ نہیں بن رہا' والی بات سمجھ میں نہیں آتی بتاؤ کوئی پریشانی ہے کیا؟"

"پریشانی تو کوئی نہیں' بس یونہی"

"پھر بھی؟"

"سچ پوچھو تو جو کچھ آنکھ دیکھ رہی ہے گندم کے خوشے' کیکر کا درخت کھیت کے بیچوں بیچ پانی کی خشک نالی یہ سب کچھ پینٹ کرنے کو جی نہیں چاہتا"

 © Urdu4U.com

"تمہارا جی کیا چاہتا ہے؟"
"میں چاہتا ہوں کہ یہ ظاہری مناظر چھوڑ کر وہ کچھ پینٹ کروں جو نظر نہیں آ رہا"
"مثلاً"
"مثلاً ملکہ نور جہاں کے دکھ' درد' اندوہ۔ تم نے اس کی قبر پر وہ شعر پڑھا ہے

URDU4U.COM

بر مزار ماغریباں نے چراغے نے گلے
نے پر پروانہ سوزد' نے صدائے بلبلے

اس شعر میں کتنا دکھ ہے کتنا Pathos ہے اور وہ بھی ایک ملکہ کی زبانی"
"فطرت دی فلاسفر' یہ مت بھولو کہ وہ ملکہ تھی بلکہ' بادشاہ جہانگیر بھی اس کے مشورے کے بغیر کچھ نہیں کرتا تھا۔ بڑی پاور فل عورت تھی وہ اپنے وقت کی"
"یہ وہ کچھ ہے جو ہمیں تاریخ بتاتی ہے لیکن شاید ہم وہ کچھ نہیں جانتے جو ہمیں تاریخ نہیں بتاتی"
"وہ کیا"
مثلاً یہی کہ نور جہاں ایک مظلوم عورت تھی جو اپنے اندر کے سارے دکھ زرق برق لباس میں چھپا کر محل کے اندر قیدیوں کی طرح بسر اوقات کرتی رہی' امور مملکت میں مصروف بادشاہ کے پاس اتنی فرصت کہاں تھی کہ وہ نور جہاں کے دل میں جھانکتا جو عورت پہلے تھی اور ملکہ بعد میں' میرا جی چاہتا ہے کہ میں عورت نور جہاں کے اندوہ پینٹ کروں' اس کے مقبرے کے سنگ مرمر کے نیچے دفن حسرتوں' محرومیوں اور مجبوریوں کی عکاسی کروں۔
"پاگل ہو گئے ہو تم اور پڑھو کا فکا' کامیو' رسل اور ہکسلے۔ وہ آ رہی ہے مسز شیخ اپنے ڈنڈے سمیت' اگر تم ان خوابوں سے نکل کر حقیقت کی دنیا میں نہ آئے اور یہ ظاہری منظر پینٹ نہ کیا تو وہ تمہیں فیل کر دے گی۔ جلدی کرو۔ برش ہلاؤ۔ وہ آ

رہی ہے"
اس کے بعد فطرت مجبوراً گندم کا کھیت پینٹ کرنے لگا جس کے درمیان کیکر کا خار دار درخت کھڑا تھا۔
تھوڑی دیر بعد مس نزہت طلبا اور طالبات کے کینوس دیکھتے ہوئے فطرت کے اس آئی اور اس کے بائیں کندھے کے پاس کھڑی ہو گی' اس نے فطرت کے کینوس کا بغور مطالعہ کیا اور کہا:
"گڈ"
"آپ خوش ہیں میری پینٹنگ سے"
"ہاں تم خوب پینٹ کرتے ہو' "تمہارا اینگل (زاویہ) اور تصویر Composition میں اتنے کھو جاتے ہو کہ اس کی تکنیکی پہلوؤں کو نظر انداز کر دیتے ہو مثلاً اس تصویر کا Perspective ہی دیکھ لو۔ اسے درست کرو پہلے"
"تھینک یو مس' میں انشاء اللہ اپنے سبجیکٹ میں نہ کھونے کی کوشش کروں گا"
مس نزہت ایک پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ اگلے طالب علم کے پاس چلی گئی۔

دوپہر کے کھانے کا وقفہ ہوا تو سب نے مل کر پکنک لنچ کھایا زوبی' آشا اور یعقوب اپنے اپنے ٹفن ساتھ لے آئے تھے جو سب کو پیش کئے گئے۔ کسی نے بوٹی لے لی' کسی نے کباب اٹھا لیا۔ فطرت کیلا چھیل کر کھانے لگا۔
لنچ بریک کے دورا ہلکی پھلکی گپ شپ ہوتی رہی جو پروفیسر سعید کی مداخلت سے جلد ہی سنجیدہ بحث کا رخ اختیار کر گئی' انہوں نے کہا "پچھلے ڈیڑھ سال میں آپ نے آرٹ کے متعلق اچھا خاصا مطالعہ کر لیا ہو گا آیئے ذرا اس کے عمومی پہلوؤں کے بارے میں بات ہو جائے۔
فطرت نے فوراً کہا:

"ضرور' سر ضرور"

"ہاں تو فطرت پہلے آپ ہی بتایئے کہ زندگی میں آرٹ کا کیا رول ہے؟"

سر میرے خیال میں فن یا فنکار کا بنیادی کام یہ ہے کہ وہ ناظرین کو وہ کچھ دکھائے عام لوگوں کو نظر نہیں آتا' مثلاً لاہور کی مال روڈ کو ہی لے لیجئے اس پر چلنے والی ٹریفک' دکانیں' لوگوں کی آمدورفت' سارا ہنگامہ سب لوگ دیکھتے ہیں' اس لئے اگر کسی آرٹسٹ نے یہی منظر ہو بہو کینوس پر منتقل کر دیا تو میرے خیال میں اس نے کوئی تیر نہیں مارا' لیکن اس فیشن ایبل علاقے میں۔ دولت کی اس ریل پیل کے عین وسط میں۔ اگر ایک معذور شخص اپنے سامنے کپڑا بچھائے بھیگ مانگ رہا ہے اور اس کے کپڑے پر کوئی راہ گیر کوئی کار سوار' کوئی پیدل سیر کرنے والا ایک پیسہ بھی نہیں پھینکتا تو میرے خیال میں یہ ہے اصل موضوع جو سچے فنکار کو پوری دیانت کے ساتھ پینٹ کرنا چاہیئے اور معاشرے کو یہ آئینہ دکھانا چاہیئے"

پروفیسر سعید نے منور سے کہا "آپ فطرت سے اتفاق کرتے ہیں"

"نہیں سر' میں تو آرٹسٹ کو۔ خواہ وہ شاعر ہو' ادیب ہو یا مصور۔ ہمیشہ خوشیوں کا متلاشی سمجھتا ہوں اور معاشرے میں اس کا رول یہی ہے کہ وہ خوشیاں تلاش کرے اور اپنے فن کے ذریعے دوسروں تک پہنچائے ورنہ اس کی تصویریں بد وضع ہو جائیں گی۔ انہیں کوئی نہیں خریدے گا' انہیں کوئی اپنے ڈرائنگ روم میں نہیں سجائے گا"

فطرت نے منور کی بات کاٹتے ہوئے کہا:

"سر یہی تو میرا بنیادی اعتراض ہے' میں سمجھتا ہوں کہ گریٹ آرٹ صرف زیبائش کی چیز نہیں' یہ گھروں' بنگلوں یا محلوں کی ڈیکوریشن کا آئٹم نہیں' یہ زندگی کی تلخ سے تلخ حقیقتوں کو پہچاننے اور ان کا اظہار کرنے کا نام ہے"

مسز شیخ نے ایک نیا موضوع چھیڑ دیا:

"آپ لوگ یہ بتایئے کہ فنکار اپنا میٹریل کہاں سے حاصل کرتا ہے"

"زوبی نے جھٹ جواب دیا" بازار سے۔ ساری چیزیں مل جاتی ہیں آجکل لوکل مارکیٹ میں"

پروفیسر ڈین نے پوچھا "کیوں فطرت؟"
فطرت نے کہا:
"سر میرے خیال میں ایک سچا اور عظیم فنکار اپنا میٹریل یا خام مواد خارجی عناصر سے نہیں اپنے اندر سے حاصل کرتا ہے' خارجی عناصر تو صدیوں سے موجود ہیں اور موجود رہیں گے کھیت' درخت' پہاڑ' آسمان' بادل' لیکن دیکھنا یہ ہے کہ ایک فنار درخت کھیت یا پہاڑ کو کس طرح دیکھتا ہے کیا وہ پہاڑ کو محض برف پوش چٹانوں کا مجموعہ سمجھتا ہے یا اس کے اندر فن آتش فشاں مادے کا تصور کر کے کانپ اٹھتا ہے یا اس میں سونے چاندی کے ذخائر کا تصور کر کے خوش ہو جاتا ہے یعنی اصل بات فنکار کے اپنے احساسات کی ہے نہ کہ خارجی حالات کی۔ اندرونی احساسات اور خارجی صورتحال کا درمیانی تعلق ہی وہ کنجی ہے جس سے فن پارہ تخلیق پاتا ہے۔
"سر' میں اگلے دن سترہویں صدی کے یورپی آرٹ کے متعلق پڑھ رہا تھا مجھے یہ جان کر سخت حیرت ہوئی کہ اس زمانے کی ایک مشہور پینٹنگ کی بنیاد یہ واقعہ ہے کہ بروٹس کی بیوی پورشیا نے دہکتے انگارے نگل کر خودکشی کر لی' میں سمجھتا ہوں کہ انسان کے اپنے اندر انگارے اتنے زیادہ ہوتے ہیں کہ وہ خارجی انگاروں کا محتاج نہیں رہتا"
بحث خاصی دیر تک جاری رہی جس میں فطرت اپنے ٹھوس دلائل کے ساتھ پیش پیش تھا۔
دوپہر کے کھانے اور بحث مباحثے کے بعد لڑکے لڑکیاں دوبارہ اپنے اپنے کینوس کے پاس چلے گئے اب انہیں ڈھلتی دھوپ میں ایک تصویر بنانا تھی پروفیسر ڈین نے سب کو بتا دیا کہ وہ اپنا کام چھ بجے سے پہلے پہلے ختم کر لیں کیونکہ اس کے بعد روشنی بھی ختم ہو جاتی ہے اور لوگ مقبرہ جہانگیر کی سیر کرنے بھی آ جاتے ہیں۔
سب طالب علم اپنے اپنے کینوس پر مگن ہو گئے۔ اساتذہ وقفے وقفے سے ان کا کام دیکھتے رہے۔ مس نزہت جو فطرت پر خاص توجہ دیتی تھی۔ دوبارہ اس کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔ کچھ دیر فطرت ہاتھ کے بغیر پینٹ کرتا رہا۔ پھر اس نے رک کر کہا: Comments? Miss, Anu (کوئی تبصرہ' مس)

"میں تمہیں بتانے ہی والی تھی کہ تمہاری تصویر میں ایک بنیادی غلطی ہے"
فطرت نے حیرت اور اشتیاق سے پوچھا "وہ کیا"
"وہ یہ کہ تم نے اس تصویر میں جو دھوپ پینٹ کی ہے وہ پاکستان یا مقبرہ جہانگیر کی دھوپ نہیں ہے یہ تو کرہ شمالی کے کسی ملک کی دھوپ ہے۔ جاپان' منگولیا' شمالی امریکہ یا کینیڈا کی دھوپ' ہماری دھوپ تو بڑی چمکیلی اور چلبلی ہوتی ہے تم نے اسے بالکل ڈل (Dull) بنا دیا ہے۔ میں نے کلاس میں بھی بتایا تھا کہ ہر دھوپ' ہر شفق اور ہر سایہ ایک طرح صبح کا سایہ کچھ اور ہوتا ہے اور شام ڈھلے کا سایہ کچھ اور' ایک میں آغاز یا عروج کا عنصر ہوتا ہے اور دوسرے میں زوال اور اختتام کا اسی طرح آپ موسم بہار اور موسم خزاں کی دھوپ کے فرق کو کبھی نظر انداز نہیں کر سکتے۔ ایک دھوپ زندگی آمیز اور جائیت کی آئینہ دار ہوتی ہے دوسری دم فراق کی یا سیت کا پتہ دیتی ہے۔ تم تو شاعر ہو اس فرق کو خوب سمجھ سکتے ہو"
"تھینک یو مس' میں انشاء اللہ آئندہ خیال رکھوں گا"
چھ بجے کے قریب پروفیسر سعید کے اشارے پر بس کے ڈرائیور نے ہارن بجانا شروع کر دیا۔ تمام لڑکوں اور لڑکیوں نے اپنا اپنا سامان سمیٹا اور بس میں سوار ہو گئے۔

ایک دن فطرت حسب معمول صبح صبح تیار ہو کر یونیورسٹی گیا تو پتہ چلا کہ کسی غیر ملکی سربراہ کی آمد کی خوشی میں یونیورسٹی سمیت تمام تعلیمی ادارے ایک دن کے لئے بند کر دیئے گئے ہیں' کئی اور طلباء اور طالبات بھی فطرت کی طرح صبح کا اخبار پڑھے بغیر آ گئے تھے' فطرت کا جی چاہا کہ وہ دوستوں کے ساتھ لان میں بیٹھ کر گپ لگائے یا مال روڈ پر سیر کرنے نکل جائے لیکن کتابوں اور رسالوں کی کوشش اسے لائبریری میں لے گئی۔ وہ شیلف سے "ایشیائی آرٹ" پر ایک کتاب نکال کر پڑھنے لگا' وہ خاصی دیر تک مطالعے میں مگن رہا' خوش قسمتی سے کوئی بھی لڑکا یا لڑکی لائبریری کی طرف نہ آئی۔ وہ سمجھا اچھا ہوا سب لوگ اپنے اپنے گھروں کو واپس چلے گئے ہیں۔ وہ کافی

نکال کر نوٹس لینے لگا۔

تھوڑی دیر بعد آشا اور فرحت ادھر آ نکلیں' دونوں اس کی ہم جماعت تھیں اور اکثر اکٹھی پھرتی رہتی تھیں۔ آشا درمیانے قد کی ایک سنجیدہ طبیعت لڑکی تھی جس کا کردار اس کے چہرے کی طرح بے داغ تھا۔ اس کا شمار یونیورسٹی کی حسین ترین لڑکیوں میں ہوتا تھا وہ گرمیوں میں عموماً سفید لباس پہنتی تھی اور سفید چادار اوڑھ کر آتی تھی' جس میں اس کا دھکتا ہوا گلابی چہرہ اور دھکنے لگتا تھا' وہ یونیورٹی میں آ کر چادر اتار دیتی تھی اور واپس گھر جاتے ہوئے دوبارہ اوڑھ لیتی تھی' اس کے حسن کے چرچے بہت تھے لیکن ان دو سالوں‌میں وہ کسی سیکنڈل میں ملوث نہیں ہوئی تھی' لڑکے اس سے بات کرنا اپنے لئے باعث فخر سمجھتے تھے' وہ ایسی مغرور بھی نہ تھی' بات تو سب ہم جماعتوں سے کر لیتی تھی لیکن کسی کے ساتھ بے تکلف نہیں ہوتی تھی۔ وہ قریب رہ کر بھی دور ہوتی تھی اور دور رہ کر بھی قربت کا احساس دلاتی تھی۔

اس کے ساتھ گھومنے والی فرحت آشا کے بالکل برعکس تھی ٹھنگنا سا قد' مہاسوں اور چھائیوں سے بھرا ہوا چہرہ' وہ کپڑے بھی رنگ دار پہنتی تھی اور وہ بھی ایسی جن سے اس کے فائن آرٹس کی طالبہ ہونے کی بجائے دیہاتی گنوارن ہونے کاپ تہ چلتا تھا۔ یونیورسٹی کے طلبا و طالبات اس بے ہنگم جوڑی کو دیکھ کر اکثر تعجب کیا کرتے تھی کئی لڑکوں نے زندگی کی دوسری بے جوڑ باتوں کی طرح اس بے ہنگم جوڑے کی بھی کئی تو ضیحات نکال رکھی تھیں' کسی کا خیال تھا کہ آشا دل پھینک قسم کے عاشقوں کو اپنے آپ سے دور رکھنے کے لئے فرحت کو "نظر بٹوے" کی طور پر ساتھ رکھتی ہے' کسی کا کہنا تھا کہ فرحت (جسے کوئی منہ نہیں لگاتا تھا) لڑکوں تک رسائی حاصل کرنے کے لئے آشا کو استعمال کر رہی ہے بہر حال جتنے منہ اتنی باتیں۔ پتہ نہیں کون کس کو کس مقصد کے لئے استعمال کر رہا تھا۔ اب تو صورت حال یہ تھی کہ فطرت بڑی توجہ سے نوٹس (Novtes) لے رہا تھا کہ دونوں بیبیاں حملہ آور ہو گئیں۔ آشا نے دل موہ لینے والے

انداز میں کہا:
"فطرت صاحب۔ تھوڑا سا وقت ہو گا آپ کے پاس' ہمارے لئے بھی"
طرت نے کتاب بند کرتے ہوئے مسکرا کر کہا "Always" (ہمیشہ)
URDU4U.COM
پھر لمحے بھر کے توقف کے بعد خود ہی کہنے لگا "لیکن آپ کو یہ کیسے احساس ہوا کہ میرے پاس وقت نہیں ہے۔ آپ کے لئے"
فرحت نے لقمہ دیا "جب دیکھو زوبی آپ کو ساتھ لئے پھرتی ہے۔ کبھی راوی کے کنارے' کبھی شالیمار' کبھی باغ جناح' ہماری طرف تو آپ توجہ ہی نہیں دیتے"
"یہیں بیٹھیں گی یا کیفے ٹیریا چلیں"۔ فطرت نے فرحت کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔
"ہم وہیں سے آ رہی ہیں' چائے وائے پی کر۔ یہیں ٹھیک ہے "پھر آشا کی بجائے فرحت نے جواب دیا۔
"اچھا۔ تو کیا حکم ہے میرے لئے "یہ کہہ کر فطرت نے اشتیاق بھری نظروں سے آشا کی طرف دیکھا' حسب معمول آشا سے پہلے فرحت بولی:
"دراصل امتحان بہت قریب آ گئے ہیں ہم آپ سے نوٹس ادھار لینا چاہتے ہیں"
"کس پرچے کے؟"
"بتاؤ نا' آشا تم بھی بولو نا ادھر تو کہہ رہی تھیں کہ فطرت علیحدہ مل جائیں تو یہ کہہ دوں' وہ کہہ دوں" فرحت نے کہا۔
"ہٹ باتونی کہیں کی" آشا نے فرحت کو دھتکار دیا اور فطرت سے بڑے میٹھے انداز میں بولی:
"مجھے دو پرچوں میں کمی محسوس ہو رہی ہے"
"جی فرمائیے"
"ایک ایشیائی آرٹ کے بارے میں اور دوسرے Post- Impressionist Period کے متعلق"
"آپ فکر نہ کیجئے جو کچھ میرے پاس ہے۔ حاضر ہے۔ میں کل لیتا آؤں گا۔"

"ہم ایک ہفتے میں کاپی کر کے نوٹس لوٹا دیں گے" فرحت نے خواہ مخواہ خوشگوار گفتگو کو بھونڈے طریقے سے ختم کر دیا۔

وہ دونوں چلی گئیں۔

URDU4U.COM

فطرت لائبریری بند ہونے تک وہیں بیٹھا پڑھتا رہا۔

پچھلے پہر وہ ہوسٹل میں غسل خانے سے نہا کر واپس آ رہا تھا' تولیہ اس کے کندھوں پر تھا اور صابن دانی ہاتھ میں' کہ لان میں بیٹھے ہوئے محمود' نصرت اور عارف نے زور سے کہا: "شہزادے' جب سے لڑکیوں کے چکر میں پڑے ہو' اپنے دوستوں کو بھول ہی گئے ہو" فطرت برا منانے کے بجائے مسکراتا ہوا ان کے پاس آ گیا' تولیہ اور صابن دانی بنچ پر رکھی اور خود ان کے ساتھ گھاس پر بیٹھ گیا۔

"ہاں۔ اب کرو بات کیا فرما رہے تھے آپ یعنی عارف صاحب"

"میں یہ کہہ رہا تھا عزیزم فطرت کہ وہ کیا بھلے دن تھے جب تم فیصل آباد میں گھاس پھوس چر کر نئے نئے لاہور آئے تھے تمہیں کوئی نہیں جانتا تھا' تم اتنے بڑے فلاسفر اور آرٹسٹ بھی نہیں تھے ہم جیسے سادہ لوگوں میں بیٹھتے تھے' گپ لگاتے تھے' اب تو خواب ہو گئے وہ دن"

"نہیں یار"

"نہیں یار کا کیا مطلب' پہلے تم نے ٹیوشن کے بہانے اس کار والی کے ساتھ باہر جانا شروع کیا پھر زیبا اور طلعت کے چکر میں رہے۔ اب سنا ہے آشا کے چکر میں ہو۔ لیکن وہ نظر بٹو جسے فرحت کہتے ہیں آشا کو اکیلا نہیں چھوڑے گی"

"بھئی کیا باتیں کر رہے ہو"

نصرت نے کہا "یار' ہم بھی اسی یونیورسٹی میں پڑھتے ہیں تمہارے ڈیپارٹمنٹ سے دو گز کے فاصلے پر ہمارا ڈیپارٹمنٹ ہے' ایسی باتیں تو میلوں میں پھیل جاتی ہیں ہم تک نہیں پہنچیں گی؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ ایم۔ اے تو تم کر ہی لو گے سچ سچ بتاؤ شادی کے

لئے کونسا دانہ چنا ہے۔ یار ایک سے ایک بڑھیا ہے فائن آرٹس ڈیپارٹمنٹ میں پہلے پتہ ہوتا تو ہم بھی اکنامکس کی بجائے فائن آرٹس میں داخلہ لے لیتے"

URDU4U.COM

"فطرت چپ رہا"۔ محمود نے کہا:

"کیوں فطری برا مان گئے۔ بھئی شادی کا معاملہ اتنا ہی راز کا معاملہ ہے تو ہم زور نہیں دیں گے۔ ویسی یونیورسٹی ساری جانتی ہے"

"کیا جانتی ہے"

"یہ کہ اگر تمہاری نظر حسن پر ہے تو آشا یا زیبا کو ترجیح دو گی اور اگر دولت پر ہاتھ مارنے کا ارادہ ہے تو زوبی تمہارا چوائس ہو گی۔ بولو' غلط ہے کیا"

"سراسر غلط"

"تو صحیح کیا ہے"

"صحیح بتا دیا تو تم یقین نہیں کرو گے"

سب نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور تقریباً ایک زبان ہو کر کہا:

"اگر تم سنجیدگی سے اصلی بات یعنی' وچلی گل' بتا دو تو ہم یقین کر لیں گے۔"

"اصلی بات یا وچلی گل یہ ہے کہ میری نظر حسن پر ہے نہ دولت پر سچ پوچھو تو مجھے بہت ہی حسین اور بہت ہی امیر لڑکیوں سے خوف آتا ہے۔ ان سے ڈر لگتا ہے"

فطرت کی سانجیدگی کو توڑتے ہوئے محمود نے کہا

"اچھا' تو فرحت کو پک اپ کر لو۔ نہ حسین ہے نہ دولت مند"

سب نے مل کر قہقہہ لگایا اور بات ہنسی مذاق میں اڑ گئی۔

فطرت اپنا تولیہ اور صابن دانی اٹھا کر کمرے میں چلا گیا۔

ایم۔ اے (فائنل) کے امتحانات بالکل قریب آ گئے تو مسز نادرہ شیخ' پروفیسر افتخار' پروفیسر سعید' پروفیسر ڈین اور مس نزہت نے پوری کلاس کو جمع کیا اور فرداً فرداً ہر طالبعلم سے پوچھا کہ "اس کا پسندیدہ آرٹسٹ کون ہے اور کیوں" پھر ممتحن صاحبان کے ساتھ

سب طالب علموں کی ملاقات ہوئی تا کہ امتحان کے لئے تصویر کے موضوع کا انتخاب کیا جا سکے' منتخب شدہ موضوع پر ابتدائی طور پر ہر طالب علم نے تین تین اسکیچ بنانے تھے۔

URDU4U.COM

پہلے پسندیدہ آرٹسٹ کی بحث شروع ہوئی

مقبول نے کہا "چغتائی"

مسز شیخ نے پوچھا "کیوں"

"اس لئے کہ وہ"

"ہاں' ہاں کہو" پروفیسر سعید نے اس کی ہمت بندھائی

"وہ بڑی خوبصورت عورتیں بناتا ہے نوکیلی پلکیں' تیکھے نقوش' نازک مگر صحت مند جسم"

سننے والے زیر لب مسکرا دیئے۔

منیر سے یہی سوال پوچھا گیا تو اس نے کہا

"اللہ بخش"

"کیوں" پروفیسر افختار نے پوچھا

"شاید اس کی ایک وجہ یہ ہو کہ وہ یہی زندگی کی عکاسی کرتا ہے اور میرا بچپن بھی دیہات میں گزرا ہے۔ لیکن اس کی اصل خوبی یہ ہے کہ وہ دیہاتی منظر پینٹ کرتے وقت اصل سے بیوفائی نہیں کرتا لیکن اسے کینوس کرتے ہوئے بڑی مہارت کے ساتھ گاؤں کی ساری غلاظت (گوبر اور کیچڑ وغیرہ) حذف کر دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی تصویر میں گاؤں کام نظر اصلی منظر سے زیادہ حسین لگتا ہے۔"

"گڈ ہاں فطرت! آپ کا پسندیدہ آرٹسٹ؟"

"سر' میرا پسندیدہ آرٹسٹ وان گاف ہے (Van Gogh) اس لئے نہیں کہ وہ یورپی ہے اور مجھے کسی قسم کا کمپلکس ہے بلکہ اس لئے...."

"یہی نکتہ تو ہم جاننا چاہتے ہیں" مسٹر ڈین نے کہا

"وان گوف کو پسند کرنے کی تین وجوہات ہیں۔ ایک یہ کہ جب وہ پوری احتیاط کے ساتھ ایک لوکیشن کا انتخاب کرتا ہے تو اسے کینوس پر منتقل کرتے وقت اسے ایڈیٹ

(Edit) کرتا ہے یعنی اس کی غیر ضروری تفصیلات حذف کر دیتا ہے اور اس کے اصل خد و خال واضح کر دیتا ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ وہ محض Representational Artist نہیں ہے وہ جدید آرٹ کا بانی ہے۔ جو Realism (حقیقت پسندی) کو مکمل طور پر ترک کئے بغیر Expressionism کی داغ بیل ڈالتا ہے اور تیسری وجہ یہ ہے کہ وہ بھی میری طرح جذباتی ہے اور تیز تیز جذبات کے اظہار میں تیز تیز برش چلاتا ہے۔ وہ اپنے جذبات کو جیومیٹریکل تناسب پر قربان نہیں کرتا۔ وہ جذبات کی تصویر کی جان سمجھتا ہے اور اظہار کے آداب اور طریقوں کو ثانوی حیثیت دیتا ہے"

URDU4U.COM

یوں باری باری تمام طلبا اور طالبات سے ان کے پسندیدہ فنکاروں کے متعلق رائے معلوم کی گئی۔ پھر آدھ گھنٹے کا وقفہ ہوا۔ وقفے کے بعد امتحانی تصاویر پر بات ہونے لگی۔

منیر نے کہا "میں دیہاتی آدمی ہوں' اپنے دیہات کا منظر پینٹ کروں گا۔ غروب آفتاب کا منظر جب ہلکی ہلکی تاریکی آہستہ آہستہ گاؤں پر اترنے لگتی ہے۔ مویشی اپنے اپنے کھونٹے پر چارہ کھا رہے ہوتے ہیں۔ مرغیاں دانہ دنکا چک کر واپس اپنے ڈربوں میں آ رہی ہوتی ہیں اور چولھوں سے سیال سلیٹی رنگ کا دھواں آسمان کی طرف اٹھنے لگتا ہے۔ مجھے یہ سین بہت پسند ہیں اور اجازت ہو تو میں اس کو پینٹ کرنا چاہوں گا"

ممتحنوں نے موضوع کو پسند کیا البتہ یہ تاکید کر دی کہ اللہ بخش کی نقل کرنے کی کوشش نہ کرنا۔

زوبی سے پوچھا گیا تو اس نے کہا۔

"میں ایک آئیڈیل بنگلہ پینٹ کرنا چاہتی ہوں۔ شہر سے دور' پہاڑ کی چوٹی پر' جس تک پہنچنے کے لئے ایک بل کھاتی سڑک جاتی اور رولز رائس گاڑی جب اس سڑک کی بجری سے گزرے تو شہنائیاں بجیں اور بنگلے تک پہنچتے پہنچتے جلترنگ بول اٹھیں"

"کیوں فلاسفر فطرت تم نے کیا سوچا؟" مس نزہت نے کہا۔

"اگر آپ لوگ اجازت دیں تو میں ایک بڑا کینوس پینٹ کرنا چاہتا ہوں۔ بہت ہی بڑا جس کے دائیں اور بائیں کنارے پر دو بڑے بڑے ستون ہوں۔ ایک ستون حضرت آدم

ہوں اور دورا ستون مائی حوا۔ اور ان دو ستونوں کے درمیان ساری کائنات ہو۔ اپنے تمام غموں' اندوہوں' مسرتوں اور حسرتوں کے ساتھ"

مس نزہت تعجب سے اپنی آنکھیں تیز تیز جھپکنے لگی۔ ایک ممتحن نے کہا

URDU4U.COM

"یہ بہت بڑا موضوع ہے تم جیسے نو عمر آرٹسٹ کے قابو میں نہیں آئے گا۔"

کلاس کے پچھلے حصے سے کسی نے پھبتی کستے ہوئے کہا "آدم اور حوا کے نیوڈ تمہیں کون پینٹ کرنے دے گا"

کسی منچلے نے سر ڈیسک کے نیچے کر کے آوز لگائی

"آدم کو تھری پیس سوٹ اور حوا کو بنارسی ساڑھی پہنا دو"

مسز نادرہ شیخ نے خشمناک نگاہوں سے کلاس کی طرف دیکھا اور وہاں مکمل خاموشی چھا گئی۔

اسی طرح مختلف موضوعات زیر بحث آتے رہے اور سادہ اور عام فہم موضوع منظور ہوتے رہے لیکن فطرت سے کہا گیا کہ وہ آخر میں ممتحن صاحبان سے دوبارہ ملے اور اسی دوران کوئی اور موضوع بھی سوچ لے۔

جب سب لڑکے اور لڑکیاں فارغ ہو گئے تو پروفیسر سعید نے کہا۔

"فطرت بہت ذہین لڑکا ہے۔ غیر معمولی تخلیق صلاحیت کا مالک ہے"

مس نزہت نے کہا "لیکن ہے Non-conformist' وہ دوسروں سے ہٹ کر کوئی نئی چیز تخلیق کرنا چاہتا ہے۔"

"وہ ضرور کرے' دراصل تخلیقی لحاظ سے Non-conformist ہونا اچھی بات ہے لیکن ایسے شخص کے لئے معاشرے میں ایڈجسٹ ہونا مشکل ہو جاتا ہے۔" ایک ممتحن نے رائے دی۔

مسز نادرہ شیخ نے کہا "وہ بعد کی بات ہے۔ ہمارا فوری کام ان کا امتحان لینا ہے' پہلے اس کی بات کریں"

تھوڑی دیر بعد فطرت کو دوبارہ بلوایا گیا:

"کیوں فطرت' کچھ سوچا' آپ نے"
"جی ہاں۔ ایک سوشل موضوع ہے"
"ہاں بتایئے"
"میرے ذہن میں ایک ایسی تصویر آ رہی ہے جس میں ایک جاگیردار تخت نما پلنگ پر
URDU4U.COM
بیٹھا فرشی حقہ پی رہا ہے۔ اس کے مزارعے سامنے زمین پر بیٹھے ہیں۔ درمیان میں جگہ خالی ہے جہاں ایک مزارع کو جاگیردار کی مرضی کے خلاف ووٹ دینے کی سزا دی جا رہی ہے۔ ایک بڑا کٹا شخص چمڑے کا لمبا سا جوتا۔ تیل میں بھگویا ہوا جوتا۔ پے درپے اس کی سیاہ پیٹھ پر برسا رہا ہے۔ متواتر پٹائی کے نشان پیٹھ پر صاف نظر آ رہے ہیں۔ جاگیردار کا دل نہیں پسیجتا لیکن مزارع کی پیٹھ پر برسنے والے جوتے کے اپنے چمڑے سے خون رسنے لگتا ہے۔ بے جان چمڑے سے! یہ رستا ہوا خون اس تصویر میں صاف نظر آ رہاہ ے جس میں ایک ہٹا کٹا شخص جوتا ہوا میں لہرائے ہوئے ہے"
ممتحن فطرت کا منہ دیکھتے رہ گئے۔
پروفیسر افتخار نے کہا "یہ تو فیوڈل سوسائٹی کے خلاف ہے"
مسٹر ڈین نے کہا "اس میں اشتراکیت کی بو آتی ہے"
پروفیسر سعید نے کہا "یہ موضوع امتحان کے لئے موزوں نہیں ہے۔"
"پھر آپ لوگ جو کہتے ہیں میں پینٹ کر دیتا ہوں" فطرت نے مایوس ہو کر کہا۔
دراصل فطرت Non-conformist ہونے کے باوجود انقلابی نہیں تھا۔ اور یہی اس کا اصل المیہ تھا۔ وہ پٹے ہوئے موضوعات سے ہٹ کر پینٹ کرنا چاہتا تھا۔ وہ پٹے ہوئے راستوں کو چھوڑ کر اپنی راہ الگ تلاش کرنا چاہتا تھا لیکن اس میں ہر شے کو توڑنے' پھوڑنے اور تہس نہس کرنے کی ہمت نہ تھی۔ اس پر ذاتی اور خاندانی حالات کا دباؤ بہت زیادہ تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اگر اس نے ضد کی اور ممتحنوں کی مرضی کے خلاف کوئی تصویر پینٹ کر دی تو وہ اسے فیل کر دیں گے۔ وہ آرٹسٹ نہیں بن سکے گا اور اس کی ماں ساری زندگی دوسروں کے برتن مانجھتی رہے گی۔

اس نے اپنا جواب دہرایا "سر' جیسے آپ کہتے ہیں میں کر لیتا ہوں"
پروفیسر افتخار نے کہا:
"میں ایک موضوع تجویز کرتا ہوں جو زیادہ پٹا ہوا بھی نہیں ہے اور ہے بھی تمہارے ذوق کے مطابق"

URDU4U.COM

"جی فرمائیے"
"فطرت' تم قیام پاکستان کے وقت مہاجرین کی ہجرت پینٹ کرو۔ جب لاکھوں عورتیں' مرد اور بچے گرتے پڑتے پاکستان پہنچے۔ ان کے جسموں اور چہروں پر تھکاوٹ کے آثار تھے لیکن آنکھوں میں امید کی کرن تھی۔ آزادی کرن' اپنے نئے گھر کی کرن"
۵ "ٹھیک ہے سر" فطرت نے کہا اور لائبریری میں جا کر گم سم بیٹھ گیا۔

ایم۔ ای فائنل کا امتحان دے کر جب کھاتے پیتے گھرانوں کے لڑکے اور لڑکیاں مری' کراچی' سوات یا کاغان جانے کا پروگرام بنانے لگے تو فطرت فیصل آباد روانہ ہو گیا۔
وہ بس میں بیٹھا طرح طرح کے خیالوں میں گم رہا لیکن دو خیالات خاص طور پر اس کے ذہن پر چھائے رہے جن میں سے ایک کا تعلق ماضی سے تھا اور دوسرے کا مستقبل سے۔ ماضی سے متعلق خیال کا محور اس کی ماں ریشماں تھی جس نے عین جوانی میں بیوگی کا سامنا کیا۔ زمانے کے تھپیڑے سہے اور فطرت کی ایسی پرورش کی کہ آج وہ ایم۔ اے تک پہنچ گیا۔ کون کہہ سکتا ہے کہ اس کی ماں نے اس کی تربیت میں کوئی کسر چھوڑ دی۔ تعلیم نسواں کی حمایت کرنے والے پیشہ ور مقررین یونہی کہتے رہتے ہیں کہ ان پڑھ عورت اپنے بچوں کی تربیت اچھی طرح نہیں کر سکتی۔ علامہ اقبال کی ماں کون سی گریجویٹ تھی۔ قائداعظم کی والدہ کب اعلی تعلیم یافتہ تھی۔ سر سید احمد خان کی ماں کب یونیورسٹی کی ڈگری رکھتی تھی۔
میری ماں ان مشاہیر کی ماؤں سے کم نہیں جس نے سنگین سے سنگین حالات کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اپنے عزم میں سر موفرق نہ آنے دیا اور مجھے اس مقام پر پہنچایا اگر وہ تعلیم

یافتہ ہوتی' اگر اس نے یونیورسٹی کی ڈگری پائی ہوتی تو شاید وہ ہر شے کو عقل کے ترازو میں تولتی۔

اپنی جوانی کو' اپنے دو کمسن بچوں کو' زمانے کے سرد و گرم کو اور یہ فیصلہ کر لیتی کہ میں ان دو ننھے کیڑے مکوڑوں کے لئے اپنی جوانی کیوں برباد کروں۔ میں اپنی خوشیاں ایک موہوم مستقبل پر کیوں نثار کروں۔ شاید وہ عقل کی بات مان لیتی تو دوسری شادی کر لیتی اور ہمیں در در کی ٹھوکریں کھانے کے لئے چھوڑ دیتی۔ لیکن اس نے عقل کی بجائے جذبے سے کام لیا اپنی زندگی کا انتہائی اہم فیصلہ کیا اور ساری عمر اس پر ڈٹی رہی۔ جب تک وہ زندہ ہے وہ میرا آئیڈیل رہے گی۔ عزم و استقلال کی علامت! خدا اسے زندہ سلامت رکھے!!

دوسرا خیال اس کے اپنے مستقبل کے بارے میں تھا۔ اس نے سوچا کہ ایم۔ اے پاس کرنے کے بعد وہ چاہے کچھ بھی کرے' کچھ بھی بنے' کم از کم اپنی ماں کو دوسروں کے برتن مانجھنے نہیں دے گا۔ اس بیچاری کی ضروریات ہی کیا ہیں۔ دو وقت کی روٹی اور ایک جوڑا کپڑے۔ یہ میں ضرور مہیا کروں گا تاکہ وہ کسی کی محتاج نہ رہے۔

پھر اس کو اپنی ماں کی یہ بات بار بار یاد آتی رہی کہ وہ فیصل آباد شہر میں صرف اپنے بچوں کا پیٹ پالنے آئی تھی۔ اس کی اصلی جگہ چک نمبر ۲۳۰ تھی جہاں اس کا گھر تھا۔ اس کا سماج تھا اس کے دوست اور دشمن تھے۔ جب تک وہ وہاں واپس جا کر اپنے گھر کا تالا نہیں کھولے گی اور اپنا مقابلبحال نہیں کرے گی اس کی روح کو سکون حاصل نہیں ہو گا۔ شرفو کو پتہ چلنا چاہئے کہ اس کے ظلم و ستم سے تنگ آ کر طلوع آفتاب سے پہلے گم ہو جانے والی ریشماں واپس بھی آ سکتی ہے۔ انگلی پکڑ کر چلنے والے چار سالہ یتیم بچے کے ساتھ نہیں' بائیس سالہ گھبرو فطرت کے ساتھ' جو اس کی عزت و آبرو کا تحفظ بھی کر سکتا تھا اور اس کے لئے لڑ مر بھی سکتا تھا۔

اس کے علاوہ اسے ذکیہ بہن کی یاد بری طرح ستا رہی تھی۔ اگر آج وہ زندہ ہوتی تو

اپنے بھائی کو دیکھ کر کتنی خوش ہوتی۔ میری مصوری کا مذاق اڑاتی' میری شادی کے قصے گھڑتی پھر ہماری محبت بھری ہاتھا پائی ہوتی اور امی پہلے کی طرح صلح صفائی کروا دیتی۔ کتنا مزا آتا اس چھیڑ چھاڑ اور صلح صفائی میں لیکن حیف ہے میری جوانی اور پڑھائی پر کہ میں ذکیہ کا کھوج نہ لگوا سکا۔ پتہ نہیں کہاں ہو گی وہ کس حال میں ہو گی وہ اس دنیا میں ہے بھی یا نہیں۔

وہ یہ باتیں سوچ کر مغموم ہو گیا۔

انہی خیالوں میں گم فطرت شیخ رفیق کے گھر پہنچا۔ اس کی ماں سرونٹ کوارٹر میں اکیلی لیٹی ہوئی تھی۔ وہ بظاہر آرام کر رہی تھی لیکن در حقیقت جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھ رہی تھی۔ خواب کون نہیں دیکھتا۔ امیر ہو یا غریب' جوان ہو یا بوڑھا خواب ہر کوئی دیکھتا ہے اور اکثر اپنے خوابوں کے سہارے زندگی کا سفر طے کرتا ہے۔

اپنے بیٹے کو یوں اچانک اپنے سامنے پا کر ریشماں نے محسوس کیا کہ شاید اس کے سارے خواب اچانک پورے ہو گئے ہیں۔ اس کا جوان' توانا اور خوبرو بیٹا اس کے سامنے کھڑا تھا۔ تعلیم سے فارغ' مستقبل کی راہ پر گامزن ہونے کو تیار۔ وہ کھری چارپائی سے اٹھی اور اپنے بیٹے کو سینے سے لگا لیا۔ اس کے ملنے کا یہی انداز تھا۔ فطرت چھوٹا ہوا یا بڑا۔ گھر مہینے بعد آئے یا سال بعد۔ وہ اسے یونہی سینے سے لگا لیتی تھی اور اپنے خوشی کے آنسو اپنے دوپٹے کے پلو میں چھپا لیتی تھی۔

"امی آپ کو تو خوش ہونا چاہیے۔ آپ رو رہی ہیں۔"

"میں رو نہیں رہی میرے فطری! یہ خوشی کے آنسو ہیں۔ تیری خوشی کے آنسو۔ بتا ہو گئے تیرے امتحان؟ ختم ہو گئی پڑھائی۔ اب اور جماعتیں تو نہیں باقی؟"

"نہیں امی اب ساری جماعتیں ختم ہو گئیں۔ اب میں کماؤں گا۔ اپنے لئے' تمہارے لئے تمہاری خوشیوں کے لئے۔ اب تجھے نوکری نہیں کرنی پڑے گی۔"

اس نے بڑھ کر فطرت کو ایک بار پھر گلے سے لگا لیا اور وہ دونوں ایک ہی چارپائی پر

بیٹھ کر مستقبل کے منصوبے بنانے لگے۔
ریشماں نے کہا "مجھے یہاں ہر طرح آرام ہے۔ بیگم صاحب تو کہتی ہیں کہ میں زندگی کے باقی دن انہی کے پاس پورے کروں۔ لیکن تمہیں معلوم ہے یہ ہمارا گھر نہیں ہے۔ پندرہ سال گزارنے کے باوجود یہ جگہ ہمارا گھر نہیں ہے۔ ہمارا گھر وہی تین چار کمروں والا کچا کوٹھا ہے۔ جس پر ایک عرصے سے تالا پڑا ہے۔ ہماری کامیابی اس تالے کو کھولنے میں ہے"

URDU4U.COM

"بالکل' بالکل' میں تو یہی فیصلہ کر کے آیا تھا کہ اب آپ کی دیرینہ خواہش پوری کرنے کا وقت آ گیا ہے اب ہمیں واپس گاؤں چلے جانا چاہیے"
شیخ صاحب اور بیگم صاحبہ بہت ضعیف ہو چکے تھے۔ نسرین کی شادی ہو چکی تھی۔ البتہ بوٹا اور فضول ڈرائیور اب بھی ان کے پاس تھے۔ رشتے کی کوئی اور غریب عورت ان کے ہاں مستقل طور پر ٹھہری ہوئی تھی۔ وہ اب بھی ریشماں کو چاہتے تھے لیکن جب اس نے اپنی اور بیٹے کی مشترکہ خواہش کا اظہار کیا اور گاؤں جانے پر اصرار کیا تو شیخ صاحب اور ان کی بیگم مان گئے۔ انہوں نے ریشماں کو ایسی شان و شوکت کے ساتھ رخصت کیا جیسے کوئی اپنی بہو بیٹیوں کو الوداع کرتا ہے' پانچ سو روپے نقد' دو تین جوڑے نئے کپڑے' ایک تھیلا چینی' چائے کی پتی' اور گھر کی کئی چھوٹی چھوٹی چیزیں تحفے کے طور پر دیں۔ کچھ پیسے ریشماں نے اپنی تنخواہ سے بچا کر رکھے ہوئے تھے کیونکہ پچھلے دو سالوں سے فطرت اس سے کچھ نہیں لے رہا تھا۔
شیخ صاحب نے انہیں اپنے گھر سے اپنی کار میں روانہ کیا اور فضل حسین ڈرائیور کو تاکید کی وہ انہیں ان کے گھر تک چھوڑ آئے پکی سڑک کے موڑ تک نہیں' چک نمبر ۲۳۰ میں ان کے گھر تک!

جب سفید کار ٹینا گرد اڑاتی چک نمبر ۲۳۰ میں داخل ہوئی تو اسے دیکھنے کے لئے بہت

سے لوگ گھروں سے باہر نکل آئے۔ گلی کوچوں میں پھرنے والے لوگ اپنی اپنی جگہ رک گئے۔ لڑکے شور مچاتے ہوئے کار کے پیچھے پیچھے بھاگنے لگے اور بڑھے بوڑھے چھتوں

URDU4U.COM

پر چڑھ کر یہ منظر دیکھنے لگے۔

ایک تو چک نمبر ۲۳۰ میں کسی کار کا آنا ہی اچنبھے کی بات تھی کیونکہ اب تک ایک دفعہ یہاں ایک ٹرک نعش لے کر آیا تھا اور دوسری دفعہ جیپ پر تفتیش کرنے والا تھانیدار' ورنہ سڑک سے ادھر والی زمین موٹر گاڑیوں کے پہیوں سے قطعاً مانوس تھی۔

غیر معمولی اشتیاق کی دوسری وجہ ریشماں کی واپسی تھی' کیونکہ اگرچہ وہ گمنامی کی چادر اوڑھ کر گاؤں سے اچانک غائب ہو گئی تھی لیکن ابھی تک اس کا چرچا گاؤں کے گھر گھر میں تھا۔ وہ جانتے تھے کہ وہ خود محنت مزدوری کرتی ہے اور اس کا لڑکا پڑھ رہا ہے۔ انہیں یہ بھی علم تھا کہ فطرت نے پہلے چودہ جماعتیں پاس کی تھیں اب سولہ جماعتیں پاس کرنے والا ہے۔ انہیں اس بات کا بھی احساس تھا کہ اب ریشماں کے دن پھرنے والے ہیں فطرت افسر بننے والا ہے اب وہ چاہے تو شرفو سمیت سارے گاؤں کو آگے لگا سکتا ہے۔

گاؤں والے ان پڑھ سہی اپنا برا بھلا اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ اب انہوں نے حالات کو بدلتے دیکھا تو ریشماں کی خوشامد کرنے لگے اسے نوکرانی کی بجائے' چودھرانی کہنے لگے۔ فطرت کی جوانی اور اعلیٰ تعلیم کی مبارک باد دینے لگے۔ اور تو اور شرفو اور اس کی بیوی بھی رات کے اندھیرے میں معافی مانگنے آئے ریشماں نے انہیں اللہ اور اس کے رسولؐ کے نام پر معاف کر دیا کیونکہ اس کا ایمان تھا کہ انسان کو انسان سے بدلہ لینے کی بجائے اسے خدا پر چھوڑ دینا چاہئے۔ جو سچا اور صحیح انصاف کرنے والا ہے۔

گاؤں میں فطرت عموماً کتاب لئے پلنگ پر لیٹا رہتا اور عورتیں مکھیوں کی طرح اس کی ماں کے گھر بھنبھناتی رہتیں اور طرح طرح کی باتیں کرتی رہتیں۔ روزانہ یہ باتیں سن سن کر فطرت کے کان پک گئے تھے۔ لیکن گھر میں رہتے ہوئے ان باتوں سے مفر

نہ تھا۔

وہ کہتی رہتیں ”سولہ جماعتیں پڑھ گیا ہے‘ ریشماں کا بیٹا‘ اب تو تھانیدار بنے گا۔

تھانیدار“

”نہیں تھانے دار چوہدری نذیر کا بیٹا بھی بن گیا تھا صرف تیرہ جماعتیں پڑھ کر یہ تو پولیس کپتان بنے گا‘ پولیس کپتان۔ تین پھولوں والا!“

URDU4U.COM

”تم نے کہاں دیکھے ہیں تین پھول پولیس کپتان کے“

”پھول خواہ کتنے ہی ہوں‘ پولیس کی وردی سجے گی خواب اس پر‘ باپ کی طرح خوب لمبا نکلا ہے“

اتنے میں کوئی نسبتاً پڑھا لکھا شخص دخل دیتے ہوئے کہتا:

”کیسی جاہلوں والی باتیں کر رہی ہو۔ فطرت نے ایم۔ اے کیا ہے۔ اب یہ مقابلے کا امتحان دے گا۔ سی ایس پی بنے گا‘ ڈپٹی کمشنر لگے گا۔ کیا پتہ اپنے ہی ضلع میں لگ جائے“

اتنے میں ایک اور آواز کا اضافہ ہو جاتا ہے ”اب تو اس کی کار پر جھنڈا بھی ہو گا جدھر سے گزرے گا لوگ راستہ چھوڑ دیں گے دیکھا نہیں تم نے شہر میں۔ چھوٹے لاٹ صاحب آئے تھے تو کتنی پولیس تھی بندوبست کے لئے“

جب فطرت اپنے گاؤں میں رہتے رہتے تنگ آ گیا تو اس کی ماں نے کہا ”جا چار دن اپنی خالہ کے ہاں گزار آ۔ ان کا چک یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔ جب ہم شہر سے نئے نئے آئے تھی وہ گھی‘ شکر‘ کپڑے اور دوسری چیزیں لے کر ملنے آئی تھی اور تاکید کر گئی تھی کہ فطرت کو ضرور بھیجنا۔ تمہاری خالہ ہے سگی خالہ۔ ہاں‘ ادھر ایک تیری بہن بھی ہے سکینہ جس کوم یں نے دودھ پلایا تھا۔ تم اور سکینہ ایک ہی سردیوں میں پیدا ہوئے تھے۔ نوراں بیمار ہو گئی تھی تو میں نے سکینہ کو دودھ پلایا تھا۔ وہ تیری دہری بہن ہے۔ خالہ زاد بہن بھی اور دودھ شریک بہن بھی۔ بیمار سی رہتی ہے۔ اس کا پتہ بھی کر آنا۔ بہت یاد کرتی ہے تجھے!“

فطرت کو خالہ یا خالہ زاد بہن سے ملنے کا کوئی شوق نہ تھا لیکن وہ اپنے گاؤں سے بھاگنا چاہتا تھا۔ کم از کم کچھ عرصے کے لئے تاکہ وہ لوگوں کی فضول باتوں سے بچ سکے۔

URDU4U.COM

وہ اگلے دن خالہ کے گاؤں روانہ ہو گیا اور تین چار دن کی بجائے پورا ایک ہفتہ وہاں رہا۔

ایک رات وہ اپنے گھر میں چارپائی پر لیٹا ہوا تھا۔ ساتھ والی چارپائی پر اس کی ماں آرام کر رہی تھی۔ چاندنی کی وجہ ریشماں نے لالٹین جلد ہی بجھا دی تھی۔ رات کے کھانے کے بعد آنے والے لوگ اپنے اپنے گھروں کو واپس جا چکے تھے۔ چاند کی روشنی بیری کے اونچے درخت سے چھن چھن کر آ رہی تھی اور ان کے صحن میں داغ داغ چاندنی چھائی ہوئی تھی۔ اتنے میں کسی نے ڈیوڑھی کی والی کنڈی زور زور سے کھٹکھٹائی۔ کنڈی کے شور کے ساتھ ریڈیو کی بھی آواز آ رہی تھی۔ فطرت نے اٹھ کر دسروازہ کھولا تو چوہدری احمد خان کا بیٹا عبدالقادر ٹرانسسٹر اٹھائے اندر داخل ہوا اور زور زور سے کہنے لگا۔

"ماسی مٹھائی کھلاؤ' مٹھائی"

"کس بات کی' بیٹے"

"پہلے وعدہ کرو۔ میں گڑ نہیں کھاؤں گا' گاؤں والی ہٹی کی گندی جلیبی بھی نہیں کھاؤں گا' برفی کھاؤں گا۔ شہر کی بنائی' چاندی کے ورق والی"

"بھئی سب ٹھیک ہے کچھ بتاؤ بھی"

"فطرت بھائی جان ایم۔ اے میں پاس ہو گئے ہیں۔ نہ صرف پاس ہو گئے ہیں' بلکہ یونیورسٹی میں فرسٹ آ گئے ہیں۔ میں نے ابھی ابھی خبروں میں سنا ہے۔"

قادر نے ساری بات ایک ہی سانس میں کہہ دی۔

"شکر ہے خدایا تیرا لاکھ شکر" ریشماں نے تاروں بھرے سمان کی طرف دیکھ کر کہا۔

فطرت نے دل ہی دل میں اللہ تعالی کا شکر ادا کیا اور کہا:
"امی' یہ سب تیری دعاؤں کا نتیجہ ہے"
"نہیں بیٹا اللہ نے تیری محنت کا پھل دیا ہے۔ میرا سچا اللہ کبھی کسی کی محنت ضائع نہیں کرتا ریشماں نے کہا "فطری بیٹے' آج تمہاری بہن زندہ ہوتی تو یہ خبر سن کر کتنی خوش ہوتی' تجھ سی مٹھائی مانگتی' نیا جوڑا طلب کرتی' تیری کامیابی کی خبر ساری سہیلیوں کو بتاتی۔ تو تو بھول گیا اسے"

URDU4U.COM

"یہ کیسے ہو سکتا ہے امی! ذکیہ تو میری جان ہے' اس کی گم شدگی نے تو میرا نظریہ حیات ہی بدل گیا ہے۔ ظلم' جبر تشدد اور ناانصافی کے خلاف میرے اندر جو طوفان کھول رہا ہے یہ اسی کا دیا ہوا ہے۔ میں اسے کیسے بھول سکتا ہوں"
اگلے روز جب گاؤں میں یہ خبر پھیلی تو تقریباً سارا گاؤں مبارک باد دینے ریشماں کے گھر آیا۔ آج اس نے مبارک باد وصول کرنے کے لئے دھلا ہوا جوڑا پہن رکھا تھا اور گاؤں والی ہٹی سے بہت سا گڑ' مکھانے اور بتاشے بھی منگوا لئے تھے۔
مبارک بادوں کے ساتھ پھر وہی قیاس آرائیاں دوبارہ شروع ہو گئیں جن سے بھاگ کر فطرت خالہ کے گاؤں چلا گیا تھا۔ اب اس قسم کے جملے اکثر اس کے کانوں میں پڑتے:
"اب ریشمان کے دن پھر گئے۔ بہت بڑا افسر بنے گا اس کا بیٹا۔ قد بت بھی اچھا ہے تعلیم بھی اچھی ہے۔ کوئی بڑا عہدہ ہی پائے گا"۔
"ہم نے تو ریشماں کی ہمیشہ قدر ہی کی ہے۔ اب اس کا بیٹا افسر لگ گیا تو ہمارا بھی خیال رکھے گا"
"اب یہ اس چھوٹے سے مکان میں کیا رہے گا۔ بنگلہ بنوائے گا بنگلہ۔ سڑک کے کنارے دور سے نظر آیا کرے گا۔ فطرت کا اونچا بنگلہ"
"ہم نے تو ریشماں کی ہمیشہ قدر ہی کی ہے۔ اب اس کا بیٹا افسر لگ گیا تو ہمارا بھی خیال رکھے گا"

اگلی صبح فطرت والدہ کی اجازت سے لاہور چلا گیا۔ کیونکہ پروفیسر سعید نے کہا تھا کہ نتیجہ نکلنے کے بعد مجھے ضرور ملنا۔

URDU4U.COM

لاہور پہنچ کر وہ سیدھا اپنے ڈیپارٹمنٹ میں گیا جہاں نتائج کے حالیہ اعلان کی وجہ سے خاصی گہما گہمی تھی۔ کئی دوست باہر لان میں ہی مل گئے۔ تقریباً سبھی نے فطرت کو مبارک باد دی۔ منیر' اشتیاق اور مقبول تو گلے لگ گئے۔
ہم جماعتوں کی مبارک باد لے کر فطرت پروفیسر سعید کے کمرے میں گیا تو وہ اتفاق سے وہاں موجود تھے۔ دراصل مسز شیخ نے تمام استادوں کی باری باری ڈیوٹی لگائی ہوئی تھی کہ وہ روزانہ ڈیپارٹمنٹ جائیں اور نئے اور پرانے طالب علموں کی رہنمائی کریں۔ فطرت کو کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر پروفیسر سعید اپنی کرسی سے اٹھے' گھوم کر میز کی دوسری طرف پہنچے اور فطرت کو گلے لگا کر مبارک باد دی۔ بغلگیر ہوتے وقت انہوں نے فطرت کی پیٹھ پر دو دفعہ تھپکی دی جو ان کے اظہار محبت کا خاص انداز تھا"

فطرت نے بیٹھتے ہی کہا:
"سر آپ کا بہت بہت شکریہ' یہ سب آپ کی رہنمائی کا نتیجہ ہے"
"رہنمائی تو ہم سب کی کرتے ہیں لیکن فرسٹ صرف ایک آتا ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ یہ امتیاز تمہیں نصیب ہوا۔ فطرت میں تمہیں قبل از وقت بتانا نہیں چاہتا تھا لیکن پہلے دن سے ہی مجھے تمہار اندر Non-conformism کی چنگاری نظر آتی تھی۔ روٹین سے ہٹ کر سوچنے کی جھلک' کچھ کر گزرنے کی امنگ' میں نے سوچا تھا کہ یا تو یہ ڈیپارٹمنٹ کی روایتی قیود سے اکتا کر بھاگ جائے گا یا یونیورسٹی میں کوئی پوزیشن حاصل کرے گا' مجھے خوشی ہے کہ تم نے اپنے اندر تخریبی رجحان کو قابو میں رکھا Non-conformism کا خواب استعمال کیا اور یونیورسٹی میں ٹاپ کیا۔ اور وہ بھی اتنے نمبروں سے کہ سالہا سال تک ریکارڈ رہے گا"
"تھینک یو' سر"

"اب کیا ارادہ ہے؟"
"جیسے آپ گائیڈ کریں گے۔"
"پھر بھی تمہارے بھی تو کچھ خواب ہوں گے!"
"خواب کس کے نہیں ہوتے۔ سر' لیکن میرے سارے خواب آرٹ سے وابستہ ہیں۔

URDU4U.COM

صرف آرٹ سے۔ مجھے دو سال پہلے کا لیکچر یاد ہے جو پروفیسر افتخار صاحب نے سال پنجم کے آغاز پر ساری کلاس کو اکٹھا کر کے دیا تھا اور کہا تھا کہ اگر کسی کے خواب کس اور طرح کے ہیں تو وہ مضمون بدل لے۔ میں تو بڑا سوچ سمجھ کر اس طرف آیا تھا میری ایک اور صرف ایک ہی تمنا ہے اور وہ یہ کہ میں پینٹ کروں' اپنی مرضی سے پینٹ کروں' میری پینٹنگ بکیں یا نہ بکیں مجھے کوئی غم نہیں' میری نظر میں آرٹ بکاؤ مال نہیں میں اسے انسانوں کے اندر کے اندوہ' غم' حسرتیں اور مجبوریاں سامنے لانے کا ایک ذریعہ سمجھتا ہوں"
"اور معاشرے کو نظر انداز کر جاؤ گے"
"معاشرہ تو انسانوں سے ہی بنتا ہے نا سر' میں چاہتا ہوں کہ میں انسانوں کے حوالے سے معاشرے کے تضادات' اس کے ستم اور اس کی ناانصافیوں کی عکاسی کروں۔ میں سمجھتا ہوں ایک مصور ان تضادات اور نا انصافیوں کو دور نہیں کر سکتا تو انکی نشاندہی تو کر سکتا ہے"
"Wish you the best of luck.(میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں) ہاں یہ بتاؤ نوکری کے متعلق کیا خیال ہے"
"جی روزی کا کوئی نہ کوئی وسیلہ تو اپنانا ہو گا"
"ہاں اسی لئے میں نے تمہیں بلوایا تھا' ہمارے ڈیپارٹمنٹ میں یہ روایت رہی ہے کہ امتیازی حیثیت پانے والے طلباء اسی ڈیپارٹمنٹ میں لیکچرار بن جاتے ہیں' عارضی تقرری خود مسز شیخ کرتی ہیں پھر اس میں توسیع بھی ہوتی رہتی ہے"
"اگر یہ جو جائے تو بہت اچھا ہے' میں اپنے ڈیپارٹمنٹ میں پڑھاؤں گا تو فارغ وقت میں

پینٹ کروں گا اپنی مرضی کے مطابق۔ ونڈرفل"
"لیکن ابھی اسکا کسی نے ذکر نہ کرنا۔ پہلے مجھے مسز شیخ سے بات کر لینے دو وہ نتھیا گلی گئی ہوئی ہیں' اگلے سنڈے تک آ جائیں گی۔ میں تم سے وعدہ نہیں کرتا لیکن یہ Option (راستہ) ذہن میں ضرور رکھنا"
"تھینک یو سر"

گھر واپس آ کر فطرت اپنی والدہ کو بتائے بغیر نہ رہ سکا کہ اس کی نوکری کا بندوبست ہو گیا ہے۔ ریشماں کا پہلا سوال تھا
"کتنی تنخواہ ہو گی' پتر؟"
"چار پانچ سو روپے ماہوار"
"ہمارے لئے بہت ہے بیٹا"
"نہیں امی' سال بہ سال ترقی بھی ہوتی رہتی ہے۔ تنخواہ بڑھتی رہتی ہے"
"تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے۔ میرے مولا"
"میرے ساتھ لاہور چلو گی۔"
"میری بوڑھی ہڈیوں کو کہاں شہر میں گھسیٹے پھرو گے۔ میں نے تو بڑی مشکل سے اس ڈیوڑھی کا دروازہ کھولا ہے۔ اس پر دوبارہ تالا مت ڈلوانا۔"
اس دلیل کے سامنے فطرت لاجواب ہو گیا۔

اس دفعہ فطرت لاہور گیا تو اس کے دل میں تفکرات کی بجائے حسین تصورات کا بسیرا تھا۔ ایسے تصورت جو عملی زندگی کی شاہراہ پر گامزن ہوتے وقت ہر نوجوان کے دل میں تڑپنے لگتے ہیں' البتہ فطرت دوسرے نوجوانوں سے اس لحاظ سے مختلف تھا کہ اس کے حسین خوابوں کا محور کار' کوٹھی' ٹیلی فون یا زندگی کی دوسری آسائشیں نہ تھیں بلکہ اس کا ذہن پینٹنگ اور صرف پینٹنگ پر مرکوز تھا۔ اس نے پکاسو' سی زین' گوگین' وان گوف' ریمبرانٹ اور دیگر مشہور فنکاروں کی زندگی کا مطالعہ کیا تھا اور اسے معلوم تھا کہ

فن کے پرستاروں کو مالی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے لیکن اسے یقین تھا کہ بیسویں صدی کے دوسرے نصف حصے میں حوالات سولھویں اور سترہویں صدی کی نسبت یقیناً بہتر ہوں گے خاص کر پاکستان میں جہاں آئے دن اکابریں تقریریں کرتے رہتے ہیں کہ یہ آزاد ملک ہے یہاں صنعتکاروں' کاشتکاروں' مزدوروں' طالب علموں' سپاہیوں اور فنکاروں کو اپنے اپنے دائرہ کار میں رہ کر نئے وطن کی تعمیر نو میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا ہے اس ضمن میں ادیبوں' مصوروں اور دانشوروں کو خاص طور پر ان کے فرائض کا احساس دلایا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے ضمیر کے مطابق لکھیں' پڑھیں' پینٹ کریں' جو چاہیں کریں انہیں مکمل آزادی ہے۔

اس کے علاوہ فطرت نے بڑے بڑے لیڈروں کی زبانی یہ بھی سن رکھا تھا کہ "یہ ملک کسی ایک شخص' گروہ یا طبقے کی جاگیر نہیں ہے۔ یہ ملک عوام کا ملک ہے' اس پر سب کے حقوق ہیں اور سب پر اس کے حقوق ہیں" یہ گھر ہے کروڑوں مسلمانوں کا جو اس کے تمام وسائل کے اجتماعی مالک ہیں" ہماری غربت' ہماری دولت' ہماری امنگیں اور ہمارا مقدر مشترک ہے" ایسی باتیں اس نے بھی پچھلے دنوں ۱۴' اگست کی تقریب میں بڑے بڑے مقررین کی زبانی سنی تھیں۔

فطرت نے سوچا کہ جب ہمارے لیڈروں کا انداز فکر یہ ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم آرٹ' زراعت' صنعت' ثقافت غرضیکہ ہر میدان میں ترقی نہ کر سکیں' اسی قومی پس منظر میں اسے اپنے لئے صرف ایک ہی رول نظر آیا اور یہ کہ ایک سچے اور مخلص مصور کی طرح وہ جو کچھ دیکھے گا جو کچھ سوچے گا' جو کچھ محسوس کرے گا اسے کینوس پر منتقل کر کے اہل وطن کو پیش کرتا رہے گا۔ اس نے سوچا کہ جب آئندہ چند روزم یں اسے یونیورسٹی میں لیکچر شپ مل جائے گی تو وہ اپنی مرضی سے نئے نئے کینوس' نئے نئے رنگ اور نئے نئے برش خریدے گا اور اپنے ضمیر کی آواز کے مطابق پینٹ کرنا شروع کرے گا' پھر وہ اپنے فن پاروں کی نمائش کرے گا' داد و تحسین پائے گا'

شہرت ملے گی' نام ہو گا۔ اور یوں تیس چالیس سال بعد جب وہ پیچھے مڑ کر دیکھے گا
تو اسے اطمینان ہو گا کہ اس نے مادی خوشحالی کی بجائے آرٹ کی جو راہ منتخب کی تھی'
URDU4U.COM
وہ غلط نہیں تھی۔
اسے اپنی زندگی کا مشن پورا کرنے کے امکانات بڑے روشن نظر آئے۔ لیڈروں کی سوچ'
نئی مملکت کی ضروریات' یونیورسٹی کی معقول ملازمت اور پینٹ کرنے کے لئے وافر فرصت۔
اور کیا چاہئے اسے!
اس نے لاہور پہنچ کر سابق ہوسٹل کے سپرنٹنڈنٹ میاں صاحب سے رابطہ قائم کیا' انہیں
یونیورسٹی میں متوقع ملازمت کی خوشخبری سنائی اور ان سے درخواست کی کہ وہ چند روز
کے لئے اسے ہوسٹل میں قیام کرنے کی اجازت دے دیں۔ گرمیوں کی چھٹیاں ابھی
ابھی ختم ہوئی تھیں۔ باہر سے لڑکے ابھی آ رہے تھے' آو ابھرتے بھرتے ابھی وقت لگے
گا' میاں صاحب نے ازرہ عنایت اسے ایک ہفتے کے لئے ہوسٹل میں ٹھہرنے کی اجازت
دے دی۔
ہوسٹل میں جگہ ملنے کے بعد پروفیسر سعید سے ملنے یونیورسٹی گیا تو اتفاقاً مس نزہت "ہیلو
فطرت' مبارک ہو' تم نے تو ٹاپ کر لیا یونیورسٹی میں"
"بہت بہت شکریہ' یہ سب آپ کی راہنمائی کا نتیجہ ہے' میں پرسوں حاضر ہوا تھا آپ
تھیں نہیں ڈیپارٹمنٹ میں"
"ہاں' میں آج ہی آئی ہوں۔ اور سناؤ کیسے ہو' سنا ہے ہمارے کولیگ (رفیق کار) بننے
والے ہو"
"جی اگر یہ اعزاز مل جائے تو اور کیا چاہئے' پتہ نہیں مسز شیخ کیا کرتی ہیں۔ آئی ہوئی
ہیں' آج وہ؟"
"ہاں' آئیں تو تھیں لیکن ایجوکیشن ڈیپارٹمنٹ گئی ہیں' انکی ملازمت میں توسیع کا مسئلہ
ہے۔ بس آتی ہی ہوں گیں۔
"اچھا' میرا سلام کہہ دیجئے ان سے' میں پھر حاضر ہوں گا"

© Urdu4U.com

وہ یہ کہہ کر پروفیسر سعید کے پاس گیا' انہوں نے روایتی تپاک کی بجائے سرکاری انداز میں اسے مشورہ دیا کہ ڈیپارٹمنٹ کی بجائے انہیں گھر پر ملے۔ وہ یہ جواب سن کر باہر نکل آیا اور سوچنے لگا کہ گھر پر ملنے کا کیا مطلب ہے۔ کیا اس سے بے تکلفی اور عنایت ٹپکتی ہے یا کچھ گڑ بڑ ہے؟

وہ کئی بار پہلے بھی پروفیسر سعید کے گھر جا چکا تھا' ان کے ہاں چائے پی چکا تھا' ان کی ذاتی لائبریری سے کتابیں مستعار لے چکا تھا۔ ان کا چھوٹا سا خوبصورت گھر کینال پارک میں واقع تھا' اس کا دروازہ نہر کی طرف کھلتا تھا جہاں پانی کو چھو کر جب دوپہر کی تیز لو گزرتی تھی تو بڑی خوشگوار ہو جاتی تھی۔

فطرت شام کو مقررہ وقت پر پروفیسر سعید کے گھر پہنچ گیا تو نوکر نے دروازہ کھول کر اسے ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا۔ وہ کمرے میں بیٹھ کر اس کا جائزہ لینے لگا' اگرچہ پہلے بھی کئی بار اس کمرے میں آ چکا تھا لیکن ذہنی طور پر وہ بالکل فارغ تھا آج اسے اس کمرے میں وہ چیزیں نظر آ رہی تھیں جو پہلے وہ نظر انداز کرتا آیا تھا' مثلاً کارنیس کے اوپر جس پینٹنگ کا خوبصورت پرنٹ فریم کر کے سجایا گیا تھا وہ وان گوف کی بنائی ہوئی تھی' اس کے کونے پر اب بھی وان گوف کے مدھم سے دستخط موجود تھے۔

اتنے میں پروفیسر سعید عینک کا شیشہ صاف کرتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے فطرت احتراماً کھڑا ہو گیا۔

"بیٹھو بھئی۔ بیٹھو' کیا پیئو گے۔ ٹھنڈا یا گرم"

"جی' آپ کی مرضی"

میرے خیال میں گرمیوں میں گرم چائے ٹھنڈک پہنچاتی ہے"

"بالکل بجا۔ لیکن چائے سے پہلے ایک گلاس پانی مل جائے تو"

"کیوں نہیں' کیوں نہیں"

انہوں نے ملازم کو پانی لانے کا کہا اور خود موسم کے ظلم و ستم کا ذکر کرنے لگے کہ

اس دفعہ ستمبر کا مہینہ بھی مئی اور جون کی طرح تپ رہا ہے۔ فطرت نے رائے دی ایک آدھ بارش ہو گئی تو گرمی کا زور ٹوٹ جائے گا۔

URDU4U .COM

فطرت پانی وغیرہ پی کر تازہ دم ہو گیا تو اس نے کہا

"سر، مسز نادرہ شیخ سے بات ہوئی؟"

"ہاں ہوئی"

فطرت سرک کر کرسی کے کنارے پر آ گیا:

"کیا کہا انہوں نے"

"انہیں کچھ ریزرویشن ہے تمہارے بارے میں۔ خلاف توقع وہ مجھے دو تین دن تک ٹالتی رہیں۔ پھر کل انہوں نے مجھے حتمی جواب دیا"

"وہ کیا، سر"

"بس، یہ سمجھ لو کہ یونیورسٹی کی نوکری تمہاری قسمت میں نہیں"

فطرت کو اپنے تصورات کا محل گرتا ہوا نظر آیا۔

"کیا کہا انہوں نے"

"اس سے تمہارا کوئی مطلب نہیں"

"پھر بھی، سر اگر پتہ چل جائے تو شاید میں اپنی اصلاح کر سکوں"

"اصلاح کر بھی لو گے تو مسز نادرہ شیخ تمہیں نوکری نہیں دیں گی"

س "پر کیوں، سر"

"تم اصرار کرتے ہو تو ایک دوست کے طور پر تمہیں بتا دیتا ہوں لیکن ایک شرط پر"

"وہ کیا؟"

"کہ تم اس کا کسی سے ذکر نہیں کرو گے"۔ کیونکہ اصولاً مجھے ڈیپارٹمنٹ کی اندرونی بات کسی کو بتانی نہیں چاہیے"

"مجھے ہر شرط منظور ہے۔ بتایئے تو سہی، سر"

"وہ سمجھتی ہیں کہ تمہارا تعلق، سرخوں، سے ہے اور حکومت آج کل سرخوں کی پکڑ

دھکڑ کر رہی ہے۔ اسے ڈر ہے کہ تمہیں یونیورسٹی میں ملازمت دینے سے کہیں اس کی ملازمت میں توسیع خطرے میں نہ پڑ جائے"

URDU4U .COM

"لیکن سر' میرا سر خوں سے کیا تعلق"

"مسز شیخ کا کہنا ہے کہ دو سالوں میں تم مختلف بحثوں میں جن خیالات کا اظہار کرتے رہے ہو جس طرح کے کینوس پینٹ کرنے کی خواہش کرتے رہے ہو اور ٹی ہاؤس اور حلقہ ادب میں جس قسم کے ادیبوں اور دانشوروں سے ملتے رہے ہو اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ تمہارا رجحان' لیفٹ (بائیں بازو) کی طرف ہے اور اس نظریاتی مملکت کے لئے اشتراکی نظریہ اور اس سے ہمدردی سم قاتل ہے"

"لا حولا ولا قوہ۔ میں اور اشتراکیت' آگ اور پانی' خوشبو اور گندگی' اسلاما ور سوشلزم کیسے یکجا ہو سکتے ہیں' سر' کیا بات کرتے ہیں آپ"

"یہ الزام میں نہیں رکھ دیا' میں آپ کو مسز شیخ کی بات بتا رہا ہوں"

"لیکن' سر' کیا انہیں اس سے سوا گالی یا تہمت میرے لئے نہیں سوجھی"

"یہ تو تم جانو اور مسز شیخ"

"سر' کہیں اس الزام کے پیچھے میری یہ کوتاہی تو نہیں کہ میں نتیجہ نکلنے کے بعد مسز شیخ کی خدمت میں حاضر نہیں ہو سکا' ان کا شکریہ نہیں ادا کر سکا۔ حالانکہ میں نے دو دفعہ کوشش کی تھی اور وہ دونوں دفعہ ڈیپارٹمنٹ میں موجود نہیں تھیں"

"میں اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن انہوں نے مجھے یہی بتایا کہ وہ تمہاری نوکری کی خاطر اپنی نوکری خطرے میں نہیں ڈال سکتیں"

اس گفتگو کے دوران پروفیسر سعید کا ملازم چائے اور بسکٹ والی ٹرے سنٹرل ٹیبل پر رکھ گیا تھا لیکن موضوع کی اہمیت کے پیش نظر اس کی طرف کسی نے توجہ نہ دی فطرت کو یوں محسوس ہوا کہ اس کے تمام منصوبے خاک میں مل جائیں گے اور وہ تصویریں جو اس کے ذہن میں کئی مہینوں سے تڑپ رہی تھیں کبھیکینوس پر منتقل نہیں ہو سکیں

گی۔

"چائے پیو فطرت"۔ پروفیسر سعید نے اسے خیالات کے تانے بانے سے باہر نکال دیا فطرت چپ چپ بیٹھا تھا' چائے سے اس کا دل اچاٹ ہو گیا تھا' لیکن پروفیسر سعید کے کہنے پر وہ اپنے لئے اور اپنے استاد کے لئے چائے بنانے لگا۔

URDU4U.COM

چائے سے فارغ ہو کر فطرت نے کہا

"سر' مجھے اجازت ہے۔ میں جاؤں"

پروفیسر سعید نے فضاؤں میں گھورتے ہوئے متفکرانہ لہجے میں کہا:

"یونیورسٹی کی نوکری زندگی کا آغاز تو ہو سکتا ہے اس کی انتہا نہیں ہو سکتی۔ دل برداشتہ ہو' اللہ تعالی کوئی نہ کوئی اور صورت نکال دے گا"

"مثلاً؟"

میرے ذہن میں ایک Opening (گنجائش) اور بھی ہے لیکن اس کا ذکر کرنا فی الحال قبل از وقت ہو گا"

"پھر بھی۔ کچھ اشارہ ہی' سر"

"دراصل تم ہلکے سے ہلکے امکان کو فوراً حتمی شمل میں دیکھنا شروع کر دیتے ہو' ادھر میں نے کچھ ذکر کیا اور ادھر تم نے اس پر خوابوں کے محل تعمیر کرنا شروع کر دیئے۔ آرٹسٹ ہو' نا آخر۔ خوابوں کی دنیا میں رہنا پسند کرتے ہو"

"جیسے آپ مناسب سمجھیں' سر' میں زور نہیں دوں گا"

پروفیسر سعید نے لمحے بھر کو سوچا' پھر اس نے خیال کیا کہ یونیورسٹی والی نوکری نہ ملنے سے اسے جو صدمہ پہنچا ہے' اگر نئی امید کی مدد سے اسے یاس و حسرت کی موجود فضا سے نہ نکالا گیا تو وہ اور زیادہ غم پسند ہو جائے گا۔

پروفیسر سعید نے کہا اگر تم اسے فی الحال اپنے تک رکھو تو میں نئے امکان کی نشاندہی کر دیتا ہوں'

"جی"

"یہاں امریکن کلچرل سنٹر والے ہر سال ایک آرٹسٹ کو اپنے خرچ پر امریکہ بھیجتے ہیں'

تم نے یونیورسٹی میں ٹاپ کیا ہے' ضرور ان کی نظر تم پر ہو گی"
"سر' اگر مجھ پر سرخہ ہونے کا ٹھپہ لگ چکا ہے تو وہ مجھ پر اپنا پیسہ کیوں ضائع کریں گے"

URDU4U.COM

"وہ اس لئے کہ تم پکے سرخے نہیں ہو۔ بلکہ بقول تمہارے تم کھرے پاکستانی ہو اور اشتراکیت پر لعنت بھیجتے ہو۔ اور میں بھی اس کی تائید کرتا ہوں۔ لیکن امریکی بڑے سیانے ہوتے ہیں وہ ایسے نوجوانوں کی تلاش میں رہتے ہیں جو ابھی زندگی کے دوراہے پر کھڑے ہوں اور حتمی طور پر کسی خاص نظریئے سے وابستہ نہ ہوئے ہوں۔ یقیناً تم ایسے ہی نوجوانوں میں سے ایک ہو اور کوئی بعید نہیں کہ وہ تمہیں دانہ ڈال دیں"
"اگر یہ بات ہے تو مجھے ان کی سازش کا شکار نہیں بننا چاہئے"
"بالکل نہیں بننا چاہئے۔ لیکن تم وسیع مطالعے اور تلخ تجربے کی جس بھٹی سے گزر چکے ہو اس کے بعد اب تم پر کوئی چھاپ نہیں لگ سکتی۔ تم بک نہیں سکتے۔ نہ امریکی ڈالروں کے عوض نہ روسی روبلز کے بھاؤ۔ تم سچے اور کھرے پاکستانی ہو۔ اور مجھے یقین ہے کہ کہیں بھی چلے جاؤ تم خاص پاکستانی رہو گے۔ میں نے تمہارے اندر اپنے وطن کے لئے جذبہ خدمت کے بھڑکتے ہوئے شعلے دیکھے ہیں۔ انہیں کوئی سرد نہیں کر سکتا"

"شکریہ' سر' شکریہ"
پروفیسر سعید کی یہ گفتگو سن کر فطرت کو کچھ حوصلہ ہوا' اس نے کہا:
"سر' پھر مجھے کیا کرنا چاہیے"
"انتظار"
"کب تک"
"مجھے دو تین کی مہلت دو' امریکن کلچرل سنٹر کے مسٹر ڈیوڈ میرے واقف ہیں' میں ان سے بھات کر لوں سوموار کو تم مجھ سے پتہ کر لینا"
فطرت پہلی امید کا جنازہ پروفیسر سعید کے گھر چھوڑ کر ایک نئی امید کی بیساکھی لئے واپس ہوسٹل چلا آیا۔

سوموار کو فطرت نے پروفیسر سعید سے رابطہ قائم کیا تو انھوں نے بتایا کہ امریکن کلچرل سنٹر والے ایک طالبعلم کو ایک سال کے لئے سپانسر Sponsor کرنے کو تیار ہیں بشرطیکہ"

URDU4U.COM

"جی؟" فطرت کو محسوس ہوا کو شاید کوئی اور رکاوٹ پیدا ہو گئی

"بشرطیکہ پنجاب یونیورسٹی سے سرکاری طور پر نامزدگی کا خط انہیں لکھ دیا جائے"

"گویا۔ پھر معاملہ مسز شیخ کے رحم و کرم پر۔"

"اس کی تم فکر نہ کرو۔ میں نے مسز شیخ سے بات کر لی ہے۔ وہ کہتی ہیں کہ اگر میں ان کے سرکاری پیڈ پر چٹھی ٹائپ کروا کر ان کی جانب سے خود دستخط کر کے بھیج دوں تو انہیں کوئی اعتراض نہیں۔ میں آج ہی وہ چٹھی بھیج رہاہوں"

"کتنا وقت لگ جاتا ہے اسے نتیجہ خیز ہونے میں" فطرت نے بیتابی سے پوچھ لیا "اصولی طور پر انھوں نے تین مہینے کا پریڈ رکھا ہوا ہے لیکن کبھی کبھی پہلے بھی بلوا لیتے ہیں' بہتر ہو گا کہ تم تب تک لاہور میں ہی رہو اورمجھ سے رابطہ رکھو"

"ٹھیک ہے سر' تھینک یو سر"

اب اسے یہ فکر لاحق تھی کہ تین مہینے کہاں رہے گا اور کیا کرے گا؟ وہ واپس ہوسٹل پہنچا اور زمانہ طالب علمی کی طرح جوتے اتارے بغیر ننگی چارپائی پردراز ہو کر اگلے تین مہینوں کے متعلق سوچنے لگا۔ حسب معمول' اس کے دونوں ہاتھ اس کی گردن کے پیچھے اور اس کی نگاہیں چھت پر مرکوز تھیں۔ ایک خیال امید کے پرندے کی طرح اس کے ذہن میں اترتا اور پھر یاس کا اشارہ پاتے ہی اڑ جاتا مثلاً پہلے اسے خیال آیا کہ میاں صاحب سے ہوسٹل میں مزید قیام کی مہلت مانگے لیکن پھر اس نے سوچا کہ یہ دوسرے طالب علموں کے ساتھ زیادتی ہو گی' پھر سوچ کی یہ لہر آئی کہ لاہور کے کسی چھوٹے موٹے ہوٹل میں منتقل ہو جائے تو پھر اس سوچ کو خود ہی رد رک دیا کہ اس طرح اخراجات لا محالہ بڑھ جائیں گے جنہیں وہ پورا نہیں کر سکے گا' تیسرا راستہ یہ تھا کہ وہ گاؤں چلا جائے لیکن وہاں تین ماہ تک لوگوں کی باتیں سننا اور طعنے سہنا مشکل ہو

جائے گا پھر امریکہ کے متعلق کئی خیالات مکڑی کے جالے کی طرح اس کے ذہن میں چھانے لگے۔

میری ماں ضعیف اور دمہ کی مریض ہے اگر میرے پیچھے مر گئی تو اسے کون سنبھالے گا' کون دفن کرے گا؟

URDU4U.COM

اگر امریکہ میں قیام کے دوران پڑھائی میں ان کے معیار پر پورا نہ اترا تو میری اور میرے ملک کی سبکی ہو گی۔

کہتے ہیں امریکہ میں عیاشی بہت ہے' کہیں میں بھی عیاشی کا شکار ہو کر اپنا مشن بھول گیا تو

اور

اگر امریکہ جانے والی تجویز کا بھی وہی انجام ہوا جو یونیورسٹی والی ملازمت کا ہوا تھا تو میں کیا کروں گا

وہ فوری طور پر کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکا۔ اٹھ کر کمرے سے باہر برآمدے میں آ گیا۔

یہ کمرہ اوپر والی منزل پر تھا۔ جب اس نے برآمدے میں کھڑے ہو کر نیچے نظر ڈالی تو اسے ہوسٹل کے صحن میں خاصی رونق نظر آئی۔ کئی لڑکے گھاس پر بیٹھے گپ لگا رہے تھے۔ بعض جگہ دو دو تین تین لڑکوں کی ٹولی کبوتروں کی طرح سر جوڑ کر بنچ پر بیٹھی تھی۔ بیت الخلاء اور غسل خانوں کی طرف آمدورفت معمول کے مطابق تھی اور ڈائننگ ہال کے پاس کوے ہڈیوں اور چھچھڑوں پر جھپٹ رہے تھے اور باورچی خانے کا موٹا اور کالا ملازم بخشی' انہیں اڑانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کی ہر ہانک کے بعد کوے دوبارہ تازہ کوڑے کے چھوٹے سے ڈھیر پر آ جھپٹتے تھے۔

اتنے میں چھوٹے سے قد کا ایک لڑکا پاجامہ پہنے پرانے سلیپر گھسیٹتا ہوا کامن روم سے نکلا' دور سے وہ رحمت اللہ لگتا تھا جو پچھلے دو سالوں سے اسی ہوسٹل میں رہ رہا تھا' اگرچہ وہ کیمسٹری کا طالبعلم تھا لیکن ہوسٹل کی جس چار یاری سے فطری گپ لگاتا تھا اس میں رحمت اللہ عرف بکری شامل تھا' فطرت نے زور سے کہا ''بکری بکری'' رحمت

اللہ نے گھوم کر چاروں طرف دیکھا اور دور برآمدے میں فطرت کھڑا نظر آیا وہ چلایا۔
"کیمکل۔ لالہ کیمل" وہ سیدھا فطرت کے پاس اوپر چلا آیا۔
دونوں ایک دوسرے کو دوبارہ ہوسٹل میں دیکھ کر حیران رہ گئے۔ معمول کے مطابق دونوں کو اب تک ہوسٹل کی پناہ گاہ سے نکل کر زمانے کی ریت میں جذب ہو جانا چاہئے تھا لیکن وہ ابھی تک کنارے پر کھڑے تھے۔ رحمت اللہ نے بتایا کہ اس کا ایک پرچہ رہ گیا تھا اس لئے سپلیمنڑی امتحان دے رہا ہے اور فطرت نے اسے مطلع کیا کہ وہ ملازمت کے سلسلے میں میاں صاحب کی عنایت سے ایک ہفتے کے لئے ہوسٹل میں مقیم ہے۔
لیکن اب تو سب لڑکے آ چکے ہیں" رحمت اللہ نے کہا
"میرے بھی سات دن ختم ہونے والے ہیں۔ کل شام کو"
"تم میرے پاس آ جاؤ"
"نہیں یار' تمہارا امتحان ہے' تمہیں ڈسٹرب نہیں کرنا چاہئے اور پھر یہ ہوسٹل کے رولز کے خلاف ہے"
"اگر اتنے ہی قانونی ہو تو محمود کے پاس چلے جاؤ۔ ابھی کل ہی مجھے ملا تھا"
"کہاں ہے وہ؟"
"اس نے ایم۔ اے (پولٹیکل سائنس) کر کے ایف سی کالج میں ملازمت کر لی ہے اور وائی۔ ایم۔ سی۔ اے میں رہتا ہے"
چنانچہ تھوڑی دیر بعد محمود کے پاس گئے وہ تیار ہو کر مال روڈ پر چہل قدمی کرنے کے لئے نکل رہا تھا اپنے پرانے دوستوں کو دیکھ کر کھل اٹھا' انہیں کمرے میں لے گیا مشترکہ دوستوں کی باتیں ہونے لگیں' کون امتحان میں کیسا رہا' شیدا ڈرم فیل ہو گیا۔ عاصم تلنیر فرسٹ کلاس لے گیا۔ ظہیر کتا اپنے مضمون میں ٹاپ کر گیا۔ ابتدائی گپ شپ کے بعد رحمت اللہ نے فطرت کے عزائم اور اس کے فوری مسئلے کا ذکر کیا تو محمود نے خوشی خوشی سے اسے ایک بار پھر اپنا روم میٹ بنا لیا۔

فطرت نے امریکہ جانے کے امکانات کا ذکر کیا اور محمود نے ایف سی کالج میں اپنی نوکری کے متعلق بتانا شروع کیا۔ دونوں ایک دوسرے پر رشک کرنے لگے۔

URDU4U.COM

"اچھا تو پیارے امریکہ جا رہے ہو" محمود نے کہا

"یار، پکا نہیں ابھی تک"

"وہاں میموں کے چکر میں پرانے دوستوں کو بھلا نہ دینا"

"نہیں یار، یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ تم دیکھنا تو سہی کہ کھوٹے پیسے کی طرح ایک سال بعد واپس تمہارے قدموں میں ہوں گا"

"بھئی یہ اب کی باتیں ہیں، امریکہ کا رنگ چڑھ جائے تو اترتا نہیں آسانی سے۔ دیکھنا تم ایک سال کے بعد آؤ گے تو ہائی محمود، بائی رحمت اللہ کہتے پھرو گے"

"چھوڑو یار۔ فطرت فطرت ہی رہے گا خواہ وہ کہیں بھی چلا جائے"

فطرت اگلے دن وائی۔ ایم۔ سی۔ اے میں منتقل ہو گیا۔

خلاف توقع امریکن کلچرل سنٹر والوں نے چار ہفتوں کے اندر اندر سارے انتظامات مکمل کر لئے اور پنجاب یونیورسٹی کو اطلاع دے دی کہ وہ فطرت کو شگاگو انسٹی ٹیوٹ میں ایک سال کے لئے ٹیچنگ اسسٹنٹ شپ دینے کو تیار ہیں۔ دو طرفہ کرایہ اور ایک سال کا قیام خرچ امریکی برداشت کرے گی۔ اسے ۲۷/اکتوبر کو لاہور سے روانہ ہو جانا چاہئے تاکہ یکم نومبر کو شروع ہونے والے سیمسٹر میں شامل ہو سکے۔

جب پروفیسر سعید نے فطرت کو یہ ساری تفصیلات بتائیں اور جی بھر مبارکباد دی تو فطرت اداس ہو گیا۔

"کیوں فطرت، کیا بات ہے، تم پریشان کیوں ہو"

"نہیں سر، کچھ نہیں"

"گھریلو پریشانی ہے کوئی! کیا پرابلم ہے؟"

"کچھ نہیں، سر، شکریہ آپ کی کوششوں کا لیکن"

"لیکن کیا؟"

"لیکن سر، ان چار پانچ ہفتوں میں مجھے ایک نیا خیال ستاتا رہا ہے"

"وہ کیا؟"

"وہ یہ کہ امریکہ کی تو کوئی کلچر ٹریڈیشن (Cultural tradition)

URDU4U.COM

یا تہذیبی روایت ہی نہیں ہے۔ میں وہاں سے کیا سیکھوں گا۔ وہاں صرف ڈالروں کی چمک دمک ہے، میں ڈالروں سے کیا Inspiration لوں گا"

"تم میں ایک سچے آرٹسٹ کی ساری Idiosyncrasies موجود ہیں، لوگ امریکہ جانے کو ترستے ہیں اور تم وہاں جاتے ہوئے اداس ہو رہے ہو، بھئی بیرونی سفر بذات خود ایجوکیشن ہے اور امریکہ میں ایک سال بخدا یہاں کی یونیورسٹی کے دو سالوں سے بہتر ہے، جہاں تک آرٹ کا تعلق ہے تمہیں یہ سن کر حیرت ہو گی کہ دنیا کے نہایت قیمتی فن پارے امریکہ میں محفوظ ہیں"

"وہ کیسے"

"تم وہاں پہنچو گے تو خود جان جاؤ گے یہ بتاؤ گھر بتا دیا"

"نہیں سر، ابھی تو خبر ملی ہے۔ میں کل گاؤں جاؤں گا اور امی کو بتا آؤں گا"

"وہ یقیناً خوش ہوں گی۔ یہ خوشخبری سن کر۔ گڈلک"

پروفیسر سعید نے اسے بہت دی نصیحتوں اور ایک گرم گرم معانقے کے ساتھ رخصت کر دیا

فطرت نے گھر پہنچ کر والدہ کو یہ خبر سنائی تو وہ بہت خوش ہوئی وہ اپنی خوشی اپنے آپ تک محدود نہ رکھ سکی۔ اس نے آتے جاتے کسی سہیلی سے اس کا ذکر کر دیا تو سارے گاؤں میں بات پھیل گئی کہ "ریشماں کا پترا امریکہ جا رہا ہے۔" ریشماں کا فطرت امریکہ جا رہا ہے" بہت سی عورتیں اور مرد مبارکباد دینے ریشماں کے گھر آ گئے، سارا صحن بھر گیا، ایک دو چار پائیاں اندر سے لا کر بچھانا پڑیں، ابتدائی مبارکبادوں اور "بہت بہت مبارک ماسی ریشماں" کے ڈائیلاگ ختم ہوئے تو اس قسم کی گفتگو

ہونے لگی:

"اللہ دیتا ہے تو چھپڑ پھاڑ کر دیتا ہے"

"بس ریشماں کے تو بھاگ جاگ اٹھے ہیں"

"دوسروں کی اولاد دسویں جماعت تک نہیں پہنچتی' ریشماں کا پتر امریکہ جا رہا ہے"

URDU4U.COM

"واپس آ کر اور بڑا افسر لگ جائے گا اور بڑا"

"گاؤں کی سڑک پکی کروا دے گا"

یہ باتیں سن سن کر فطرت کے کان پک گئے' اسے کوئی راہ فرار نظر نہیں آ رہی تھی ورنہ وہ اٹھ کر بھاگ جاتا۔ خدا خدا کر کے یہ غیر ذمہ دارانہ گفتگو ختم ہوئی ' لوگ اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہوئے اور فطرت اور اس کی ماں اکیلے رہ گئے۔

موقع کو غنیمت جانتے ہوئے ریشماں نے کہا

"پتر' میری ایک ہی خواہش رہ گئی ہے"

"جی امی جی"

"میں چاہتی ہوں کہ امریکہ جانے سے پہلے تمہارا نکاح کر دوں"

"واہ امی' واہ' اندھے کو اندھیرے میں بہت دور کی سوجھی"

"مجھے نہیں پتہ کہ تو کیا کہہ رہا ہے لیکن بہن کنیز میرے کان میں دو دفعہ کہہ چکی ہے کہ گھبرو بیٹے کو نکاح کئے بغیر امریکہ نہ جانے دینا۔ ادھر سفید چمڑی والی میمیں قابو کر لیتی ہیں مردوں کو۔ خاص کر کنوارے مردوں کو"

"کیا بات ہے امی آپ کی اور آپ کی ایڈوائزرر ماسی کنیز کی۔ تمہارا بیٹا کوئی ایسا ویسا نہیں ہے جس پر کوئی ڈورے ڈال لے اچھا یہ بتا ایک سال کا خرچہ تو ہے نا تمہارے پاس یا کچھ بندوبست کرتا جاؤں"

"نہیں بیٹے میری فکر نہ کر تو۔ اب تو کچھ نہ کچھ زمین سے بھی آ جاتا ہے۔ محنت مزدوری کا بچا کھچا بہت ہے۔ شیخ صاحب والے پانچ سو روپے تو اسی طرح رموال میں بند پڑے ہیں۔ میں نے ایک پیسہ بھی ان میں سے خرچ نہیں کیا۔ بلکہ اگر کرایہ بھاڑا

چاہئے تو دو چار سو مجھ سے لے یجانا"
"نہیں امی' کرایہ وغیرہ سب ان کو ذمے ہے جو مجھے بھیج رہے ہیں"
"اللہ انہیں بھاگ لگائے بڑے اچھے مسلمان ہوں گے وہ"

URDU4U.COM

"امی' تمہارے خیال میں ہر اچھا شخص مسلمان ہی ہوتا ہے"
اس میں کیا ہرج ہے بیٹے۔ تو میری باتوں پر وکیلوں والی جرح نہ کیا کر' اچھا سو جا اب"

شکاگو جانے کے لئے فطرت پہلی بار ہوائی جہاز میں بیٹھا۔ وہ لاہور سے ایک اندرون ملک پرواز کے ذریعے کراچی پہنچا اور پھر وہاں سے پی کے ۲۰۷ پر امریکہ روانہ ہوا۔ اس پرواز میں خوبی یہ تھی کہ دوبئ میں مختصر شاپ اوور کے بعد صرف فرینکفرٹ میں رکتی تھی وہ بھی فضائی ایندھن وغیرہ لینے کے لئے۔ ورنہ اس کی منزل کراچی سے براہ راست نیو یارک تھی۔

فطرت بوئنگ طیارہ میں سوار ہوا تو اسے وہاں کا ماحول عجیب سا لگا۔ ائیرہوسٹس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی لیکن بالکل سطحی جیسے بطخ کے پروں پر بارش کے قطرے۔ ان فضائی میزبانوں کے متعلق اس نے بہت سن رکھا تھا کہ وہ فضائی پریاں ہوتی ہیں کوہ قاف کی سیر کرتی ہیں' شہزادوں کے ہمراہ بلندیوں پر مسکراتی رہتی ہیں اور جب زمین پر اترتی ہیں تو پھر مٹی کی ٹھوس اور عام سی لڑکیاں بن جاتی ہیں' فطرت کو اکانومی کلاس کی کوئی ائیر ہوسٹس کوہ قاف کی پری نہ لگی' شاید وہ خود شہزادہ نہیں تھا اور وہ صرف شہزادوں کو پریاں لگتی تھیں۔

کراچی سے پرواز شروع ہوئی تو فطرت کا دھیان کھڑکی سے باہر تھا' اسے بحیرہ عرب واضح طور پر نظر آ رہا تھا' شروع شروع میں اس پر کچھ بحری جہاز اور لانچیں بھی دکھائی دیں لیکن جونہی جہاز بلندی پر پہنچا' یہ چیزیں نظروں سے اوجھل ہو گئیں۔ پھر فطرت کی توجہ کا مرکز وہ مسافر بنے جو سارڈین کی طرح بوئنگ کے پیٹ میں ٹھونسے گئے تھے۔ ایک کے پیچھے دوسرا' دوسرے کے پیچھے تیسرا' رنگ برنگی سیٹوں کے بیچوں بیچ مسافروں

© Urdu4U.com

کے صرف سر نظر آ رہے تھے۔ باقی سارا جسم چھپا ہوا تھا جس جگہ فطرت کو سیٹ ملی وہاں اونچے طبقے کے لوگ بیٹھے تھے۔ کاروباری لوگ' بڑے بڑے افسر' غیر ملکی مسافر' یہ سب لوگ گم سم تھے جیسے انہیں تہذیب جدید سونگھ گئی ہو وہ اگر بات کرتے تھے تو صرف ہوائی جہاز کے عملے سے' آپس میں گفتگو ممنوع لگتی تھی۔ بلکہ فطرت یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ جب اس نے ایک انگریزی رسالہ پڑھ کر ساتھ والی خالی سیٹ پر رکھا تو اس کے پاس ہی بیٹھے دوسرے مسافر نے فطرت کو یہ کہنے کی بجائے کہ "بھائی صاحب' رسالہ فارغ ہے تو دیجئے" ہاتھ لمبا کر کے ایک بٹن دبایا جس کے جواب میں ایک ائیر ہوسٹس اپنا کام کاج چھوڑ کر حاضر خدمت ہوئی اور موصوف نے اسے کہا: "May I have that magazine please" (کیا میں وہ میگزین دیکھ سکتا ہوں) خاتون نے رسالہ اٹھا کر اسے تھما دیا۔

فطرت سوچنے لگا کہ شائد فضائی سفر کی اقدار زمینی سفر کے آداب سے مختلف ہوتی ہیں' مسافروں کے درمیان سب سے بے تکلفانہ گفتگو شائد تانگے' بس یا ریل کے تھرڈ کلاس کے ڈبے میں ہوتی ہے جو لوگ کسی تعارف کے بغیر ایک دوسرے کے معاملات میں دلچسپی لینے لگتے ہیں اور جوں جوں مسافروں کا درجہ بلند ہوتا جاتا ہے انسانوں کا باہمی تعلق کمزور پڑ جاتا ہے اور پھر وہ Throught prpper channel بات کرنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ فطرت کو گفتگو کا یہ طریقہ مصنوعی اور انسانی جذبات سے عاری لگا لیکن اس نے کونسا روز روز ہوائی سفر کرنا تھا۔ بس ایک یہ سفر اور ایک سال بعد انشاء اللہ واپسی سفر اور بس! ہوائی جہاز والے لے جانیں اور ہوائی سفر کرنے والے جانیں۔

دوبئی کے شاپ اوور کے بعد جہاز فضا میں بلند ہوا تو فطرت نے اپنے پاؤں میں پڑا ہوا سفری بیگ کھولا اور اس میں ٹالسٹائی کی کتاب "وار اینڈ پیش" نکال کر پڑھنے لگا۔ وہ ایک تہائی پہلے ہی پڑھ چکا تھا اور وہ اس کے دلچسپ ترین حصے پر پہنچنے والا تھا۔ وہ ائیر ہوسٹوں اور مسافروں کو بھول کر ٹالسٹائی کی دنیا میں گم ہو گیا۔

جہاز فرینکفرٹ رکا تو فطرت کتاب بند کر کے اپنی سیٹ سے اٹھا اور دوسرے مسافروں

© Urdu4U.com

کے ساتھ چھتی ہوئی لمبی سیڑھی سے اترتا ہوا ٹرانزٹ لاؤنج (Transit Lounge) میں پہنچ گیا جہاں مقامی عملے کی اجازت اور رہنمائی میں وہ ہوائی اڈے کی سیر کرنے لگا۔ اتنا بڑا ہوائی اڈہ اس نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ لوگ سینکڑوں بلکہ ہزاروں کی تعداد میں آ جا رہے تھے' خود کار سیڑھیاں مسافروں کو کبھی اوپر اور کبھی نیچے لے جا رہی تھیں' انٹر کام پر کئی اعلان ہو رہے تھے جو فطرت کی سمجھ سے بالا تھی۔ فطرت گھومتا پھرتا ایک بک سٹال پر پہنچ گیا جہاں بڑی خوبصورت کتابیں اور رسائل آویزاں تھے۔ وہ وہیں کھڑے کھڑے ان کی ورق گردانی کرنے لگا۔

جب وہ واپس جہاز میں پہنچا تو اس نے اسکیچ بک کھولی۔ اس کا خیال تھا کہ جہاز کی کھڑکی میں سے ہوئی اڈے کی گہما گہمی اور انسانوں کی باہمی لا تعلقی پینٹنگ کا اچھا موضوع بن سکتی ہے۔ اس کا اسکیچ ابھی بنا لینا چاہیئے اسے بعد میں ڈویلوپ (Develop) کیا جا سکتا ہے وہ بمشکل اس کی آوٹ لائن بنا چکا کہ جہاز کا دروازہ بند ہو گیا۔ ابتدائی اعلانات کے دوران اس نے جلدی جلدی باقی تفصیلات اسکیچ میں محفوظ کیں اور جہاز ٹیکسی کرنے لگا۔

جہاز اڑ چکا تو فطرت نے اپنی سیٹ پر بیٹھے بیٹھے سامنے کی سیٹوں اور ان پر ابھرے ہوئے گنجے سروں کا اسکیچ بنانا شروع کر دیا۔ اب اسے کوئی جلدی نہ تھی کیونکہ سب لوگ اپنی اپنی جگہ پر منجمد ہو چکے تھے اور جہاز کی روشنی گنجے اور چمکدار سروں کو اور چمکدار بنا رہی تھی۔

ایک آدھ سر جس پر بال تھے گنجے ہائے گرانمایہ میں عجیب لگ رہا تھا ایک سر پر بہت سے بال تھے جیسے کسی شاعر یا مصور کے سر پر ہوتے ہیں۔ اس نے سوچا یہ ضرور وگ ہو گی جو کسی خاتون یا مرد نے اپنے سر پر سجا رکھی ہو گی۔ سردست عورت اور مرد میں تمیز کرنا مشکل تھا۔

بہر حال جہاز اڑتا رہا اور وہ مصنوعی روشنی میں اسکیچ مکمل کرتا رہا۔ جہاز کی کاک پٹ

سے آواز آئی کہ میں جہاز کا کیپٹن بول رہا ہوں اور آپ کو فلائٹ انفارمیشن دے رہا ہوں، ہم بحر اوقیانوس کے اوپر سے گزر رہے ہیں، ہماری دائیں جانب انگلستان ہے۔ راستے میں موسم صاف اور خوشگوار ہے، کچھ دیر کے بعد آپ اسی جانب گرین لینڈ دیکھ سکیں گے۔

جب تک فطرت دائیں جانب جھک کر دیکھا انگلستان اس کی نظروں سے اوجھل ہو گیا لیکن گرین لینڈ کو وہ ضرور دیکھنا چاہتا تھا کیونکہ سکول کے زمانے میں وہ دنیا کا نقشہ بناتے وقت وہ گرین لینڈ کو ہمیشہ اوپر نیچے کر دیتا تھا۔ کبھی آئس لینڈ کی طرف اور کبھی کینیڈا کی طرف۔ آج وہ اس کا اصلی مقام دیکھنا چاہتا تھا۔ تھوڑی دیر بعد اسے دائیں جانب ایک بے آب و گیاہ ویران علاقہ نظر آیا جیسے اپنا بلوچستان۔ کیا یہ گرین لینڈ ہے اس میں سبزے کا نام و نشان نہیں، اس نے سوچا ممکن ہے وہ غلطی پر ہو۔ اس نے ساتھی مسافر سے تصدیق کرانا چاہی تو اس نے فائل پر سے بادل نخواستہ نظر اٹھائی، اپنی عینک کے شیشوں کے اوپر سے اس گستاخ کی طرف دیکھا اور کہا "یس"

فطرت کو یوں محسوس ہوا جیسے اس نے زندگی کی سب سے بڑی غلطی کر دی ہو جب جہاز گرین لینڈ سے آگے بحراوقیانوس کی وسعتوں پر پرواز کرنے لگا تو رفتہ رفتہ سورج نے ساتھ دینا چھوڑ دیا جو جہاز کے ساتھ ساتھ مشرق سے مغرب کی طرف سفر کر رہا تھا۔ کچھ دیر بعد جہاز کی اکثر اندرونی بتیاں بند کر دی گئیں اور لوگ سیٹیں پیچھے کی طرف پھیلا کر نیم دراز ہو گئے۔ فطرت نے ٹالسٹائی کی کتاب دوبارہ کھول لی اور اسکا بغور مطالعہ کرنے لگا۔

تھوڑی دیر بعد ایک ایئر ہوسٹس خاموشی سے آ کر اس کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گئی اور رازداری کے لہجے میں کہنے لگی "معاف کیجئے سر، ایک بات پوچھوں"

"پلیز"

"آپ آرٹسٹ ہیں؟"

"جی آرٹسٹ بننے کی کوشش کر رہا ہوں۔ فرمایئے؟"

"آپ میرا پورٹریٹ یا اسکیچ بنا دیں۔ میں مشکور ہوں گی اور اسے یادگار کے طور پر رکھوں گی' میری بڑی پرانی خواہش ہے ہاتھ سے تصویر بنوانے کی"

URDU4U.COM

"لیکن اس وقت ممکن نہیں۔ اس کے لئے وقت درکار ہوتا ہے"

"مجھے معلوم ہے سر' انسان کو ماڈل کے طور پر کافی دیر سامنے بیٹھنا پڑتا ہے میں اس کے لئے تیار ہوں۔ مسافر اب سوگئے ہیں' صبح کو کہیں کینڈا کا ساحل کے پاس جا کر جاگیں گے' آپ اتنے میں پورٹریٹ نہیں تو میرا اسکیچ بنا دیجئے"

"کوئی اور آرٹسٹ ہوتا تو شائد بنا دیتا لیکن میرے لئے ممکن نہیں۔ وقت"

"میں نے کہا' نا میرے پاس وقت ہے"

"بی بی۔ میری نظر میں اسکیچ یا پورٹریٹ انسانی چہرے کو نظر آنے والے خدوخال کا نہیں بنتا۔ پوری شخصیت کا بنتا ہے"

"تو میں کھڑی ہو جاتی ہوں"

"میرا مطلب پورے قد کا نہیں۔ پوری شخصیت کا ہے۔ میرے خیال میں چہرے کے نقش تو درکنار' چہرے کی رگیں اور نسیں پہچان لینا بھی کامیاب پورٹریٹ کے لئے کافی نہیں اس کے لئے انسان کی مجموعی شخصیت کو جاننا اور پہچاننا ضروری ہے اور جب یہ اندر کی پرسنیلٹی اپنے آپ کو چہرے کے آئینے میں ریلیز کرتی ہے تو پورٹریٹ کا صحیح سبجیکٹ سامنے آتا ہے۔ صرف ناک نقشہ نہیں"

یہ باتیں ائر ہوسٹس کی سمجھ سے بالا تھیں وہ اکتا کر اٹھ کھڑی ہوئی لیکن جاتے جاتے عادتاً ایک آدھ مسکراہٹ چھوڑ گئی۔

اگلی صبح جب جہاز نیو یارک اترنے لگا تو فضا سے فطرت کو یہ شہر کانٹوں کی بستی لگا اس کی اونچی اونچی عمارتیں خار مغیلاں کی طرح سر اٹھائے کھڑی تھیں' اس نے سوچا کانٹوں کے اس شہر میں رہنے والوں کا پتہ نہیں کیا حال ہو گا۔

اگرچہ نیویارک سے شکاگو جانے والی فلائٹ میں دو گھنٹے تھے' لیکن فطرت نے اجنبی شہر

میں اکیلے آوارہ گردی کرنا مناسب نہ سمجھا‘ اسے ڈر تھا کہ کہیں شگاگو والی فلائٹ رہ نہ جائے۔ چنانچہ اس نے یہ وقت نیویارک ایئرپورٹ پر ہی گزار دیا اور اگلی فلائٹ سے شام کو شگاگو پہنچ گیا۔

URDU4U.COM

شگاگو انسٹی ٹیوٹ آف آرٹ دیکھ کر فطرت کی آنکھیں کھل گئیں۔ اس نے محسوس کیا کہ ہمارے ہاں (پاکستان میں) فنون لطیفہ کم تعلیم درحقیقت نرسری کلاس کی حیثیت رکھتی ہے اور ماحول بھی نرسری کلاس کا ہوتا ہے یعنی ایک ہیڈ مسٹریس یا ہیڈ آف دی ڈیپارٹمنٹ تھانیدار کا کردار ادا کرتے ہے اور نظم و ضبط یا ڈسپلن کے نام پر عجیب بوجھ سا ماحول پیدا کر دیتی ہے۔ جبکہ یہاں پڑھنے اور پڑھانے والے دونوں طبقوں کو بالغ سمجھا جاتا ہے اور ان کے ساتھ بالغوں جیسا سلوک کیا جاتا ہے۔ نہ کلاس میں جھاڑ پڑتی ہے نہ جرمانہ ہوتا ہے اور نہ ہی کلاس سے خارج کرنے کی دھمکی دی جاتی ہے بلکہ بڑا کھلا ماحول ہوتا ہے جس پر مغز لیکچر دیئے جاتے ہیں۔ کھل کر بحث کی جاتی ہے اور اپنی رائے کا آزادانہ اظہار کیا جاتا ہے۔

شگاگو انسٹی ٹیوٹ میں دوسری چیز جس نے اسے متاثر کیا وہ نادر فن پاروں کا ذخیرہ تھا۔ یہ صحیح ہے کہ ان پاروں میں سے بہت کم فن پارے امریکی آرٹسٹوں کے بنائے ہوئے تھے اور جو ان کے برش کے مرہون منت تھی بھی‘ ان کی قدر و منزلت یورپی فن پاروں کے مقابلے میں بہت کم تھی۔ لیکن اپنی جگہ یہ بات باعث اطمینان تھی کہ فطرت یورپ کے جن نادر شاہکاروں کے متعلق پڑھتا آیا تھا یا ان کی پھیکی سی تصویریں کتابوں میں دیکھتا آیا تھا وہ اپنی اصلی حالت میں یہاں آرٹ گیلری میں موجود تھے ان میں رول ڈیوفی کا "آرکسٹر اوتھ سنگر" مونے کی Water liles‘ سوتا (Seurat) کی Afternoon A Sun day خاص طور پر قابل ذکر تھیں۔

جس گروپ میں فطرت شگاگو گیا تھا اس میں دوسرے ممالک کے طلبہ بھی شامل تھے

مثلاً جاپان' تھائی لینڈ' ہندوستان' ترکی' اٹلی اور فرانس وغیرہ۔ فارغ وقت میں یہ طالب علم اپنی اپنی گپ علیحدہ بھی لگا لیتے اور امریکیوں کے متعلق اپنے بغض یا تعصب کا برملا اظہار کرتے۔ مثلاً ایک مرتبہ فطرت نے اپنے جاپانی ساتھی سے کہا۔

URDU4U.COM

"ہمارے ہاں تو امریکہ کی بڑی پہچان اس کی سڑی ہوئی گندم اور دمکتے ہوئے ڈالر ہیں۔ یہاں آ کر پتہ چلا کہ یہ صنعتی لحاظ سے ہی آگے نہیں آرٹ کے لحاظ سے بھی مالا مال ہے"

"یہ سب دوسری جنگ عظیم کے فتوحات کا نتیجہ ہے۔ جب یورپ میدان جنگ بنا اور آخری فتح روس' انگلینڈ اور امریکہ کو حاصلف ہوئی تو یہ فاتح ملک یورپ کے فن پارے بھی وہاں سے لے آئے۔ سب سے بڑا ہاتھ امریکہ نے مارا۔ سب سے بڑا فاتح جو ٹھہرا"

"گویا تلوار اور توپ کی زد سے آرٹ بھی محفوظ نہیں رہا"

"جب اور کچھ محفوظ نہیں تھا تو آرٹ کیسے محفوظ رہتا۔ حالانکہ توپ و تفنگ کا استعمال 'محفوظ' کرنے کے بہانے ہی کیا جاتا ہے۔ اپنی اقدار کو بچانے اور محفوظ کرنے کے لئے' اپنی قیمتی اداروں کو محفوظ کرنے کے لئے' اپنے طرز حیات کو محفوظ کرنے کے لئے۔ لیکن اس حفاظتی قدم' کا جو نتیجہ نکلتا ہے وہ ہم سب کے سامنے ہے"

"ہاں' جاپان سے زیادہ اس بات کا کس کو علم ہو گا"

شکاگو انسٹی ٹیوٹ کا اپنا کاروبار ہفتے میں صرف چار دن ہوتا تھا۔ یعنی سوموار سے لے کر جمعرات تک۔ جمعہ کا دن آرٹ گیلریاں دیکھنے کے لئے مخصوص تھا۔ ہفتہ اور اتوار چھٹی ہوتی تھی جس کے دوران طلبہ و طالبات علیحدہ علیحدہ یا چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں دوسرے شہروں میں آرٹ گیلریاں دیکھنے چلے جاتے تھے۔ فطرت نے ان "غیر نصابی" سرگرمیوں میں گہری دلچسپی اور چند مہینوں کے اندر اندر مقامی آرٹ گیلریوں کے علاوہ کلیولینڈ' فیلیڈلفیا' سیکرامنٹو اور دوسرے شہروں کی آرٹ گیلریاں دیکھ لیں۔

یہ آرٹ گیلری دیکھ دیکھ کر فطرت کا زاویہ نگاہ بہت وسیع ہو گیا اور اس نے اس دوران

کئی نئی باتیں سیکھیں۔ مثلاً اسے پنجاب یونیورسٹی میں سکھایا گیا تھا کہ پینٹنگ کو ہمیشہ دور سے دیکھنا چاہیئے تا کہ تصویر اپنا مکمل تاثر دیکھنے والے تک پہنچا سکے۔ یہاں اس نے فن پاروں کو قریب سے دیکھنے اور پرکھنے کی عادت ڈالی۔ یہاں سوغا (Seurat) کے قیمتی شاہکاروں کا قریبی تجزیہ کرنے کے بعد اس پر انکشاف ہوا کہ اس عظیم فنکار کا کمال یہ ہے کہ وہ برش کی مدد سے کینوس پر پینٹ نہیں تھونپتا کینوس پر چھوٹے چھوٹے نقطے بناتا ہے۔ مشرق کی مینا کاری کی طرح اور پھر یہ نکتے باہم مل کر رنگ یا ماحول تشکیل دیتے ہیں اور پھر وہ ان نقطوں کے گرد ملتے جلتے رنگ استعمال کر کے تصویر کو اجاگر کرتا ہے جس کے لئے سخت ذہنی ڈسپلن درکار ہوتا ہے۔

اس کے برعکس وان گوف کیThe starry night کے مطالعے کے بعد اسے پتہ چلا کہ دو سوغا کی طرح ٹھہر ٹھہر کر نقطہ بہ نقطہ پینٹ نہیں کرتا بلکہ اپنے جذبات کی شدت کے ساتھ تیز تیز برش پھیرتا ہے۔ جیسے وہ برش کے ذریعے اپنے بے لگام جذبات کینوس پر پھینک رہا ہو۔

ان آرٹ گیلریوں میں اسے پال گوگین کی"The Day of God" بہت پسند آئی کیونکہ یہ تصویر ایک مغربی آرٹسٹ نے مشرقی روایت میں بنائی تھی۔ اس کے علاوہ اسے پہلے مرتبہ ولیم ڈی کوننگ کی تجریدیت پر مبنی pink angels بڑے اور اصل سائز میں دیکھنا نصیب ہوئی۔

شکاگو انسٹی ٹیوٹ آف آرٹ کے طریقہ تدریس کی ایک اہم خوبی آرٹ کے متعلق فنی مباحثے تھے جن میں نسل، مذہب یا ملک کے امتیاز کے بغیر تمام طلبا و طالبات کھل کر حصہ لیتے تھے۔ فطرت یہاں بھی پیش پیش تھا۔

ایک دن موضوع بحث تھا "آرٹ کی تحریکیں" فطرت کو بحث کا آغاز کرنے کو کہا گیا اس نے کہا:

"ہم سب نے پڑھا ہے کہ آرٹ کی تاریخ میں بہت سی تحریکیں پیدا ہوئی ہیں پروان چڑھیں اور پھر ڈوب گئیں۔ درحقیقت آرٹ کی تاریخ ان تحریکوں کے ذریعے ہی آگے

بڑھی۔ ایک بنیادی سوال یہ ہے کہ آیا تحریکیں مخصوص اقتصادی' روحانی' سماجی یا سیاسی حالات کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں یا ان کے محرک خود آرٹسٹ ہوتے ہیں۔ یعنی کیا یہ کہنا درست ہے کہ کسی دور میں ایک آرٹسٹ اٹھا اور اس نے شعوری طور پر یہ کوشش کی کہ وہ آرٹ کی کوئی نئی جہت دریافت کرے اور اس کے بعد اسی آرٹسٹ کے طفیل نئی تحریک آگے بڑھنے لگی۔ یا آرٹسٹ عصری روح کے اظہار کے لئے ایک ذریعہ یا آلہ کار بنا۔ اسی موضوع سے متعلق دوسرا سوال یہ ہے کہ آرٹ کی زیادہ تر تحریکیں کاص کر عہد جدید کی تحریکیں مغرب ہی سے کیوں اٹھتی رہیں۔ خاص کر فرانس اور اٹلی سے"

جاپانی طالبہ مس کے (Kay) درمیان ہی میں بول پڑی

"میں یہ ماننے کو تیار نہیں کہ آرٹ کی تحریکیں ہمیشہ مغرب سے اٹھتی رہیں میرے ملک جاپان کو لے لیجئے آرٹ میں اس کی روایت قدیم بھی ہے اور جدید بھی"

ہندوستانی طالب علم شرمانے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کہا

"آپ ہندوستان کو بھول رہے ہیں جو آرٹ کا قدیم گہوارہ ہے
مغل آرٹ منی ایچر آرٹ"

فطرت نے بات کاٹتے ہوئے کہا

"آپ مغل آرٹ یا منی ایچر آرٹ کو ہندوستان کے کھاتے ہیں نہ ڈالئے ہندو آرٹ تو صرف دیوتاؤں اور دیویوں کی مورتیاں بنانے تک محدود رہا ہے۔ منی ایچر آرٹ مغلوں کے دور میں پروان چڑھا اور یہ مسلمان کے ثقافتی سرمائے کا حصہ ہے جس پر پاکستان بجا طور پر فخر کرتا ہے۔"

شرمانے فطرت کو لاجواب کرنے کے لئے کہا

"بھئی اسلام کا فائن آرٹس سے کیا تعلق؟ اسلام تو فنون لطیفہ کو کفر قرار دیتا ہے کفر"

فطرت کو یہ الزام سن کر گویا آگ لگ گئی۔ اس نے تڑپ کر کہا

"مسٹر شرما' آرٹ یا نو آرٹ(Art or no art) میں اپنے مذہب اور اپنے ملک کے خلاف

 © Urdu4U.com

ایک لفظ بھی سننا نہیں چاہتا۔ اگر تم نے اس علمی اور فنی بحث کو سلام اور ہندو ازم کی بحث میں بدلنے کی کوشش کی تو یہاں ہندوستان اور پاکستان کی جنگ ہو جائے گی"

URDU4U.COM

امریکی استاد اڈلے نے کہا

"مسٹر فطرت' اپنے جذبات کو کنٹرول میں رکھو۔ یہ علمی بحث ہے میدان جنگ نہیں"

"آپ کا کہنا بجا ہے سر' لیکن میں اسلام اور پاکستان کے بارے میں شدید جذباتی ہوں اورمجھے اس بارے میں جذباتی ہونے پر کوئی شرم نہیں۔ آپ چاہیں تو مجھے اس کورس سے نکال دیں۔ مجھے قبل از وقت واپس بھیج دیں لیکن میں اپنے دین اور اپنے وطن کے خلاف ایک لفظ نہیں سن سکتا"

امریکی استاد نے کمال مہارت سے بحث کا رخ ہی بدل دیا۔

اسی ہماہمی اور گرما گرمی میں یہ ایک سالہ کورس چلتا رہا اور فطرت اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا رہا۔ وہ عام رویئے میں بہت ملائم اور خوش اخلاق تھا۔ استاد تو استاد طلبا سے بھی احترام کے ساتھ پیش آتا۔ ہر ممکن طریقے سے ان کی مدد کرتا۔ کوئی کتاب مانگتا کتاب دے دیتا۔ کوئی آرٹ گیلری تک ساتھ چلنے کو کہتا تو ساتھ چل پڑتا۔ لیکن اسلام اور پاکستان کے خلاف ذکر آتا تو اس کے کان لال ہو جاتے۔ آنکھیں خشمگیں ہو جاتیں اور ٹھنڈی طبیعت والا فطرت سراسر آگ بگولہ ہو جاتا۔

کورس کے آخری حصے میں تمام طلبہ خاص کر غیر ملکی طلبا و طالبات کو امریکہ کے مختلف حصے دکھائے گئے۔ واشنگٹن' نیویارک' ہوسٹن' بوسٹن' کیلے فورنیا' جرسی' سان فرانسسکو وغیرہ۔ ان شہروں میں فطرت کو امریکی طرز زندگی کی جھلکیاں قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ شروع شروع میں جو ماحول اسے کھوکھلا اور گھٹن سے آزاد لگا۔ ذرا قریب سے دیکھنے پر اس سی گھن آنے لگی۔ مشرقی کنارے پر آباد شہروں میں غنڈہ گردی زوروں پر تھی اور "Muggeing" کے واقعات نے شرفاء کے لئے زندگی اجیرن کر رکھی تھی اور مغربی کنارے پر بعض شہروں مثلاً کیلے فورنیا اور سان فرانسسکو میں سر شام امریکی

عورتیں یوں بے دھڑک مردوں کو پھنساتی پھرتی تھیں کہ انسان کے لئے اپنی "عصمت" بچانا مشکل ہو جاتا تھا۔ آزادی! بے مہار آزادی! فطرت ایسی آزادی کا خواہاں تھا نہ مداح!

URDU4U.COM

اسی عرصے میں فطرت کو کسی پاکستانیوں سے بھی ملاقات کا موقع ملا جو ایک عرصے سے امریکہ میں قمیم تھے۔ ان سے گفتگو کے دوران فطرت نے محسوس کیا کہ وہ خوشحال ہیں۔ بظاہر خوش باش ہیں لیکن اکثر لوگوں کو اپنے وطن کی یاد ستاتی رہتی ہے۔ وہ وطن واپس آنا چاہتے ہیں۔ اپنی مٹی کو چومنا چاہتے ہیں لیکن اپنی اپنی مجبوریوں کی وجہ سے بیرون ملک ٹھہرے ہوئے ہیں۔

البتہ نیویارک کے فیشن ایبل علاقے مین ہٹن(Manhattan) میں اسے ایک ایسے پاکستانی بزنس مین کے گھر بھی جانے کا اتفاق ہوا جس میں پاکستانیت ختم ہو چکی تھی۔ جس دن فطرت اس کے گھر گیا اس کی بیٹی اپنے امریکن بوائے فرینڈ کے ساتھ کلب گئی ہوئی تھی' بیوی گھر سے باہر اپنے دوستوں کے ساتھ مصروف تھی اور خود شیرف صاحب (جو کبھی شریف ہوتے تھے(اپنے امریکی دوستوں کے ساتھ شراب پی رہے تھے۔ فطرت کو ایک امریکی دوست وہاں لے گیا۔ شاید وہ دکھانا چاہتا تھا کہ امریکی معاشرہ غیر ملکی لوگوں کو کس طرح اپنے دامن کی وسعت میں سمیٹ لیتا ہے۔

فطرت کا اس "پاکستانی" سے تعارف کرایا گیا تو اس نے امریکن ساخت کی انگریزی میں پوچھاHello young man, How as the country of flies and mosquitoes

ہیلو نوجوان' مکھیوں اور مچھروں کے دیس کا کیا حال ہے؟")

فطرت نے بڑے مہذب طریقے سی جواب دیا

"جی اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔ ٹھیک ٹھاک ہے"

"اوہ۔ ٹھیک ٹھاک کیسے ہو گا۔ جو ملک امریکی امداد کے بغیر ایک دن نہیں چل سکتا وہ

ٹھیک ٹھاک کیسے ہو سکتا ہے۔ خیر بتاؤ کیا لو گے وسکی' جن' بئیر"

"معاف کیجئے' میں شراب نہیں پیتا"

"تم کیا پیتا ہے"

"پانی"

URDU4U.COM

"ادھر پانی سے ہم صرف گندے برتن دھوتے ہیں۔ ینگ مین! تم نے امریکہ میں ایک سال ضائع کر دیا اچھا' بتاؤ آئیڈیالوجی(Ideology)والے لوگ ابھی تک ادھرActive ہیں یا ابMature ہو گئے ہیں"

"جی میں سمجھا نہیں"

"تم نہیں سمجھو گے۔ ابھی بچے ہو' لیکن ایک بات یاد رکھو اور واپس جا کر اپنے ہم وطنوں کو بتاؤ کہ اگر تم نے ایڈیالوجی کا ڈگڈی بند نہ کیا تو ملک ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا"

آپ کے منہ میں خاک" فطرت پھر دورہ پڑا۔

"What do you mean?"(کیا مطلب تمہارا؟)

فطرت نے انگریزی زبان میں ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا

I said, Hell with the man who talks of destruction of my beautiful country. Hell with him

میں نے کہا "جہنم میں جائے وہ شخص جو میرے ملک کی تباہی کی باتیں کرتا ہے۔ جہنم میں جائے"

تم نے ہمارے گھر میں ہم کو گالی دیا۔ اگر باہر یہ واقعہ پیش آتا تو ہم تمہیںDuel (لڑائی) کے لئے چیلنج کر دیتا"

فطرت یونہی' ہیل وتھ یو' وتھ یو' (جہنم میں جاؤ جہنم میں جاؤ) کہتا ہوا باہر نکل گیا۔

کورس کے آخر میں شکاگو انسٹی ٹیوٹ آف آرٹ کے طالب طلموں کو یہ کام سونپا گیا کہ وہ امریکی زندگی کے بارے میں اپنے اپنے مشاہدے کے مطابق نمونے کے پانچ پانچ اسکیچ بنجائیں تاکہ پتہ چل سکے کہ انہوں نے کیا سیکھا ہے اور کہاں تک سیکھا ہے۔

دوسرے لڑکے اور لڑکیوں کی طرح فطرت بھی اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ اس نے جو پانچ اسکیچ بنائے وہ کچھ اس طرح تھے۔

URDU4U.COM

نیویارک شہر کا ایک طائرانہ منظر' جس میں لوہے' بجری اور شیشے کی اونچی اونچی عمارتیں دکھائی گئی تھیں اور ان کے زیر سایہ چلنے والے انسان چیونٹیوں کی طرح رینگتے ہوئے نظر آتے تھے۔ عنوان تھا۔ "خالق اور مخلوق"

ایک امریکی بڈھے کا پورٹریٹ جس کے چہرے پر جھریاں ہی جھریاں تھیں۔ آنکھوں میں چمک باقی تھی نہ امید کی کرن۔ بڈھوں کے "یتیم خانے" میں پڑا ہوا تنہا بڈھا! عنوان: "خوشحال معاشرہ"

"شکاگو کے محلے کی پارک کا ایک منظر جس میں ایک امریکی بھکاری کشکول لئے کھڑا تھا۔ اس کا سر اور چہرہ بالوں اور گندگی سے اٹا ہوا تھا اور ایک ایشیائی چند سکے جیب سے نکال کر اسے عنایت کر رہا تھا عنوان "سپر پاور"

آخر میں دو قدرتی مناظر تھے۔

ایک نیاگرا فال اور دوسرا امریکہ کے اوپر صاف ستھرا نیلا آسمان

یہ منظر کینڈی سپیس سنٹر Kennedy Space Centre سے لیا گیا تھا اور زمین اور آسمان کی وسعتوں کے درمیان ایک تعلق قائم کرتا تھا۔

یوں تو شکاگو انسٹی ٹیوٹ کے سبھی استادوں کے ساتھ فطرت کے اچھی مراسم تھے لیکن جو استاد اسے خاص طور پر پسند آیا وہ ڈاکٹر برڈ تھا۔ وہ نسلاً جرمن تھا اور دوسری جنگ عظیم کے آخری ایام میں اپنے والدین سمیت امریکہ بھاگ آیا تھا۔ اب اس کے سر اور ڈاڑھی کے بال سفید ہونے لگے تھے لیکن اس کے چہرے پر جوانی کی سرخی موجود تھی۔ اس کی گھنی اور پھیلی ہوئی مونچھیں ڈاڑھی کے بالوں کے ساتھ مل گئی تھیں۔ درمیان میں صرف گلابی ہونٹ نظر آتے تھے جن سے اس کی شفقت بھرے عالمانہ الفاظ جھڑتے رہتے تھے۔ فطرت اپنے اسکیچ اس کے پاس لے گیا۔

ڈاکٹر برڈ نے فطرت کے بنائے ہوئے اسکیچ بڑے غور سے دیکھے' موضوعات کے انتخاب کی داد دی۔ عنوانات کو سراہا لیکن فنی نقطہ نظر سے ان کے جیومیٹریکل تناسب پر عدم اطمینان کا اظہار کیا۔ دراصل ڈاکٹر برڈ خود روایت اور روایتی قیود کا بڑا قائل تھا جبکہ فطرت لا ابالی طبیعت رکھتا تھا اور موضوع اور جذبات کو سکہ بند قوانین پر فوقیت دیتا تھا۔

"جذبات Chaotic ہوتے ہیں لیکن آرٹ Chaotic نہیں ہوتا آرٹ دراصل الجھے ہوئے' بکھرے ہوئے اور کسی حد تک گڈ مڈ جذبات کو ایک نظم دیتا ہے۔ ایک ترتیب دیتا ہے۔ ایک حسن دیتا ہے۔ اس نظم اور ترتیب کے بغیر ابلاغ ممکن نہیں ہوتا"

فطرت کا اصرار تھا کہ

"عظیم آرٹ میں کسی نہ کسی طور پر ابہام کا پہلو ضرور ہوتا ہے۔ یہ ابلاغ کی خاطر اپنے آپ کو عام قاری یا ناظر کی سطح پر نہیں لاتا۔ آرٹسٹ کا کام یہ ہے کہ وہ کسی Situation (صورتحال) کو اپنے جذبات کی آنچ دے کر صفحہ قرطاس یا کینوس پر منتقل کر دے۔ پورے خلوص اور ایمانداری کے ساتھ اور ابلاغ یا عدم ابلاغ کے متعلق بالکل نہ سوچے"

یہ بحث خاصی دیر تک جاری رہی۔ بالا آخر بحث کو سمیٹنے کے بعد پروفیسر برڈ نے ایک نیا موضوع چھیڑ دیا۔ اس نے کہا

"فطرت' مجھے آپ کو یہ بتاتے ہوئے دلی مسرت ہوتی ہے کہ ہمیں ایک عرصے کے بعد تم جیسا ذہین اور قابل آرٹسٹ ملا ہے۔ ہم تمہاری صلاحیتوں کے معترف ہیں۔ مجھے ہی نہیں میرے تمام رفقاء کار کو تمہارے اندر ایک عظیم فنکار نظر آ رہا ہے۔ ایک ایسا فنکار جس کے اندر تخلیقی بھٹی بڑی شدت کے ساتھ بھڑک رہی ہے"

"شکریہ' سر' بہت بہت شکریہ"

"میں نے یہ بھی سنا ہے کہ تمہارے ملک کی بنیاد اسلام پر ہے اور اسلام آرٹ کے خلاف ہے۔ خاص کر صورت گری (Fgiurative Arts) کے خلاف! مجھے ڈر ہے کہ تم ایسی Regimented Society (محبوس معاشرے) میں اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار نہیں

لا سکو گے اس لئے ہماری پیش کش یہ ہے کہ اگر تم یہاں رہنا چاہو یعنی مستقل طور پر امریکہ کو اپنا گھر بنانا چاہو اور اس کی کھلی فضاؤں میں اپنی فنی صلاحیتوں کو بروئے کار لانا چاہو تو بڑی خوشی سے یہاں ٹھہر سکتے ہو"

URDU4U.COM

حسب معمول فطرت کا پہلا رد عمل تو غم و غصے کا تھا لیکن اسے خیال آیا کہ اس کا مخاطب ہندوستانی طالب علم شرما نہیں بلکہ امریکی استاد ڈاکٹر برڈ ہے' چنانچہ وہ غصہ پی گیا۔ اس نے پورے ضبط تحمل سے کہا

"سر اس پیشکش کا شکریہ لیکن میری کمٹ منٹ (Commitment) پاکستان اور صرف پاکستان سے ہے۔ میں پاکستان کے بغیر اپنے آپ کو پہچان ہی نہیں سکتا۔ میری شناخت کا واحد حوالہ میرا ملک ہے اور میں اسی کی سر زمین پر اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لاؤں گا وہاں میری تخلیق پر کوئی پابندی نہیں۔ آپ نے غلط سنا ہے"

ڈاکٹر برڈ نے کہا

"جیسے تمہاری مرضی۔ بہرحال ہماری پیشکش اپنی جگہ قائم ہے اور قائم رہےگی گڈلک ٹو یو" (Good Luck to you)

فطرت جب امریکہ سے روانہ ہونے لگا تو اس کے پاس سالانہ وظیفے سے خاصی رقم بچ گئی تھی۔ وہ چاہتا تو اس رقمسے گھریلو استعمال کی کئی چیزیں خرید سکتا تھا لیکن اس نے یہ رقم آڑے وقت کے لئے سنبھال کر رکھ لی۔ صرف سیل (sale)سے ذاتی استعمال کے کچھ کپڑے خریدے۔ آرٹ کی چند کتابیں لیں اور کچھ رقم یورپ میں آرٹ گیلریاں دیکھنے اور سعودی عرب میں عمرہ کرنے کے لئے علیحدہ رکھ لی یورپ اور سعودی عرب کے سفر کے لئے اسے اضافی ٹکٹ خریدنے کی ضرورت نہ تھی کیونکہ واپسی ٹکٹ میں ہی اس کی گنجائش تھی۔ صرف اوپر کا خرچ اسے برداشت کرنا تھا جس کے لئے اس کے پاس وسائل موجود تھے۔ اس نے سوچا کہ اگر ذکیہ گھر ہوتی تو اس کے لئے یقیناً

تحفے تحائف لے جاتا لیکن اجڑے گھر میں وہ کیا لے جائے۔ کس کے لئے لے جائے۔ بوڑھی ماں تو صندوق میں پڑے ہوئے کپڑے بھی نہیں پہنتی' امریکہ کی شالیں یا جرابیں کیا پہنے گی۔ کاش ذکیہ زندہ ہوتی تو اسے وہ سرپرائز (Surprise) دیتا۔

انہی خیالوں میں گم وہ امریکہ سے روانہ ہو گیا۔

یورپ میں ایک ہفتے کے قیام کے دوران فطرت جو آرٹ گیلریاں دیکھ سکا ان میں سے لندن کی نیشنل آرٹ گیلری اور پیرس کی دی لور (the Louvre) خاص طور پر پسند آئیں۔ اس نے یورپ کی سیر کرتے ہوئے پہلی مرتبہ ایمل نولڈے کا وڈبلاک پرنٹ (Prophet) منک (Munch) کی ایچنگ (The Kiss) کیتھ کے لتھو گراف (Death seizing a woman)اور پکاسو کے چند شاہکار دیکھے جن کے متعلق اس نے سن تو بہت رکھا تھا لیکن انہیں اپنی آنکھوں سے دیکھنے کی حسرت ہی تھی۔

پیرس کی "دی لور" گیلری میں اس کی ملاقات ایک دبلی پتلی لڑکی مس گریس سے ہوئی جو واقعی گریس فل تھی۔ اس نے بند گلے کا لائٹ براؤن سویٹر پہنا ہوا تھا اور اس سگریٹ ہولڈرمیں سگریٹ لگا کر پی رہی تھی۔ جب فطرت نے شکاگو کو انسٹی ٹیوٹ کا ذکر کیا اور ڈاکٹر برڈ کا تعارفی خط دکھایا تو وہ خوشی سے اچھل پڑی۔ اس نے نہ صرف گیلری دکھانے میں بہت دلچپی لی بلکہ اوقات کار کے بعد اپنی گاڑی میں فطرت کو پیرس کی سیر کرائی۔ رات کا کھانا کھلایا۔ اور "پھر آیئے" (Come Again) کی مسکراہٹ بھری دعوت کے ساتھ اسے رخصت کیا۔ مس گریس کے حسن نقوش اور حسن سلوک کا سحر ایک عرصے تک فطرت پر طاری رہا۔

یورپ کی سیاحت کے دوران فطرت وہ جگہیں دیکھنے بھی گیا جن کا ذکر اس نے مختلف آرٹسٹوں کے حوالے سے کتابوں میں پڑھا تھا۔ مثلاً وہ ایمسٹڈم میں وان گاف فاؤنڈیشن دیکھنے گیا اور وہاں چوبیں گھنٹے صرف کئے۔ کیونکہ اس نے اس فنکار کی زندگی پر مبنی کتاب(Lust for life) پڑھ رکھی تھی اور اس کی جدوجہد سے بہت متاثر ہوا تھا۔ اس

© Urdu4U.com

کے علاوہ وہ دی ہیگ، وونڈل پارک، ایٹن اور نیونین دیکھنے گیا اور اپنی ڈائری میں ان جگہوں کے رف پنسل اسکیچ بنا لایا۔ یہ وہ مقامات تھے جہاں سی زین، گوگین، وان گوف، گویان اور دوسرے آرٹسٹ کام کرتے رہے تھے۔ ان جگہوں کے ساتھ فطرت کا پاک جذباتی تعلق قائم ہو چکا تھا اور اس جذبے کی تسکین کے لئے ان جگہوں میں پھرتا رہا۔

اس دوران فطرت کے دل میں رہ رہ کر یہ تمنا سر اٹھاتی رہی کہ جو کچھ یہ لوگ اپنے ملک کے لئے کر گئے ہیں۔ کاش اس کا کچھ حصہ وہ اپنے ملک پاکستان کے لئے کر سکے۔ اگر وہ اپنے برش کے ذریعے بیرون ملک پاکستانکا نام بلند کر سکے تو وہ سمجھے گا کہ اس کی زندگی کا مقصد پورا ہو گیا۔ یہ تمنا بار بار اس کے نہاں خانہ دل میں تڑپتی رہی لیکن زبان پر کبھی نہ آئی وہ بڑے بول کی جگہ بڑے کام پر یقین رکھتا تھا۔

یورپ سے نکل کر وہ عمرہ کرنے کے لئے سعودی عرب پہنچا تو اس نے زندگی کا بالکل نرالا ڈھب دیکھا۔ جن ممالک میں وہ ایک سال گزار کر آیا تھا وہاں رفتار زندگی بہت تیز تھی۔ اس ایک منٹ کی قدر تھی۔ ہر شخص مصروف تھا۔ ہر کاخانہ عروج پر تھا۔ ہر دفتر میں گہما گہمی تھی۔ یہاں جدہ میں آ کر اسے محسوس ہوا کہ شاید زندگی کی گاڑی کے چاروں پہیے پنکچر ہو چکے ہیں اور ان سے تیل پھوٹ رہا ہے۔ ہر کوئی آرام، تساہل اور بیکاری کا شکار ہے۔ کچھ لوگ ہلتے جلتے نظر آتے ہیں لیکن مرضی سے، ان کے پیچھے وقت کا دباؤ نہیں ہے۔ کام کا پریشر نہیں ہے۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ وہ زندگی کے رحم و کرم پر نہیں، زندگی ان کے رحم و کرم پر ہے۔

وہ باوضو ہو کر پہلی بار حرم شریف کے دروازے پر پہنچا تو خانہ کعبہ کی جھلک دیکھ کر اس کا دل دہلگیا۔ خوشی اور خوف کے ملے جلے جذبات ہے! اس نے چکور عمارت پر کالے غلاف کے تصویر کئی بار کتابوں میں دیکھی تھی لیکن اسے اس بات کا قطعاً اندازہ نہ تھا کہ بظاہر بے جان پتھروں کا یہ ڈھانچہ پہلی نظر پڑتے ہی انسانی قلب و ذہن میں

کتنی ہلچل مچا سکتا ہے۔ وہ ساری دعائیں اور آداب بھول گیا "ورباب العزیز" سے داخل ہوتے ہی خانہ کعبہ کی طرف منہ کر کے سجدہ ریز ہو گیا۔ اس نے دو رکعت نماز نفل ادا کی۔ سجدے میں گر کرا پنے گناہوں کی معافی مانگی۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ آنسو پونچھتا ہوا اٹھا۔ پسیجے دل اور بھاری قدموں کے ساتھ حجر اسود کے پاس گیا۔ بوسہ دیا اور طواف کعبہ شروع کر دیا۔

طواف کعبہ کے بعد اس نے مقام ابراہیم پر دو نفل ادا کئے۔ پھر سعی کے سات چکر پورے کئے۔ اور واپس آ کر حطیم میں بیٹھ گیا۔ (جو کعبہ کا حصہ سمجھا جاتا ہے) وہ سکون و امان کی اس جگہ پر بیٹھ کر خانہ کعبہ کو دیکھتا رہا اور تعمیر کعبہ کے تاریخی مراحل کو ذہن میں دھراتا رہا۔

وہیں اس نے فرض نماز ادا کی پھر نوافل پڑھے اور جب اس کا دل اس تجربے سے پوری طرح پسیج گیا تو اس نے دونوں ہاتھ اٹھا کر' اپنی نظر کعبہ پر مرکوز کرتے ہوئے' دعا کی:

اے رب عظیم

میرے وطن پاکستان کو استحکام و دوام بخش!

اے رب دو جہاں

تو نے انسان کو آزاد پیدا کیا لیکن وہ اسیر ہے۔

تو نے انسان کو اشرف المخلوقات پیدا کیا لیکن وہ اپنے ہم جنسوں کے ہاتھوں ذلیل ہے۔

تو نے انسان کو صرف اپنے خالق کی پرستش کرنے کا حکم دیا لیکن آج وہ چھوٹے چھوٹے سینکڑوں خداؤں کی پرستش پر مجبور ہے۔

اے قادر مطلق مجھے توفیق دے کہ میں اپنے برش اور پینٹ کے ذریعے انسان پر انسان کے ظلم کے خاف جہاد کر سکوں انسان پر انسانی جبر کو بے نقاب کر سکوں۔

مظلوم انسانوں' بلکتے بچوں' کراہتے مردوں اور سسکتی عورتوں کو اپنے کینوس پر جگہ دے سکوں

تا کہ
جو ظالم' جابر اور تنگ نظر لوگ تیری مشیت کی نفی کرنے پر تلے ہوئے ہیں ان کے چہروں کے ماسک اتار سکوں۔ انہیں ننگا کر سکوں۔ ان کے خلاف تیری ہی مخلوق کے جذبات جگا سکوں۔

URDU4U.COM

اے رب جلیل
اگر میں غلطی پر ہوں تو مجھے راہ ہدایت دکھا
اور
اگر میں راہ راست پر ہوں تو مجھے غربت' ظلم' جبر اور نا انصافی کے خلاف جہاد کرنے کی توفیق اور ہمت عطا فرما۔ ہمت فرما یا رب جلیل
ہمت عطا فرما۔

اگلے روز فطرت مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ گیا جہاں اس نے مسجد نبوی ؐ میں پانچ نمازیں پڑھیں۔ روضہ مبارک پر حاضری دی اور گڑ گڑا کر تقریباً وہی دعا کئی بار دہرائی جو وہ خانہ کعبہ میں کر چکا تھا۔

ان دعاؤں اور گریہ وزاری کے بعد فطرت کو اپنے اندر ایک نیا ولولہ اور ایک نئی قوت محسوس ہوئی اور وہ اس کی طاقت سے لیس ہو کر واپس اپنے وطن عزیز روانہ ہو گیا۔

فطرت جب کراچی کے ہوائی اڈے پر اترا تو اس کے اندر ایک نئی قوت پیدا ہو چکی تھی۔ امریکہ اور یورپ میں قیام کے دوران فن کے بارے میں اس کا ذہن بہت صاف اور کشادہ ہو چکا تھا اور خانہ کعبہ اور روضہ رسول ؐ پر حاضری دینے کے بعد پاکستان اور اسلام کے متعلق اس کے جذبات اور شدید ہو گئے تھے اور بحیثیت مصور اپنے مشن میں اس کا یقین اور راسخ ہو چکا تھا۔ اب وہ اس خواہش سے تڑپ رہا تھا کہ کب کینوس اور برش اس کے ہاتھ آئے اور وہ اپنی منشا کے مطابق تصویریں بنانا شروع کر دے۔

فطرت کے باطن کے علاوہ اس کے "ظاہر" میں ایک دو تبدیلیاں آ چکی تھیں۔ اس کے

سر کے بال تو اب بھی پہلے کیط رح آوارہ تھی لیکن مونچھیں خاصی کنٹرول میں آ چکی تھیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ قینچی سے ان کا تعارف ہو چکا ہے۔ اب وہ گھنی اور چوڑی تو تھیں لیکن سر کنڈے کی طرح اونچی نہ تھیں۔ اس کی ترشی ہوئی مونچھوں اور بکھرے ہوئے بالوں کے درمیان اس کا سرخ و سپید چہرہ پہلے سے زیادہ جچیہ لگتا تھا۔ وہ چہرے پر کوئی کریم وغیرہ نہیں لگاتا تھا لیکن پھر بھی اس کا صاف دھلا ہوا دیکھ کر ہر وقت یہی احساس ہوتا تھا کہ وہ ابھی ابھی باتھ ٹب سے نکل کر آیا ہے۔

URDU4U.COM

اس کے چہرے پر دوسری تبدیلی یا اضافہ یہ ہوا کہ اس نے نظر کی عینک لگوائی تھی۔ سفید شیشوں اور سنہرے فریم والی پتلی سی عینک۔ جو اس کے چہرے کو چھپانے کی بجائے پرکشش اور بارعب بنا دیتی تھی۔

اس کے لباس میں یہ فرق آیا تھاک ہ اس نے گرمیوں اور سردیوں میں یکساں طور پر استعمال ہونے والی کاڈرائے کی پتلون پہن رکھی تھی اور اوپر اسی رنگ کا چیک کوٹ تھا جس کی کہنیوں پر چمڑے کے ٹکڑے چسپاں تھے۔ لکڑی کے بٹنوں والے کوٹ' پتلے فریم والی عینک اور بکھرے بکھرے بالوں سمیت وہ دور سے ہی مصور لگتا تھا ایک سلجھا ہوا پڑھا لکھا مصور!

وہ کراچی سے بذریعہ ریل گاڑی فیصل آباد پہنچا اور ریلوے اسٹیشن سے بس اسٹینڈ تک جانے کے لئے تانگے کا انتظار کرنے لگا۔ کئی تانگہ بانوں نے اسے گھیر لیا۔ اس نے ایک اچھا سا تانگہ پسند کیا اور دام پوچھے تو یکے والے نے کہا:

"باؤ جی' بیس روپے" اس نے ہاتھ کی انگلیوں سے سمجھانے کی کوشش کی۔

فطرت نے پنجابی میں کہا:

"بابا تو کی سمجھیاں ایں کہ میں امریکہ توں آیاں مینوں ایتھوں دا کجھ پتہ نئیں' میں ایتھوں دا رہن والا ہاں۔ ہن دس کنے پیسے؟

(بابا تم کیا سمجھے کہ میں کوئی امریکی ہوں اور مجھے یہاں کا کچھ علم نہیں۔ میں یہیں

کا رہنے والا ہوں۔ اب بتا' کتنے پیسے")
بابا کچھ شرمندہ سا ہو گیا اور کہنے لگا "بابو جی تین روپے"
"ہیں تو بابا یہ بھی زیادہ۔ پر چل تین روپے ہی سہی"
URDU4U.COM
یہ کہ کر فطرت نے اپنا مختصر سا سامان تانگے پر رکھا۔ پندرہ منٹ میں وہ بس سٹاپ پر پہنچ گیا اور بس نے شام ہونے سے پہلے پہلے اس چک نمبر ۲۳۰ کے پاس سے گزرنے والی پکی سڑک پر اتار دیا۔ فطرت اپنا بکس اور بیگ ایک ایک ہاتھ میں اٹھا کر گاؤں کی طرف چل پڑا۔ ابھی چند قدم ہی گیا تھا کہ گاؤں کے لڑکے قادر' یوسف' عزیز اور رحمت پیچھے سے آ ملے انہوں نے اس کا سامان اٹھا لیا اور وہ گاؤں کی طرف چلنے لگے۔

راستے میں قادر نے پوچھا۔
"بھائی فطرت' تم امریکہ سے آ رہے ہو؟"
"ہاں" "سنا ہے وہ بڑا ملک ہے۔ بہت بڑا"
"ہاں بہت بڑا ملک ہے اور امیر بھی"
عزیز نے کہا
"کتنا عرصہ رہے وہاں"
"ایک سال"
"پورا ایک سال"
"وہاں تو ایک ہی سال رہا لیکن راستے میں مہینہ بھر لگ گیا۔"
رحمت نے کہا
"یکن بھاء فطرت' اپنا سلیم ہے نا' سلیم۔ چاچا غلام دین کا بیٹا"
"ہاں"
"وہ دوبئ گیا تھا اور ایک سال بعد پچھلے مہینے واپس آیا۔ وہ اپنی کار لایا تھا۔ اپنی کار۔ اب بھی انکی ڈیوڑھی کے باہر کھڑی ہے۔"
"ٹھیک ہے' وہ کار لینے گیا ہو گا' میں کچھ اور لینے گیا تھا"

"کپڑے، جرسیاں، گھڑیاں، ٹیپ، ٹی وی"
"نہیں نہیں"
قادر نے کہا
"الو کے چرخو، یہ تو سوچو کہ فطرت صاحب پڑھے لکھے آدمی ہیں۔ یہ کیوں پیسہ ضائع کریں ایسی فضول چیزوں پر۔ یہ روپیہ اکٹھا کر کے لائے ہوں گے بنگلہ بنائیں گے، زمین خریدیں گے۔ نیا ٹیوب ویل لگائیں گے اور گاؤں کے بہتب ڑے چوہدری بن جائیں گے۔

Urdu4U.COM

یوں باتیں کرتے کرتے وہ گھر پہنچ گے۔ ریشماں نے حسب معمول فطرت کو دونوں بازوؤں میں بھینچ کر پیار کیا۔ اس کا منہ اور سر چوما اور شفقت سے اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا۔ فطرت کرسی کھینچ کر اس پر بیٹھ گیا اور ریشماں موسم سرما کی مناسب سے چائے بنانے لگی۔

دیہاتی رواجی کے مطابق بہت سے لوگ ان کے گھر جمع ہو گئے۔ بظاہر ریشماں کو بیٹے کی امریکہ سے واپسی پر مبارکباد دینے لیکن در حقیقت یہ پتہ کرنے کہ وہ کیا لایا ہے اور کس کس کے لئے لایا ہے۔ انہوں نے باتوں ہی باتوں میں اس قسم کے جملے داغنا شروع کر دیے:

"بہن جیونی کا پتر کویت گیا تھا تو سارے خاندان کے لئے کپڑے لایا تھا"
"تم خاندان کی بات کرتی ہو۔ میں اس کی کچھ بھی نہیں لگتی، یہ سویٹر مجھے بھی دے گیا تھا"
"وہ فضلاں کا بھتیجا یاد ہے۔ وہ مذہبی اور نمازی سا، اس نے آ کر مسجد میں پنگھے لگوا دیئے تھے۔"
"وہ تو گاؤں کی سڑک پکی کروانے والا تھا لیکن رمضان، میاں خاں اور نور حسین نے اپنی زمینوں سے راستہ نہ دیا ورنہ یہ چھوٹا سا ٹکڑا پکا ہو چکا ہوتا آج تک"

اتنے میں چند مرد تشریف لے آئے۔ فطرت نے سوچا چلو ان کی وجہ سے عورتوں کے طعنوں سے تو نجات ملے گی لیکن اسے کیا پتہ تھا کہ وہ عورتوں سے کچھ کم ثابت

نہ ہوں گے۔ انہوں نے فرمانا شروع کیا۔

"پتر فطرت' بہت پڑھ لیا تم نے' اب بس افسر لگ جا' وڈا افسر' گاؤں کے کام کروا' سڑک بنوا' اشتمال کروا' سکول کھلوا' گاؤں کے نوجوانوں کو جو بیکار بیٹھے ہیں نوکری دلوا۔ کسی کو سعودی عرب بھجوا' کسی کو دوبئی کا ویزا دلوا' آخر گاروں والوں کو بھی کوئی فائدہ پہنچے تیری پڑھائی کا"

سابق فوجی بابا فضل دین نے کہا:

"پچھلی جنگ میں میں نے بڑے افسر دیکھے ہیں۔ مصر میں' اٹلی میں' برما میں' سنگاپور میں۔ لیکن تیرا جیسا جوان نہیں دیکھا۔ اگر میرا اندازہ غلط نہیں تو تمہاری چھاتی صرف ۳۶ انچ ہو گی۔ قد بھی چھ فٹ کے لگ بھگ ہو گا۔ مجھے تو تمہارا وزن بھی پورا لگتا ہے۔ تم لفٹین بھرتی ہو جاؤ۔ فوجی وردی اور کندھی پر پھول خوب سجیں گے۔ ہامرے گاؤں کا ایک افسر ہو تو۔ آخر گاؤں کی عزت ہوتی ہے افسروں سے"

چوہدری نورالٰہی نے کہا:

"دیکھ تو جو کچھ بننا چاہے بن جا' اللہ نے تجھے ہر شے دی ہے تعلیم' قدبت' عقل۔ لیکن میری ایک نصیحت یاد رکھنا۔ اپنے چک کو نہ بھول جانا۔ ہمیں تجھ سے بڑی امیدیں ہیں۔ بڑی امیدیں۔"

باری باری عورتیں اور مرد اس کے ذہن پر بمباری کر کے چلے گئے اور فطرت سوچ میں پڑ گیا کہ وہ ان توقعات کی یلغار میں کس طرح اس گاؤں میں زندگی گزار سکے گا۔ اسے جلد از جلد گاؤں سے بھاگ جانا چاہئے ورنہ اسے اپنی باتوں سے پاگل کر دیں گے۔

وہ اس لفظی گولہ باری سے بمشکل فارغ ہوا تھا کہ ریشماں دبے پاؤں اس کے پاس آ بیٹھی اور بڑی رازداری سے کہنے لگی:

"بیٹا' میں دمہ کی مریض ہوں' سانس اکھڑتا ہے تو پھر جڑتا نہیں۔ پتہ نہیں کب سانس آئے نہ آئے"

"ضرور یہ تمہید میری شادی کے بارے میں ہو گی"

"تو پڑھ لکھ کر اتنا ہوشیار ہو گیا ہے بیٹا کہ میرے دل کی بات پہلے ہی سمجھ لیتا ہے۔

URDU4U.COM

اب میں یہ فرض تمہاری اسی چھٹی میں پورا کر دینا چاہتی ہوں"

"تھوڑی دیر اور قضا کریں یہ فرض امی"

"پہلے ہی بہت قضا کر چکی پتر۔ میری زندگی کا کوئی اعتبار نہیں۔ نوراں کو دیکھو' اس کے بیٹے نے تمہارے ساتھ دسویں۔ جماعت پاس کی تھی۔ اس وقت نوکر ہو گیا تھا۔ اب وہ پوتوں کو کھلاتی ہے۔ روز طعنے کے طور پر پوتے کو اٹھائے میرے سامنے سے گزرتی ہے۔ مجھ سی یہ دکھ نہیں سہا جاتا۔"

اپنے دکھ بیان کرتے کرتے ریشماں کے آنسو نکل آئے۔ فطرت سے یہ آنسو دیکھے نہ گئے۔ اس نے بڑی لجاجت سے کہا:

"مجھے تھوڑے مہلت اور دے دو۔ میں لاہور جا کر نوکری کا بندوبست کر لوں۔ صرف چند مہینوں کی بات ہے۔ پھر تم اپنی خوشی پوری کر لینا۔"

ریشماں نے میلی چادر سے اپنے آنسو پونچھ لئے اور فطرت سوچتا رہ گیا کہ ہر انسان کے اپنے اپنے رنج ہوتے ہیں۔ کوئی اس فکر میں ہے کہ وہ کس طرح آرٹ کی دنیا میں نام پیدا کرے اور کوئی اس غم میں مبتلا ہے کہ اس کی گود میں پوتے کیوں نہیں مچل رہے۔ اپنے اپنے گرداب' اپنے اپنے بھنور!

فطرت اگلے روز لاہور روانہ ہو گیا۔

فطرت گاؤں کی فضا سے تنگ آ کر لاہور پہنچ گیا کیونکہ اس کا خیال تھا کہ لاہور ملک کا ثقافتی دارالحکومت ہے اور اس نے آج تک جو خواب دیکھے ہیں وہ صرف لاہور میں پورے ہو سکتے ہیں۔

اس نے جاتے ہی میکلوڈ روڈ پر واقع خیابان ہوٹل میں ایک کمرہ بک کرایا جو روزانہ کرایہ کے لحاظ سے مہنگا تھا لیکن ماہوار کرائے میں خاصی بچت تھی' اس نے ایک ماہ

کا پیشگی کرایہ ادا کر دیا اور اسے کمرہ نمبر ۲۰۹ کی چابی تھما دی گئی جو تیسری منزل پر واقع تھا اور اس کی کھڑکی سڑک کی طرف کھلتی تھی۔

URDU4U.COM

یہ چھوٹا سا کمرہ تھا جس مین کپڑوں کی الماری تھی نہ فرش پردری' کھڑکی میں پردے تھے نہ پلنگ پر بستر' نہ ٹیبل لیمپ موجود تھا نہ پانی کا تھرمس' بس فرش پر دیسی وضع کی ایک چارپائی بچھی تھی اور ساتھ ایک چھوٹا سا میز اور ایک کرسی پڑیت ھی۔ دیوار پر کپڑے مانگنے کے لئے کیل ٹھونکے گئے تھے اور کیلوں کی قسار کی نیچے پرانے اخبار چسپاں تھے تاکہ کپڑے سفیدی وغیرہ سے خراب نہ ہوں

فطرت اپنا مختصر سا سامان کمرے میں رکھ کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا سڑک پر ٹریفک کا زور تھا۔ ٹیکسیاں' تانگے' سکوٹر' سائیکل' رہڑھیاں' رہڑھے آپس میں غلط ہو رہا ہے تھے' پیدل چلنے والے بھی غیر منظم تھے' کچھ فٹ پاتھ پر چل رہے تھی اور کچھ سڑک کے ساتھ ساتھ۔ جہاں سے جس کا جی چاہتا سڑک پار کر جاتا اور گاڑی والے ہارن بجاتے رہ جاتے۔

اسی بھیڑ میں سڑک کے کنارے کے ساتھ ساتھ مزدور رہڑھے بہت سا فرنیچر لا دے رہڑے کو دھکیلنے کی کوشش کر رہا تھا' اس کے جسم پر پھٹا ہوا پرانا کوٹ تھا جس کے کالر پر بیل کی پنجابی کی طرح ریڑھے کا پٹہ اور رسہ کسا ہوا تھا' اس کے پاؤں ننگے اور چہرہ اندر کو دھنسا ہوا تھا۔ فرنیچر کا بوجھ اس کی ہمت سے اسے آگے دھکا دیتا اور جب سامنے کسی عورت یا بچے سے ٹکرانے کا خطرہ ہوتا تو بھاگ کر خود ہی ریڑھے کو روک لیتا۔ دھکیلنے اور روکنے کی یہ مشق خاصی صبر آزما تھی جسے فطرت اوپر کھڑکی سے ایک مصور کی نظر سے دیکھتا رہا اس نے ڈائری نکال کر میکلوڈ روڈ کے پس منظر میں اس مزدور کا اسکیچ بنان شروع کر دیا۔

فطرت اس مزدور کے اسکیچ سے فارغ ہوا تو اسے ایک مریل سا گھوڑا نظر آیا جو تانگے کے آگے جتا ہوا تھا' تانگے پر سواریوں کی تعداد معمول سے تقریباً دگنی تھی اور گھوڑاب

URDU4U.COM

ھوک اور محنت کی وجہ سے نڈھال ہو چکا تھا۔ وہ بڑی مشکل سے سواریوں سے لدے پھندے تانگے کو آگے کھینچ رہا تھا‘ کوچوان گھوڑے کی ہمت کی داد دینے کی بجائے اس کی ننگی پیٹھ پر پے در پے چابک برسا رہا تھا‘ ہر چابک پڑنے سے پہلے گھوڑی کی پتلی سی پیٹھ ڈر سے ایک آدھ انچ نیچے دب جاتی تھی اور چوٹ سہہ کر دوبارا اپنی جگہ پر آ جاتی تھی‘ پتہ نہیں سڑک میں تھوڑی سی اونچائی آئی گئی یا پچھلی سواریوں کا بوجھ زیادہ ہو گیا کہ گھوڑا کوچوان کی مرضی کے مطابق آگے نہ بڑھ سکا‘ کوچوان نے سزا کے طور پر اس پر پہلے چابک برسانا شروع کئے اور پھر تانگے کی سیٹوں کے نیچے سے ایک ڈانڈا نکال کر اسے پیٹنے لگا۔ گھوڑا وہیں سواریاں اٹھائے ڈنڈے سہتا رہا اور کوچوان اس کی پیٹھ کو تختہ مشق بناتا رہا حتی کہ گھوڑا گر کر بے ہوش ہو گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے دم توڑ گیا۔ مرے ہوئے گھوڑے والے تانگے سے سواریاں بادل ناخواستہ اتر آئیں۔

فطرت نے یہ منظر بھی اپنی ڈائری میں محفوظ کر لیا۔

فطرت اسبات کا فیصلہ نہ کر سکا کہ فرنیچر ڈھونے والا مزدور زیادہ قابل رحم تھا یا تانگے میں جتا ہوا گھوڑا۔ شائد دونوں کا مقدر ایک ہی تھا!

اگلے روز فطرت سب سے پہلے اپنے ڈیپارٹمنٹ گیا جہاں حسب معمول خاصی گہما گہمی تھی لڑکیاں اپنے رنگ رنگا سویٹروں اور لہراتے دوپٹوں میں بہا دے رہی تھیں‘ اکثر لڑکے کوٹ پتلون پہنے آ جا رہے تھے‘ ان میں سے کچھ لڑکیاں اور لڑکے جانے پہچانے تھے شائد وہ فیل ہونے کی وجہ سے ابھی تک ڈیپارٹمنٹ میں تھی لیکن زیادہ تر چہرے نئے تھے۔

ان کے سامنے سے گزرتے ہوئے کچھ اس قسم کے جملے فطرت کے کان پڑے ”یہ ہے فطرت جس نے پچھلے سال یونیورسٹی میں ٹاپ کیا تھا“

”ابھی ابھی امریکہ سے واپس آیا ہے‘ شکاگو انسٹی ٹیوٹ آف آرٹ سے بڑھ کر“ ”یار بڑا لکی ہے ادھر ایم۔اے کیا‘ ادھر امریکہ کا ٹرپ مل گیا اب جو چاہے کرے‘ مزے ہی مزے ہیں“

"سنا ہے پینٹر بھی بہت کلاس کا ہے اور سپورٹ بھی ہے پروفیسر سعید کی"
یہ جملے سنتے سنتے وہ پروفیسر سعید کے کمرے میں پہنچ گیا وہ حسب معمول بڑے تپاک سے
URDU4U.COM
ملے' بغل گیر ہوئے' پیٹھ پر دو مرتبہ تھپکی دی اور کہا:
"بیٹھو کیا حال ہے' کب آئے' امریکہ کا ٹرپ کیسا رہا"
پروفیسر سعید نے بتہ سارے سوال اکٹھے ہی کر ڈالے' فطرت نے انکی سر پرستی اور امداد کا شکریہ ادا کیا' امریکہ کا حال بتایا' یورپ کے تجربات بیان کئے اور اپنی امریکی ٹائی کو سہلاتے ہوئے اگلے سوال کی توقع میں خاموش ہو گیا۔
"اب کیا ارادہ ہے"
"میں پینٹ کرنا چاہتا ہوں' میرے ذہن میں بہت سے موضوع اکٹھے ہو گئے ہیں۔ کچھ نئے کچھ پرانے"
"ہاں وہ تو ٹھیک ہے' مجھے یاد ہے زمانہ طالب علمی میں بھی تمہارے ذہن میں بڑے انقلابی موضوع آتے تھے اور ہم تمہیں منع کرتے تھے کہ پہلے امتحان پاس کر لو۔ پھر مرضی کے کینوس پینٹ کرنا لیکن یہ تو بتاؤ روزی کس طرح کماؤ گے؟"
"میری پہلی پسند تو یونیورسٹی کا جاب ہی ہے۔ کچھ چانس ہے؟"
"وہ تو میں مسز شیخ سے بات کر کے ہی بتا سکتا ہوں البتہ اس لحاظ سے تم خوش قسمت ہو کہ تم امریکہ سے واپس آئے اور ڈین صاحب چھ مہینے کے لئے یوگوسلاویہ جا رہے ہیں اس کے بعد چھ مہینے کی چھٹی لے کر وہ یورپ پھرنا چاہتے ہیں' اس طرح ایک سال کے لئے ایک عارضی آسامی نکلتی ہے۔ میں مسز شیخ سے بات کروں گا۔ اللہ کرے اس نے تمہارے متعلق رائے بدل لی ہو"
"جی امید تو ہے' میں نے ان کا پرانا تاثر ختم کرنے کی کوشش تو کی تھی"
"وہ کیسے"
"میں نے انہیں دو تین خطل کھے تھے اور ایک خط ڈاکٹر برڈ سے لکھوایا تھا جو محترمہ کو ذاتی طور پر جانتے ہیں"

"پھر تو تم نے نوکری کے لئے خود ہی زمین ہموار کر لی۔ میری تو اب ضرورت ہی نہیں"

"ضرورت کیوں نہیں' سر' آپ کی سفارش کے بغیر کام کیسے ہو سکتا ہے"

URDU4U.COM

"اچھا میں بات کروں گا' دو تین دن کے بعد مجھ سے مل لینا۔ بہتر ہو گا کہ گھر پر آ جاؤ وہاں بات ذرا کھل کر ہو جائے گی"

"ٹھیک ہے سر' میں حاضر ہو جاؤں گا"

فطرت پروفیسر سعید کے کمرے سے نکلا ہی تھا کہ اس کی مڈبھیڑ مس نزہت سے ہو گئی وہ چھوٹتے ہی بولی:

"ہیلو فطرت' ویلکم بیک (واپسی مبارک) امریکہ کیا گئے کسی کو پہچانتے ہی نہیں ہو" "کیوں نہیں مس نزہت آپ کو نہیں پہچانوں گا تو کس کو پہچانوں گا' میں نے ڈیپارٹمنٹ میں آتے ہی سب سے پہلے مسز شیخ اور آپ کے مرے میں جھانکا تھا' مسز شیخ ابھی آئی نہیں تھیں اور آپ کلاس میں چلی گئی تھیں"

"آیئے اندر بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں' میرا اگلا پیریڈ خالی ہے"

مسز نزہت نے دعوت دی۔ فطرت کی معلومات کے مطابق پہلا موقع تھا کہ نزہت نے کسی طالب علم کو اپنے کمرے میں آنے کی دعوت دی ہو۔

کمرے میں داخل ہوتے ہی نزہت نے گاؤن اتارا اور کرسی پر بیٹھ گئی اس کے پیلے رنگ پر پیلے رنگ کا سویٹر خوب جچ رہا تھا' اس نے اگلے میں بھی لاکٹ پہن رکھا تھا جو سردیوں کی وجہ سے کپڑوں میں چھپ گیا تھا البتہ لاکٹ کی سنہری زنجیر گردن کے دونوں جانب صاف دکھائی دے رہی تھی۔

"تو کیسے وقت گزرا امریکہ میں" مس نزہت نے فطرت کو خیال کی دنیا سے نکال کر واپس ڈیپارٹمنٹ میں پہنچا دیا۔ اس نے سنبھلتے ہوئے کہا:

"جی بہت اچھا"

"کیا دیکھا وہاں"

"بہت کچھ دیکھا مس نزہت۔ آرٹسٹوں کے بنائے ہوئے شاہکار بھی اور قدرت کے شاہکار بھی"

"قدرت کے شاہکار؟"

"ہاں۔ نیا گرافال کو ہی لے لیجئے۔ آبشاریں تو میں نے اور بھی دیکھی ہیں لیکن جب آبشاریں مل کر گرتی ہیں تو ان کی بہار ہی اور ہوتی ہے۔"

URDU4U.COM

نزہت نے جذباتی موضوع کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا "اور کیا دیکھا؟"

مس نزہت نے جس طرح نیا گرافال والی بات کو نظر انداز کیا' فطرت کے جذبات پر اوس پڑ گئی اس نے بات کو مختصر کرتے ہوئے کہا۔

"بس واپسی پر ہفتہ دس دن یورپ میں گزارے اور وطن لوٹ آیا"

"O.K. Wish you the best of luck (اچھا خدا حافظ' اللہ آپ کو کامیاب فرمائے۔

"Thank you"

تھینک یو کا صاف مطلب تھا کہ اب آپ تشریف لے جایئے۔ چنانچہ فطرت رسمی علیک سلیک کے بعد اس کے کمرے میں نکل آیا۔

آتے ہوئے اس نے مسز شیخ کا پتہ کیا لیکن چپراسی نے بتایا کہوہ کسی کام سے محکمہ تعلیم میں گئی ہوئی ہیں۔ فطرت نے خیال کیا یقیناً سال بہ سال ملازمت کی توسیع کا چکر ہو گا۔

چلو' اب میں نے "سرخہ" ہونے کا الزام دھو ڈالا۔ امریکہ ہو آیا ہوں۔ اب تو کام بن جائے گا۔

وہ چند روز بعد مقررہ وقت پر پروفیسر سعید کے گھر چلا گیا' ملازم نے حسب معمول اسے ڈرائنگ روم میں بٹھایا اور پروفیسر صاحب کو اطلاع دی وہ ڈریسنگ روم گاؤن کی ڈوری کمر کے گرد کستے ہوئے تشریف لائے فطرت پہلے کی طرح احتراماً کھڑا ہو گیا۔ چائے کا آرڈر دینے کے بعد اصل موضوع پر گفتگو شروع ہو گئی۔

فطرت نے پوچھا:

"سر' مسز شیخ سے بات ہوئی؟"

"ہاں' ایک سے زیادہ مرتبہ ہوئی"
"پھر' سر؟" فطرت نے اشتیاق بھرے انداز میں ملاقات کا نتیجہ فوراً جاننا
"معلوم ہوتا ہے تمہارای قسمت میں کچھ چکر ہے"
URDU4U.COM
"یوں' اب پھر انہوں نے انکار کر دیا"
"بس یہی سمجھ لو"
"وجہ؟"
"کیا وجہ جانان ضروری ہے تمہارے لئے"
"ضروری تو نہیں لیکن آپ نے سال ڈیڑھ سال پہلے مجھے نوکری نہ ملنے کی وجہ بتا دی تھی تو میں نے خاصی حد تک غلط اور بے بنیاد الزام کی تردید کر دی تھی۔ اب انکا اعتراض کیا ہے"
"اب وہ سمجھتی ہیں کہ آپ کا سی' آئی۔ اے سے تعلق ہے اور موجودہ حکومت سی۔ آئی۔ اے سے بڑی الرجک ہے۔ حکومت یہ سمجھتی ہے کہ امریکہ پاکستان کے تعلیمی اداروں میں اپنے آدمی بھر رہا ہے۔"
"میں۔ اور سی۔ آئی۔ اے سر؟ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"
"میں نہیں کہہ رہا' مسز شیخ کہہ رہی ہے' وہ سمجھتی ہے کہ اگر امریکہ کے خرچ پر امریکہ میں کورس کرنے والے فطرت کو اس ڈیپارٹمنٹ میں جگہ دے دی تو کہیں اس کی ملازمت کی توسیع خطرے میں نہ پڑ جائے"
مسز شیخ کا یہ رویہ فطرت کے لئے قابل فہم تھا' اس کی سمجھ میں نہیں رہا تھا کہ وہ اس سے کیوں ناراض ہے اور ہر دفعہ کیوں نہ کوئی بہانہ رکھ کر اسے ٹرخا دیتی ہے شاید اس نے ایم۔ اے (فائن آرٹس) میں داخلے کے فوراً بعد زوبی کے ساتھ سے آتے جاتے دیکھ لیا تھا اور وہ امیر اور بااثر زوبی کا تو کچھ نہ بگاڑ سکتی تھی اور اس کی سزا فطرت کو دینا چاہتی تھی' یا اس نے محسوس کیا تھا کہ فطرت کا جھکاؤ اس کی بجائے پروفیسر سعید کی طرف زیادہ ہے اور وہ پہلے ہی پروفیسر سعید کی ہر دلعزیزی سے جلتی

تھی فطرت اسے معمے کو سلجھانے میں کامیاب نہ ہو سکا۔
پروفیسر سعید نے کہا "کس سوچ میں ڈوب گئے' فطرت"
"میں یہی سوچ رہا تھا' سر' کہ آیا واقعی اتنی بڑی روورت کی اتنی بڑی نوکری کا دارو مدار مجھ پر ہے' وہ دس سال سے تو اس ڈیپارٹمنٹ کی ہیڈ چلی آ رہی ہیں"
"تم نے خود ہی اپنے سوال کا جواب دے دیا ہے اگر وہ اتنی محتاط نہ ہوتیں تو دس سال تک ڈیپارٹمنٹ کی سربراہ کیسے رہتیں"
"لیکن سر' انہوں نے ملازمت نہ دینے کا یہ کیابہانہ گھڑا ہے۔ کبھی سرخ' کبھی سفید' کبھی روس کا ایجنٹ' کبھی امریکہ کا ایجنٹ۔ سر' میں پاکستانی ہوں' سراسر پاکستانی مجھ پر اور جو تہمت چاہے لگا لیجئے لیکن میری پاکستانیت پر تو شک نہ کیجئے"
"میں کب شک کر رہا ہوں۔ بھئی۔ تم تو"
"میرا مطلب آپ سے نہیں' مسز شیخ سے ہے۔ وہ صاف کیوں نہیں کہہ دیتیں کہ انہیں میری شکل پسند نہیں' میرا جغرافیہ پسند نہیں' میرا آپ سے ملنا جلنا پسند نہیں وہ اپنے انکار کے جواز کی خاطر میری وفاداریوں کو کیوں مشکوک بناتی ہیں' میں کل ان سے مل کر ان سے صاف صاف بات کروں گا"
"ہرگز نہیں انہوں نے دونوں الزامات کا ذکر مجھ سے کیا تھا اور تمہارا ان الزامات کی وضاحت کرنا یہ ثابت کر دی گا کہ میں ڈیپارٹمنٹ کی باتیں تمہیں بتاتا رہا ہوں"
فطرت کا غصہ تو ٹھنڈا نہ ہوا لیکن پروفیسر سعید کی پوزیشن کی وجہ سے خاموش ہو گیا۔

فطرت کو سنجیدہ اور مغموم دیکھ کر پروفیسر سعید نے کہا:
"یونیورسٹی کا جاب اچھا سہی' لیکن اللہ کی بنائی ہوئی دنیا اتنی تنگ بھی نہیں ہے۔ پریشان مت ہو"
"نہیں' سر' نوکری کا مجھے کوئی غم نہیں' روزی دینے والا اللہ تعالی ہے' مسز شیخ نہیں' لیکن جس بات سے مجھے کوفت ہوئی ہے وہ لیفٹ اور رائٹ کا لیبل ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ کسی انسان خاص کر سوچنے سمجھنے والے انسان کے ساتھ اس سے بڑی اور کوئی

زیادتی نہیں ہو سکتی کہ وطن اور قوم سے ان کی وفاداریوں پر شک کیا جائے۔ اسے روسی یا امریکی ایجنٹ کہا جائے اور"

"صبر کرو' فطرت' صبر کرو' ابھی تم نے دنیا میں دیکھا ہی کیا ہے اگر ایسی باتوں سے تم نے اپنا خون جلانا شروع کر دیا تو زندگی کیسے گزارو گے۔ اس دنیا میں تمہیں کئی منزلیں ملیں گی۔ بلکہ اس سے بڑھ کر دل و دماغ پر کچوکے لگیں گے۔ اتنے اندر حوصلہ پیدا کرو۔ قوت برداشت پیدا کرو ورنہ جینا حرام ہو جائے گا خیر چھوڑو ان باتوں کو' بتاؤ اب کیا ارادے ہیں؟"

"میرا ارادہ تو پینٹ اور صرف پینٹ کرنے کا ہے اور میرا خیال ہے کہ میں اپنی پینٹنگ کے سہارے زندہ رہ سکتا ہوں۔ میری ضروریات کچھ زیادہ نہیں ہیں مجھے صرف دو تین سو روپے ماہوار چاہئیں اور بس"

"برخوردار' کس دنیا میں رہتے ہو۔ دو تین سو روپے میں تو تم رنگ بھی نہیں خرید سکو گے"

"رنگ' کینوس اور فریم وغیرہ کے لئے میرے پاس پیسے ہیں۔ مجھے صرف روز مرہ کے اخراجات کے لئے تھوڑی سی رقم چاہئے جو میں انشاء اللہ ضرور کما لوں گا"

"سوچ لو' جو راستہ تم چن رہے ہو خاصا دشوار ہے؟"

"راستہ دشوار سہی لیکن میں آرام و آسائش کا طلب گار ہوں بھی نہیں۔ میری تو صرف ایک ہی طلب ہے جو Passion (جنون) کی حدیں چھو رہی ہے اور وہ یہ کہ میں اپنی مرضی کی تصویریں بنا سکوں' جو کچھ دیکھتا اور محسوس کرتا ہوں اسے کینوس پر منتقل کر سکوں۔

خاص کر وہ پانچ چھ تصویریں جو میرے ذہن میں اظہار کے لئے بیتاب ہیں انہیں اظہار دے سکوں' پھر انکی نمائش کروں آپ جیسے کسی فن شناس شخص سے اس کا افتتاح کراؤں۔ اخبارات میں اس کا چرچا ہو' فن کے نقاد میرے فن پر تبصرہ کریں اور میری تصویروں کے ذریعے ملک میں ایک نئی سوچ ابھرے' ایک نیا شعور جاگے۔ غربت' افلاس' جبر و

تشدد' تنگ نظری اور ناانصافی کے خلاف اور پھر اسی شعور سے وہ احساس پیدا ہو جسے بروئے کار لا کر ان لعنتوں کو معاشرے سے ختم کیا جا سکے۔"

URDU4U.COM

"گویا تم نے اصلاح معاشرہ کا مشن اپنے ذمے لے لیا"

"نہیں سر' میرا مشن اصلاح معاشرہ نہیں صرف معاشرے کی ناہمواریوں' اس کی زیادتیوں اور اس کی ناانصافیوں کو بے نقاب کرنا ہے۔ باقی کام اوروں کا ہے"

"میں تمہارے ارادوں کی کامیابی کے لئے دعا ہی کر سکتا ہوں"

"صرف دعا؟"

"نہیں تمہیں جب بھی اور جس مرحلے پر بھی میری ضروریات محسوس ہو بلا جھجک چلے آنا تم پر میرے گھر اورمیرے دل کے دروازے ہر وقت کھلے ہیں"

"شکریہ' سر' بہت بہت شکریہ"

پروفیسر سعید کے گھر سے فطرت واپس آیا تو یاس اور عزم کے دوراہے پر کھڑا تھا یاس اس وجہ سے کہ مسز شیخ جیسی جہاندیدہ عورت نے اس پر "لیفٹ" اور "رائٹ" کی تہمت لگائی اور عزم اس بات کا کہو ہ اپنی خداداد صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر نہ صرف زندہ رہے گا بلکہ فن کو بھی زندہ رکھے گا۔

چنانچہ خیابان ہوٹل میں رہتے ہوئے وہ ایسا مکان تلاش کرنے لگا جو اس کے وسائل کے مطابق بھی ہو اور اس میں رہ کر وہ پینٹ بھی کر سکے لیکن لاہور جیسے شہر میں مکان ایک دو دن میں تو ملتا نہیں' اس کے لئے گلیوں' کوچوں اور محلوں کی خاک چھننا پڑتی ہے۔ فطرت یہ خاک چھاننے لگا۔

ایک روز وہ خاک چھان کر واپس آیا تو کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی' وہ سمجھا شائد کہ کسی دوست نے مکان ملنے کی اطلاع بھجوائی ہے' اس نے اٹھ کر دروازہ کھولا تو ہوٹل کا میلی وردی والا بیرہ کھڑا تھا' اس نے فطرت کو دیکھتے ہی کہا

"بابو جی' نہانا یا منہ دھونا ہے تو دھولو' آٹھ بجے پانی بند ہو جائے گا"

فطرت نے اس اطلاع کا کوئی نوٹس نہ لیا اور بوٹوں سمیت چارپائی پر لیٹ کر خیالات میں کھو گیا' اس نے مختلف مسائل کے بارے میں اپنی سوچ واضح کر لی لیکن دو باتوں کے متعلق اس کا ذہن ابھی واضح نہ تھا ایک یہ کہ آیا تخیق کار کی حیثیت سے وہ برشاور پینٹ کے سہارے زندہ رہ سکتا ہے؟ پروفیسر سعید نے تو اس کی نفی کی تھی جبکہ اس کا اپنا دل اس کی حمایت پر تلا ہوا تھا۔ دوسرا یہ کہ آیا وہ زندگی کی گاڑی کو اکیلے کھینچ سکے گا یا س کے لئے اسے کسی ساتھی کی ضرورت ہو گی' کیونکہ اس نے کئی کتابوں میں پڑھا تھا کہ انسان صرف مادی وسائل کے سہارے زندہ نہیں رہتا' یہ محبت ہی ہے جو مصائب کے گرداب میں انسان کو زندہ رہنے کا حوصلہ دیتی ہے اور یہ محبت ہی ہے جو زندگی کی کشتی کو ڈوبنے سے بچاتی ہے۔ کیا اس کا دل محبت سے خالی ہی رہے گا؟ کیا موقع ملتے ہی جب اس کی ماں اسے شادی کے بندھن میں باندھ دے گی تو محبت کا خالی خانہ خود بخود بھر جائے گا یا اسے محبت اور شادی کو الگ الگ خانوں میں بند رکھنا ہو گا؟ اور آیا یہ بھی ممکن ہے کہ انسان جس سے محبت کرتا ہو اسی سے شادی ہو جائے یا جس سے شادی ہو اسی سے محبت کرنے لگے۔

اس گرداب میں ڈوبتے اور ابھرتے ہوئے اس نے کئی لڑکیوں کے متعلق سوچا' اس نے فیصل آباد کی نسرین اور فرخ کے متعلق سوچا جنھوں نے اسے حقارت سے ٹھکرا دیا تھا اور جب وہ اپنے ماضی کو پیچھے چھوڑ کر موڈرن لاہور میں آ گیا تھا تو زوبی اور آشا نے اسی بہت لفٹ دی تھی' وہ اسے فطری' فطری' کہتی تھیں جس سے کتنی اپنائیت ٹپکتی تھی' زوبی تھری سی فلرٹ لگتی تھی لیکن آشا میں تو کوئی نقص نہ تھا۔ وہ حسین بھی تھی اور باکردار بھی۔ لیکن ماضی کے تلخ تجربوں کے بعد فطرت کو بہت ہی حسین اور بہت ہی امیر لڑکیوں سے ڈر لگنے لگا تھا۔ وہ انہیں دیکھ کر اپنے خول میں گھس جاتا تھا اور وقتی مسکراہٹوں کی دستک سے اپنی دائمی تلخیوں کو نہیں بھولتا تھا۔

اسی سوچ کی رو میں اسے مس نزہت کا خیال آیا' وہ اسے نسرین' فرخ' زوبی یا آشا کی طرح فوراً رد نہ کر سکا۔ یہ نام اس کے ذہن میں اٹک گیا۔ وہ ایک جذباتی رو میں

نیچے اتر آیا اس نے ہوٹل کے دفتر سے جو اس وقت خالی پڑا تھا' مس نزہت کو فون کر دیا۔

"میں فطرت بول رہا ہوں"

URDU4U .COM

"کہاں سے"

"اپنے ہوٹل سے"

"خیریت تو ہے؟"

"میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں"

"کیوں' کیا بات ہے"

"بہت ضروری بات ہے' میں آپ سے مشورہ کرنا چاہتا ہوں"

"ٹھیک ہے' کل ڈیپارٹمنٹ میں آ جاؤ' میں ایک بجے تک وہیں ہوں گی"

"نہیں' مس' میں آپ سے ڈیپارٹمنٹ سے باہر ملنا چاہتا ہوں' انفارمل(Informal) ماحول میں"

"مگر کیوں؟ بات کیا ہے"

"مجھے زندگی کے دو نہایت اہم اور بنیادی مسئلوں پر آپ سے رائے لینی ہے' آپ سے مشورہ کرنا ہے"

"تو کہاں ملنا چاہتے ہو"

"کہیں بھی۔ ڈیپارٹمنٹ سے باہر' یونیورسٹی کے ماحول سے دور"

"کہاں"

"شالیمار باغ'مقبرہ جہانگیر یا باغ جناح' جہاں بھی آپ کہیں"

"پاگل ہو گئے ہو' فطرت یہ میرایج مر ہے باغوں میں ملنے کی"

"تو آپ یہاں آ جائیں۔ میرے ہوٹل میں"

"کہاں۔ کونسے ہوٹل میں"

خیابان ہوٹل کے کمرہ نمبر۲۰۹ میں میکلوڈ روڈ پر"

"توبہ توبہ۔ میکلوڈ روڈ آنا تو اسکینڈل کی دعوت دینا ہے۔ میں وہاں نہیں آ سکتی" "تو

جہاں آپ کہتی ہیں' میں وہاں آ جاتا ہوں"

مس نزہت سوچ میں پڑ گئی' فطرت سمجھا شائد اس نے لائن چھوڑ دی اس نے تقریباً چیختے ہوئے کہا۔

"ہیلو' ہیلو ہے لو"

"چیخو مت' فطرت' میں سن رہی ہوں۔"

"مس نزہت خدا کے لئے مجھے وقت دے دیں۔ میں زندگی کے دوراہے پر کھڑا ہوں' آپ سے مشوارہ کرنا چاہتا ہوں۔ بہت ضرور مشورہ"

مس نزہت نے لمحے بھر کو سوچا پھر اس کی مجبوری کو سمجھتے ہوئے جھجکتے جھجکتے کہا "اگر تم پر ایسی ہی کوئی آفت آ گئی ہے۔ تو کل میرے ہوسٹل میں آ جاؤ۔ پانچ بجے شام"

"تھینک یو' مس تھینک یو"

مس نزہت ایک بہاری خاندان سے تعلق رکھتی تھی جس نے ۱۹۴۷ء میں ہجرت کر کے مشرقی پاکستان کو اپنا گھر بنایا تھا' نزہت کے گھر والے ان چند خوش قسمت بہاریوں میں سے تھے جنہیں ڈھاکہ کی ثقافتی زندگی نے نہیں تو کم از کم کاروباری حلقوں نے خاصی حد تک قبول کر لیا تھا اور وہ تقسیم ہند کے بعد چند ہی برسوں میں اچھے کھاتے پیتے گھرانوں میں شمار ہونے لگے تھے۔

مس نزہت اپنے والدین کی سب سے بڑی بیٹی تھی' اس سے چھوٹے دو بھائی اور دو بہنیں تھیں۔ نزہت اپنے خاندان میں پہلی خاتون تھی جس نے ڈھاکہ سکول آف آرٹ سے ڈپلومہ حاصل کیا اور وہیں ملازمت اختیار کر لی۔ وہیں اس کا معاشقہ سی ڈیپارٹمنٹ کے ایک امریکی لیکچرار مسٹر کوگن سے ہوا جو جلد ہی شادی میں بدل گیا نزہت کے گھر والوں نے اس شادی کی خوب مخالفت کی لیکن اس ضدی اور برسر روزگار لڑکی نے اپنے خاندان کی عزت کو بٹہ لگا کر ایک غیر ملکی سے شادی کر لی جو ان دنوں ایک انہونی

بات سمجھی جاتی تھی۔
مس نزہت عہد جوانی میں خوبصورت رہی ہو گی لیکن اب اس کے سانولے رنگ میں پیلاہٹ غالب تھی اس کے نقش تیکھے اور باریک تھے۔ اس کا قد درمیانہ مگر سجیلا تھا وہ شلوار قمیض میں عام سی عورت لگتی تھی لیکن ساڑھی پہن کر ذرا نکھر آتی تھی' وہ یونیورسٹی میں بہت کم ساڑھی پہن کر آتی تھی۔

URDU4U.COM

پنجاب یونیورسٹی کے فائن آرٹس ڈیپارٹمنٹ میں مشہور تھا کہ مسٹر کوگن چند برس عیاشی کر کے نزہت کو چھوڑ کر چلا گیا تھا' نزہت اپنے کیے پر پچھتا تو سکتی تھی لیکن ڈھاکہ کی سوسائٹی کا سامنا نہیں کر سکتی تھی' اس پر جگہ جگہ انگلیاں اٹھنے لگی تھیں چنانچہ اس نے تنگ آ کر پنجاب یونیورسٹی میں ملازمت کر لی تھی تاکہ اس کا ماضی ہندوستان کے اس پار پٹ سن کر سنہری ریشوں میں ہی الجھا رہے اور یہاں یہ نئی زندگی کا آغاز کر سکے لیکن انسان کو شہرت اور اس کا مقدر کب اسکا پیچھا چھوڑتے ہیں' مس نزہت کی زندگی کے قصے اس کے پیچھے پیچھے لاہور بھی پہنچ گئے تھے بلکہ ان قصوں میں اتنے رنگ بھرے گئے تھے کہ پتہ نہیں چلتا کہ اصل قصہ کہاں ختم ہوتا ہے اور زیب داستان کہاں تک طول کھینچی ہے۔
نزہت نے اپنے آپ کو لاہور کی سماجی زندگی سے بالکل الگ کر رکھا ہوا تھا' وہ ورکنگ ویمن کے ہوسٹل میں رہتی تھی' صبح یونیورسٹی میں پڑھاتی تھی اور شام کو پڑھتی رہتی تھی' اس کا کہیں آنا جانا نہیں تھا اور نہ ہی وہ کسی کو اپنے کمرے میں آنے کی اجازت دیتی تھی لیکن فطرت کا اصرار دیکھ کر اس نے بادل نخواستہ اسے اپنے ہاں آنے کی دعوت دے دی۔
فطرت پورے پانچ بجے مس نزہت کے ہوسٹل پہنچ گیا' ہوسٹل کے چوکیدار نے کوئی سوال پوچھے بغیر اسے مس نزہت کے کمرے میں پہنچا دیا' کمرہ کیا تھا اچھا خاصا ڈرائنگ روم مع بیڈ روم تھا۔ کمرے کی ایک دیوار کے ساتھ خوبصورت پلنگ بچھا تھا جس کے اوپر

نہایت ہی باذوق رنگ کا بیڈ کور پھیلا ہوا تھا' بیڈ کور کے نیچے پلنگ کا ایک کنارہ ضرورت سے ذرا اونچا تھا جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ دو سرہانے لے کر سونے کی عادی ہے پلنگ کے دونوں جانب دو چھوٹے چھوٹے میز تھے جن میں سے ایک پر امریکی ساخت کا ٹیبل لیمپ رکھا تھا اور دوسرے پر جاپانی گلدان جس میں بہ اہتمام خاص آج تازہ پھول سجائے گئے تھے۔ پلنگ کے سامنے قالین بچھا تھا جس کے وسط میں سنٹرل ٹیبل اور کناروں پر بغیر بازو والا چھوٹا سا صوفہ پڑا تھا' سامنے دروازے پر ریشمی اور مخملی دہرے پردے لہرا رہے تھے۔

اس ماحول میں آج مس نزہت خلاف معمول بن ٹھن کر بیٹھی ہوئی تھی۔ بن ٹھن سے مراد کوئی سولہ سنگھار یا زیوروں کی بھرمار نہیں تھی' لیکن اتنا ضرور تھا کہ آج اس نے اپنے آپ پر کچھ توجہ دی تھی' اس نے بادلوں کے رنگ کی ساڑھی اور ہلکے آسمانی رنگ کا بلوؤز پہنا ہوا تھا' اس کے چہرے پر ہلکا سا میک اپ اس کی عمر کو خاص کم عمر دکھا رہا تھا اور اس کے بالوں میں کاسنی رنگ کا پھول تتلی کی طرح اچکا بیٹھا تھا۔

فطرت جس نے سالہا سال سے نزہت کو اس کے ویران چہرے اور سادہ سی شلوار قمیض میں دیکھا تھا' آج اس رنگ کو دیکھ کر خوشگوار حیرت میں پڑ گیا' اسے یوں لگا جیسے یہ سارا اہتمام یہ سارا بناؤ سنگھار اس کے لئے اور صرف اس کے لئے کیا گیا ہے

اسے رہ رہ کر ماضی کے وہ جملے یاد آنے لگے جو وقتاً فوقتاً نزہت کے ہونٹوں سے پھولوں کی طرح جھڑتے رہے تھے اور ان میں فطرت کے لئے کسی نرم گوشے کی نشاندہی ہوتی تھی۔

"فطرت صاحب' آپ پہلے مرد ہیں جو ڈھاکہ سے آنے کے بعد میرے کمرے میں داخل ہوئے ہیں"

"میں اس عزت افزائی کے لئے آپ کا شکر گزار ہوں"

گفتگو ابھی ابتدائی مراحل میں ہی تھی کہ ہوسٹل کا ملازم ایک ڈھپنی ہوئی ٹرے میز پر رکھ گیا۔ نزہت نے ٹرے سے کپڑا اٹھایا تو فطرت چائے کے ساتھ "تکلفات" دیکھ

کر حیران رہ گیا۔

"اس کی کیا ضرورت تھی' مس زہت"

"پچھلے سات سالوں میں یہاں آنے والے تم پہلے مرد ہو۔ شائد آخری بھی' سوچا مہمان نوازی میں کسر نہ رہ جائے۔"

"یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟"

"آپ نہیں سمجھیں گے' فطرت ان باتون کو۔ میں آپ کے لئے چائے بناتی ہوں۔ آپ مجھے بتایئے کہ وہ کیا مجبوری تھی کہ آپ نے مجھے میرا اصول توڑنے پر مجبور کیا۔ کیا مشورہ درکار ہے آپ کو"

"آپ تو ناراض لگتی ہیں۔ میں تو پروفیسر سعید کی طرح آپ کو اپنا دوست اور ہمدرد سمجھ کر آپ سے مشورہ لینے آگیا تھا' مجھے نہیں پتہ تھا کہ میری اس حرکت سے آپ ناراض ہو جائیں گی"

"میں ناراض نہیں ہوں فطرت' آپ مجھے اپنا ہمدرد اور دوست ہی سمجھیں"

"پہلے آپ یہ بتائیں کہ میری باتوں سے ناراض تو نہیں ہوں گی"

"کیا بچوں والی باتیں کرتے ہو۔ اگر میں نے ناراض ہونا ہوتا تو تمہیں یہاں بلاتی ہی کیوں۔ تم بلا جھجک دل کی بات کہو' تم مجھے حسب توقع مخلص اور ہمدرد پاؤ گے"

"تھینک یو۔ پہلی بات یہ ہے کہ مجھے امریکہ جانے سے پہلے اور امریکہ سے آنے کے بعد اپنے ہی ڈیپارٹمنٹ میں نوکری ملنے کی توقع تھی لیکن دونوں دفعہ یہ امید پوری ہوتے ہوتے رہ گئی۔ وجوہات آپ کو بھی معلوم ہوں گی۔ اب میں پینٹنگ میں فری لانسنگ (Freelancing) کرنا چاہتا ہوں' اپنے برش اور کینوس کے سہارے زندہ رہنا چاہتا ہوں۔ میں آپ سے یہ مشورہ لینا چاہتا ہوں کہ آیا ہمارے معاشرے میں یہ ممکن ہے۔ سوال نمبر ایک؟

"اور سوال نمبر دو؟" زہت نے لقمہ دیا

"وہ بعد میں۔ پہلے آپ سوال نمبر ایک جواب دیجئے"

"میرا جواب نفی میں ہے' یہاں تخلیقی عمل ذہنی عیاشی کا ذریعہ تو ہے لیکن روزی کا وسیلہ نہیں۔ میں نہ تو خود سبز باغ دکھاتی ہوں میرا مشورہ ہے کہ جو نوکری ملتی ہے کر لو۔ اور اگر وقت اور پیسہ فالتو ہے تو ہابی کے طور پر پینٹنگ کرتے رہو۔ دوستوں کو تصویریں تحفتاً پیش کرو' وہ تمہاری تصویروں کی نمائش بھی کر دیں گے۔ ایک آدھ آرٹ

کر ٹک (Art critic) کو دوست بنا لو وہ اخبار میں تمہاری تعریف بھی کر دے گا۔ لیکن اگر تم نے اپنی روزی کا معقول انتظام کئے بغیر صرف برش گھسیٹنے پر اکتفا کیا تو ذلیل ہو جائے گے اس معاشرے میں' ٹوٹ پھوٹ جاؤ گے اس سوسائٹی میں"

"مس نزہت' آپ کیا کہہ رہی ہیں"

"میں سچ کہہ رہی ہوں اور اپنا تجربہ بتا ہی رہی ہوں"

"لیکن کلاس میں تو آپ کچھ اور پڑھاتی رہی ہیں' آپ تو آرٹ کی عظمت پر لیکچر دیتی رہی ہیں آپ تو ہمیں فن کے معاملے میں ہر قسم کے دباؤ' پریشر یا مصلحت سے بالا تر رہنے کا درس دیتی رہی ہیں اور اب"

"وہ میری روزی کا ذریعہ ہے' میں جب تک یونیورسٹی کی ملازم ہوں' تمام آنے والے طالب علموں کو یہی سبق دیتی رہوں گی لیکن تم نے میرے گھر آ کر مجھے ایک دوست اور ہمدرد سمجھ کر مجھ سی مشورہ مانگا ہے اس لئے اس مشورے میں مصلحت کی کوئی آمیزش کرنا نہیں چاہتی"

"ت وکیا اس کا مطلب یہ ہے کہ اپنے کیرئیر کے آغاز پر ہی Compromise کر لوں اور اپنی ساری پڑھائی۔ ساری سکھلائی اور سارے مطالعے کی نفی کر لوں"

"آج Compromise نہیں کرو گے تو چند سال ٹھوکریں کھانے کے بعد مصالحت کر لو گے کیونکہ مصالحت کر لینا ہی اس معاشرے میں فنکاروں کا مقدر ہے"

"لیکن

"لیکن ویکن کچھ نہیں' مجھے معلوم ہے تم Non-conformist ہو' عموماً Non-conformist

زندگی میں Compromise نہیں کرتے تم بھی نہیں کرو گے۔
ہر نو عمر تخلیق کار کی طرح تم چاہو گے کہ تخلیق کی دنیا میں زندہ رہو۔ اپنی تخلیق کے حوالے سے پہچانے جاؤ اور ممکن ہو تو اپنی تخلیق کے سہارے زندہ بھی رہو۔ لیکن میں تمہیں زندگی کی تلخ حقیقت بتاتی ہوں اور وہ یہ ہے کہ جتنی جلدی ہتھیار ڈال دو گے' جتنی جلدی اندر کی آگ بجھا لو گے' جتنی جلدی مصالحت اور مصلحت کی راہ پر آ جاؤ گے' اتنے ہی سکھی ہو گے۔ پٹے ہوئے راستوں پر چلنا آسان ہے اور نئے راستے بنانے دشوار"
"آپ مجھے خیا سبق دے رہی ہیں' آپ میری استاد ہیں"
"میں اس وقت تمہاری استاد نہیں' بطور استاد مجھ سے مشورہ مانگو کے تو میں وہی مشورہ دوں گی جو تمام استاد اپنے شاگردوں کو دیتے ہیں۔ یعنی زندگی میں اصولوں پر سمجھونہ نہ کرو' فن کی عظمت کو کسی چیز پر قربان نہ کرو' سچ بولو' خوشامد سے بچو' حق ہمیشہ غالب آتا ہے' بدی اور باطل ہمیشہ شکست کھا جاتے ہیں۔ لیکن سچ پوچھو تو فطرت یہ سب فراڈ ہے' سرا سر فراڈ' یہ سب کتابی باتیں ہیں' عملی زندگی میں باطل اور بدی ہمیشہ شکست نہیں کھاتے' حق ہمیشہ غالب نہیں آتا' خوشامدی ہمیشہ ذلیل نہیں ہوتا"
"مس نزہت' مس نزہت؟"
"فطرت تم نے آج ایک عرصے کے بعد میرے زخموں کے منہ کھول دیئے ہیں' تم میرا سچا اور مخلصانہ مشورہ چاہتے تھے نا۔ میرا تجربہ اور میرا مشورہ یہی ہے"
چائے کی پیالی پڑی پڑی ٹھنڈی ہو گئی' مس نزہت نے اٹھ کر غسل خانے میں پیالی صاف کی اور ٹی کوزی اتار کر تازہ چائے پیالی میں ڈالنے لگی۔
"یہ لو پھل یا یہ کیک چکھو' میں خود خرید کر لائی ہوں' بہت اچھا ہے"
فطرت نے کیک کا ایک پیس اٹھایا اور اسے چائے کے بغیر ہی منہ میں ڈال لیا۔ "کیا تھا تمہارا دوسرا سوال"
"میں آپ کی باتیں سن کر سوچ میں پڑ گیا ہوں کہ دوسرا موضوع چھیڑوں یا نہ چھیڑوں"

"جب اتنی دور سے اتنے اصرار کے بعد وقت طے کر کے آئے ہو تو کہہ ڈالو دوسری بات بھی"
"مجھے آپ سے ڈر لگنے لگا ہے' مجھے معلوم نہ تھا کہ آپ کے اندر کا الاؤ اتنا تیز ہے"
"تم میرے الاؤ کی فکر نہ کرو۔ اپنی کہو' کیا ہے دوسرا سوال؟"
"دوسرا سوال یہ ہے کہ آیا محبت کے بغیر زندگی کی کٹھن راہوں سے گزرنا ممکن ہے؟"

"کیا مطلب؟ میں سمجھی نہیں"
"میں نے کتابوں میں پڑھا ہے کہ جو لوگ مادی آسائشوں کی تلاش میں زندگی گزار دیتے ہیں یا فن کی لگن میں اپنے آپ کو خرچ کر ڈالتے ہیں۔ وہ زندگی سے انصاف نہیں کرتے۔ زندگی کی بنیادی قدر' محبت اور صرف محبت ہے۔ محبت ہی ہے جو انسانی زندگی کے انجن کو پاور مہیا کرتی ہے' محبت ہی ہے جو انسان کو جینے کا حوصلہ دیتی ہے محبت ہی ہے جو"
"روکو ان کتابی باتوں کو فطرت' روکو اپنے احمقانہ شاعرانہ خیالات کو' حقیقت کی طرف آؤ حقیقت کی طرف"
"حقیقت کیا ہے؟"
"حقیقت یہ ہے کہ محبت' عشق' رومانس محض وقتی فتور بن کر رہ گئے ہیں ان جذبوں کا ہمارے طبقے کے لوگوں کی زندگی میں کوئی دخل نہیں ہوتا یہ چونچلے امیروں کے ہیں' اونچے طبقے والوں کے' میرے اور تمہارے جیسے لوگ تو چٹکی بھر آٹے کی خاطر سارا دن چکی پیستے رہتے ہیں اور آٹا پھر بھی مقدر آتا ہے"
"لیکن ایک بات کہوں' برا تو نہیں منائیں گی"
"نہیں مجھ میں تلخ سے تلخ بات سننے کا حوصلہ ہے' تم کہو"
"میرے خیال میں آپ کی ذاتی زندگی میں کسی تلخ تجربے نے محبت سے آپکا اعتماد ختم کر دیا ہے اور اس کے ساتھ مردوں سے بھی"

"انسان ماں کے پیٹ سے تو نظریات ساتھ لے کر نہیں آتا فطرت' زندگی کے تجربے ہی انسان کو وہ سب کچھ سکھا دیتے ہیں جن کا ذکر میں اور آپ کر رہے ہیں"

URDU4U.COM

"کیا آپ کسی شخص کو ایک اور موقع دینے کو تیار ہیں کہ وہ محبت اور سچی محبت کے ساتھ زندگی کی رنگینیوں میں آپ کا اعتماد بحال کر سکے"

مس نزہت ماضی کے کھنڈرات میں کھو گئی۔

فطرت نے اپنی دلیل جاری رکھی

"یہ بڑی انھونی سی بات لگتی ہے لیکن مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ ہمیں ایک دوسرے کی ضرورت ہے"

"فطرت؟"

"جی مس نزہت' میں وان گوف نہیں کہ اپنی محبت کا یقین دلانے کے لئے جلتے چراغ پر اپنی ہتھیلی کی پشت رکھ دوں حتی کہ اس میں جل کر سوراخ ہو جائی لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ محبت کے کرشمے سے ان مرجھائے ہوئے پھولوں پر دوبارہ بہار آ سکتی ہے۔"

"فطرت قبل اس کے کہ تم حد سے تجاوز کر کے میرے اس حصار کو توڑ دو جو میں نے پچھلے سات سالوں سے اپنے گرد بنا رکھا ہے' میں تم سے درخواست کرتی ہوں کہ یہاں سے چلے جاؤ چلے جاؤ پلیز چلے جاؤ"

اس کے ساتھ ہی مس نزہت پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی

"برتن اٹھا لوں بی بی جی" بیرے نے کہا اور جواب کا انتظار کئے بغیر ٹرے اٹھا کر لے گیا فطرت ہوسٹل سے نکل کر ہوسٹل کی طرف روانہ ہو گیا۔

اس رات فطرت بالکل نہ سو سکا' پروفیسر سعید اور مس نزہت کے خیالات اس کے ذہن میں ہتھوڑے بن کر برستے رہے وہ تیقن (Conviction) کے آہن پر ان ہتھوڑوں کو سہتا رہا' لیکن اس کشمکش میں نیند بالکل اڑ گئی' وہ صبح تک جاگتا رہا' اس نے سوچا کہ اسے مس نزہت سے دوسری بات نہیں کہنا چاہئے تھی' یہ یقیناً ایک بچگانہ حرکت تھی

جس کا اس نے لازماً اثر لیا ہو گا۔ اس نے سوچا کہ ڈیپارٹمنٹ کھلتے ہی وہ یونیورسٹی جائے گا اور اس جذبات اور بچگانہ حرکت کی معافی مانگے گا۔

URDU4U.COM

وہ اگلی صبح نہ نہایا نہ شیو کی اور نہ استری شدہ کپڑے پہنے۔ بلکہ صرف خواب آلودہ آنکھوں پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے پھینکے' بالوں میں کنگھی کی اور کاڈرائے کی پتلون اور چمڑے کی کہنیوں والا کوٹ پہن کر یونیورسٹی چلا گیا۔

اپنے ڈیپارٹمنٹ میں داخل ہوتے ہوئے سب سے پہلے مسز نادرہ شیخ کا کمرہ آتا تھا وہیں ڈیپارٹمنٹ کے چپڑاسی نے اس کے ہاتھ میں مسز شیخ کا ایک حکم نامہ تھمایا جس پر لکھا تھا۔

"مسٹر فطرت"

آپ اس ڈیپارٹمنٹ کے استاد ہیں نہ طالب علم' آپ کی حیثیت ایک اجنبی اور غیر مرد کی ہے' آپ کا یہاں آنا جانا ڈیپارٹمنٹ کے ڈسپلن کے خلاف ہے۔ براہ مہربانی پیشگی اجازت کے بغیر آئندہ یہاں آنے کی زحمت نہ کیجئے۔ مسز نادرہ شیخ' ہیڈ آف دی ڈیپارٹمنٹ آف فائن آرٹس"

فطرت پر ایک اور دروازہ بند ہو گیا۔

تقریباً ایک مہینے کی تگ و دو کے بعد فطرت کو ایک مکان ملا۔ وہ بھی لاہور شہر کے مضافات میں۔ بستی کا نام تھا "وارث محلّہ" جو شہر کے سے تقریباً آٹھ میل دور تھا لیکن اس میں ایک سہولت ضرور تھی کہ بس نمبر ۳' ۵ اور ۹ مال روڈ سے ہوتی ہوئی سیدھی وارث محلّہ جاتی تھی اور صرف چار آنے کرایہ لیتی تھی۔ یعنی فطرت اگر روزانہ اپنے مکانسی مال روڈ یا ٹی ہاؤس آنا چاہتا تو پچاس پیسے میں آ جا سکتا تھا۔

مکان بالکل دیسی وضع کی آبادی میں تھا جہاں زیادہ تر غریب لوگ بستے تھے۔ کارخانوں یا کھیتوں میں کام کرنے والے اور کچھ دفتر کے بابو وغیرہ۔ سب محلے میں صرف تین چار مکان ایسے تھے جو نسبتاً امیر لوگوں کو لگتے تھے جن میں سے ایک چوبارہ ماسٹر اللہ دتہ

کا تھا جو کہیں ہیڈ ماسٹر تھے۔ ایک حویلی ملک غلام حیدر کی تھی جو وارث محلّہ کے ارد گرد واقعہ ساری زمین کے مالک تھے اور اکثر لوگوں نے انہی سے زمین خرید کر وہاں اپنے لئے چھوٹے چھوٹے مکان بنوائے تھے۔ تیسرا پکا اور پینٹ کیا ہوا مکان کسی سرکاری افسر کا تھا جو اکثر بند رہتا تھا کیونکہ اس افسر کی نوکری کہیں اور تھی اور وہ کبھی کبھی صرف قبضہ جتانے کے لئے وہاں آیا کرتا تھا۔

جو مکان فطرت کو نصیب ہوا اس کا دروازہ تو بڑا تھا لیکن اندر سے مکان بہت چھوٹا تھا۔ کل دو کمرے اور ایک بیٹھک' ایک غسل خانہ اور ایک باورچی خانہ' غسل خانے اور باورچی خانے کے درمیان نل نصب تھا جسے ہاتھ سے چلانا پڑتا تھا۔ باہر والے گیٹ میں جھریاں اتنی زیادہ تھیں کہ ان میں سے با آسانی اندر باہر دیکھا جا سکتا تھا۔ فطرت کو اس بات کی بڑی کوشی تھی کہ اس کے صحن میں صاف ستھری دھوپ پڑتی تھی اور وہ سردیوں میں دھوپ میں بیٹھ کر پینٹ کر سکے گا۔ اسے پتہ نہیں تھا کہ محلے کے لوگ دروازے کی جھریوں سے اسے پینٹ کرتا دیکھ بھی سکیں گے۔ اگر پتہ تھا بھی تو اس کوئی پرواہ نہ تھی۔ بہرحال اس نے پینٹنگ میں فری لانسنگ (Free lancing) کا جو فیصلہ کر لیا تھا اس کے پیش نظر اس کا خیال تھا کہ اگر لوگوں کو پتہ چل بھی گیا تو اچھا ہے اور کام مل جائے گا۔ نقصان کی کوئی بات نہیں۔

فطرت کا معمول یہ تھا کہ وہ ناشتہ خود بناتا تھا' دوپہر تک پینٹ کرتا' لنچ کے وقت تیار ہو کر باہر نکل جاتا۔ دونوں وقت کا کھانا باہر کھاتا۔ ٹی ہاؤس میں ادبی دوستوں سے ملتا۔ کمرشل کام کے لئے لوگوں سے رابطہ قائم کرتا اور رات کو گھر آتے وقت صبح کے ناشتے کے لئے مکھن' ٹوسٹ یا بند (bun) ساتھ لے آتا۔ صبح وارث محلّہ میں دو دینے والا ایک پاؤ دودھ فطرت کو بھی دے جاتا جس سے اس کی دو وقت کی چائے چل جاتی۔

نیا گھر اور نئے معمولات طے کرنے کے بعد وہ کافی دنوں بعد ٹی ہاؤس گیا تو وہاں سننیر لوگوں کی بجائے چند لونڈے بیٹھے تھے۔ بشارت' فیصل' لبمل اور زبیر۔ جو ادب میں دلچپی

تو رکھتے تھے لیکن ان کا مزاج ابھی تک کالجوں کے لا ابالی لڑکوں جیسا تھا۔ بس مال روڈ سے تین چار پان کاغذ میں بندھوا لئے‘ سگریٹ کا ایک پیکٹ خرید لیا اور ریستوران میں آ کر ایک سیٹ چائے کا آرڈر دے دیا۔ وہ پڑھتے لکھتے کم اور گپ زیادہ لگاتے تھے۔

URDU4U.COM

جونہی فطرت ٹی ہاؤس میں داخل ہوا‘ بشارت نے کہا

"ارے ہمارا آرٹسٹ؟ کہاں کھو گیا تو"

فطرت سے پہلے بسمل نے جواب دیا۔

"نزہت کے ویرانوں میں"

فطرت نزہت کا نام سن کر چونکا اور ان کے اصرار پر انہیں کے میز پر بیٹھے ہوئے کہا۔

"کیا مطلب؟"

بسمل نے کہا "فطرت صاحب‘ اتنے بھولے نہ بنئے‘ مس نزہت کے ساتھ تمہارے معاشقے کے قصے تو ٹی ہاؤس فائن آرٹس ڈیپارٹمنٹ بلکہ پوری یونیورسٹی میں مشہور ہیں‘ چپکے چپکے ہنی مون منانے نہ چلے جانا۔ کم از کم مٹھائی تو کھلاتے جانا"

فطرت نے کہا

"یار‘ شرم کرو۔ اڑاتے ہو تو ات نی بے پرکی نہ اڑایا کرو"

"بھئی تم اسے بے پرکی کہتے ہو۔ کیا تم نے امریکہ سے واپس آ کر اسے ڈیپارٹمنٹ میں پرفیوم پیش نہیں کی تھی جسے لینے سے اس نے پ ہلے تو انکار کر دیا تھا لیکن تمہارے اصرار پر اس نے اسے قبول کر لیا تھا"

"ہم نے تو یہ بھی سنا ہے کہ تم عورتوں کے ہوسٹل میں نزہت کے کمرے میں پہنچ گئے تھے۔ اس دن تم دونوں خوب بنے ٹھنے ہوئے تھے۔ اس نے تکلف بھی کیا ہوا تھا۔ اور یہ رومان دو گھنٹے‘ تنہائی میں پروان چڑھتا رہا۔ جناب عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتے"

فطرت نے ان کی بات ٹوکتے ہوئے کہا:

"بکواس بند کرو۔ میرا تو ایک عرصے سے ڈیپارٹمنٹ میں آنا جانا ہی بند ہے"

"وہ ہم نے بھی سنا ہے۔ وجہ بھی معلوم ہے مسز شیخ نے مس نزہت کے کہنے پر وہاں تمہارا داخلہ بند کیا ہے تاکہ یہ سکینڈل ڈیپارٹمنٹ میں نہ پھیل جائے لیکن ایسی باتیں
URDU4U.COM
کہاں چھپی رہتی ہیں۔ فطرت صاحب"

یہ نوک جھونک جاری تھی کہ دو چار بزرگ ادیب اور شاعر۔ جناب پرکاش لکھنوی' جناب ہمایوں فنا' جناب عابد حیات اور جبا مختار الہی۔ تشریف لے آئے۔ انہیں دیکھتے ہی نوجوانوں کی گپ شپ ٹھنڈی پڑ گئی۔ پروفیسر عابد نے دیکھتے ہی کہا:

"فطرت میاں' بہت دنوں بعد نظر آئے ہو' کیا کر رہے ہو آج کل"

"بس' سر' آپ ہی تلاش میں آیا تھا۔ اگر آپ کے اس وقت ہو تو چند منٹ آپ سے بات کرنا چاہتا ہوں"

"ہاں ہاں' کیوں نہیں ادھر آ جاؤ' اس ٹیبل پر بیٹھتے ہو"

فطرت اور پروفیسر عابد حیات الگ میز پر جا بیٹھے۔

پروفیسر عابد حیات ان بزرگوں میں سے تھے جو پڑھاتے تو ایک ہی کالج میں تھے لیکن لاہور کے تمام طلباء اور سابق طلباء اپنے استادوں کی طرح ان کا احترام کرتے تھے۔ وہ ادبی اور ذاتی معاملات میں رہنمائی حاصل کرنے اکثر ان کے اس آتے رہتے تھے۔ فطرت کے ساتھ وہ خاص شفقت سے پیش آتے تھے اور اس کی تخلیقی صلاحیتوں کی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔

پروفیسر عابد حیات نے بیٹھتے ہی کہا:

"ہاں تو فطرت میاں' کیا شغل ہے آج کل' امریکہ سے واپسی پر تمہارے ساتھ ملاقات ہی نہیں ہو سکی"

"ایک ملاقات ہوئی تھی' سر' حلقہ ادب کے ہفتہ وار اجلاس کے بعد جس کی آپ نے صدارت کی تھی اور جناب مہتاب صاحب نے غزل پیش کی تھی اور اس پر بڑی گرما گرم بحث ہوئی تھی"

"ہاں' ہاں' وہ ملاقات تو فٹ پاتھ کی تھی اور اسے تو ملاقات کہنا بھی زیادتی ہے۔ مجھے

ایک دفعہ تمہارے کسی دوست نے بتایا تھا کہ یونیورسٹی میں تمہاری نوکری کا کچھ بندوبست ہو رہا ہے"

"نہیں سر، وہ تو نہیں ہو سکا"

"کیوں؟ انہیں ایم۔ اے فرسٹ کلاس، امریکہ پلٹ، ہونہار آرٹسٹ سے بڑھ کر کیا چاہئے تھا؟"

"سر چھوڑیئے اس قصے کو، آپ سنایئے"

"نہیں بھئی، میں تو تم سے سننے بیٹھا ہوا ہوں کہ یونیورسٹی کی نوکری نہ سہی، اب کیا کر رہے ہو؟"

"آج کل میں فری لانسنگ کر رہا ہوں"

"فری لانسنگ۔ پینٹنگ میں؟"

"جی سر، پینٹنگ میں!"

"کیسا چل رہا ہے کام"

"کام تو ٹھیک چل رہا ہے۔ میکلوڈ روڈ پر دیپک سینما گھر کے مالک کا بیٹا یعقوب میرا کلاس فیلو رہا ہے۔ اس نے ایک فلم کے سائن بورڈ بنانے کا آرڈر دے دیا تھا میرا فیصل آباد کا ایکدوست ہے ارشد فوہ ٹیکسٹائل ملز کا مالک ہے۔ اس نے گرمیوں کے لئے زنانہ کپڑوں کے پرنٹس ڈیزائن کرنے کو کہا تھا۔ پھر یہیں ٹی ہاؤس میں وحید صاحب ملے تھے وہ کسی رسالے کے ایڈیٹر ہیں انہوں نے دو تین اسکیچ اور ایک ٹائٹل بنانے کا آرڈر دیا تھا"

"پھر تو تم بڑے پاپولر آرٹسٹ ہو۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ انسان برش اور رنگ کے زور پر بھی زندہ رہ سکتا ہے۔ ہم نے تو قلم کے زور پر رہنے کی بہت کوشش کی لیکن ناکام رہے۔ مجبوراً نوکری کر لی لیکن تم نے تو وہ کر دکھایا جو ہماری نسل سے نہ ہو سکا۔ یعنی اپنی تخلیق کے زور پر زندہ رہ رہے ہو۔"

"سر، اسی سلسلے میں تو میں آپ سے بات کرنا چاہتا تھا"

"کہو"

 © Urdu4U.com

"بات یہ ہے کہ اس کام سے پیٹ کی آگ بجھانے کے لئے پیسے مل جاتے ہیں لیکن ذہن مطمئن نہیں ہوتا۔ جس دن سے میں نے یہ کام شروع کیا ہے میرے اندر ایک کشمکش (Conflict) پیدا ہو گئی ہے۔ میں بار بار سوچتا ہوں کہ آیا میں نے زندگی کے بائیس تیئس سال اسی کام کے لئے صرف کئے تھے کہ میں جب پڑھ لکھ جاؤں گا 'آرٹ کی تاریخ' آرٹ کی باریکیوں اور آرٹ کی اہمیت سمجھ جاؤں گا تو "بالم کب آؤ گے" جیسی فلموں کے پوسٹر بناؤں گا۔ میں جو اپنے آپ کو روح کا پینٹر بنانا چاہتا تھا اور انسانی دکھوں کو زبان بخشنے کا مشن لے کر چلا تھا۔ میری صلاحتیں فلم ایکٹریس کی نیم برہنہ مخروطی ٹانگیں اور ابھرے ہوئے سینے کو پینٹ کرنے پر صرف ہو رہی ہیں اور جب میں یہ پوسٹر بادل ناخواستہ بنا کر یعقوب کے باپ کے پاس لے جاتا ہوں تو وہ کہتا ہے "ہیروئن کا پوز سیکسی نہیں بنا' تماش بینا یسی ڈل تصویر کو دیکھ کر ٹکٹ کیوں خریدیگ ا" سر' میں سخت Conflict میں ہوں۔ میرے اندر کا آرٹسٹ مجھے ملامت کر رہا ہے۔ میرے خلاف بغاوت کر رہا ہے۔ وہ مجھے بار بار جتا رہا ہے کہ میں پلاسٹک کی عورتوں کے پورٹریٹس میں جان ڈالنے کے لئے پیدا نہیں ہوا۔ میں 'بالم کب آؤ گے' کے پوسٹربنانے کے لئے اس دنیا میں نہیں آیا۔ اللہ نے مجھے جو فن اور صلاحیت دی ہے وہ ایکٹریسوں کو سیکسی دکھانے کے لئے عطا نہیں کی۔ یقیناً میری تخلیق سے خالق حقیقی کا مقصد کچھ اور ہو گا۔ میں نے بہت محنت کی ہے۔ بہت دکھ دیکھا ہے۔ بہت کچھ سوچا ہے۔ میں آرٹ کی دنیا میں کچھConftribute کرنا چاہتا تھا۔ انسانی دکھوں' غموں اور اندوہوں کو زبان دینا چاہتا تھا جس کے لئے پہلے میں نے شاعری کی۔ لیکن جب میں نے محسوس کیا کہ میرے الفاظ گونگے ہو رہے ہیں اور وہ میرے جذبات کی عکاسی پوری شدت کے ساتھ نہیں کر رہے تو میں نے پینٹنگ کو ایک میڈیم کے طور پر اپنایا کیونکہ یہ میڈیم میرے خیال میں شاعری کی نسبت زیادہ بلیغ اور موثر ہے لیکن میں محسوس کرنے لگا ہوں کہ میں تھرڈ ریٹ سائن بورڈ اور وائل اور لان کے پرنٹس بنانے میں اپنے آپ کو Waste کر رہا ہوں"

پروفیسر عابد حیات فطرت کی باتیں غور سے سن رہے تھے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا جواب دیں۔ انہوں نے فطرت کو رکتے دیکھ کر کہا۔

URDU4U.COM

"اور؟"

"اور یہ کہ مجھے کبھی کبھی یوں محسوس ہوتا ہے کہ تخلیق کاروں کے خلاف یہ معاشرے کی ایک سازش ہے۔ ایک Conspiracy ہے کہ ہر حساس شخص کو' جو معاشرے کے مظالم' معاشرے کے جبر اور معاشرے کی زیادتیوں کو سمجھنے اور انہیں بے نقاب کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ خواہ وہ شاعر ہو' ادیب ہو یا مصور' اسے روٹی کے چکر میں اس حد تک مبتلا کر دو کہ وہ اپنے اصل مشن کی طرف توجہ نہ دے سکے۔ ادھر دیکھئے زندگی کے دوسرے کنارے پر جہاں امیر لوگ رہتے ہیں۔ پہروں بلئیرڈ یا برج کھیلتے ہیں یا اس کی کا پیگ سامنے رکھ کر سگار پیتے رہتے ہیں۔ انہیں کوئی غم روزگار نہیں ہوتا۔ انہیں رزق کی کوئی فکر نہیں ہوتی۔ قدرت نے انہیں یہ فراغت' یہ فارغ البالی اور یہ فرصت اس سمجھوتے کے تحت عطا کی ہے کہ وہ کسی قسم کی زیادتیوں' ناہمواروں اور ناانصافیوں کے خلاف کبھی زبان نہیں کھولیں گے۔ کیوں سر' میں غلط کہہ رہا ہوں کیا؟"

"تم بہت آگے چلے گئے ہو۔ Frustrate ہم بھی ہوئے تھے لیکن ہمیں قدرت پر سازش کا الزام دھرنے کی جرات کبھی نہیں ہوئی تھی"

"میں خدا نخواستہ کا فریاد ہریہ نہیں ہوں۔ میں پکا مسلمان ہوں۔ ابھی چند ماہ پہلے عمرہ کر کے آیا ہوں۔ خدا تعالی اس کی آخری کتاب اور اس کے آخری نبی ؐ پر ایمان رکھتا ہوں لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا"

"یہ نہ پہلے کسی کو سمجھ میں آیا ہے نہ تمہاری سمجھ میں آئے گا"

"تو میرے لئے کیا مشورہ ہے آپ کا؟"

"بس یہی' کہ سوچنا چھوڑ دو"

"یہ کیسے ممکن ہے' سر' آدمی ساری عمر تعلیم حاصل کرتا ہے۔ کتابیں پڑھتا ہے۔ علمی

بخشیں کرتا ہے تاکہ اس میں سوچ کا عنصر فروغ پا سکے۔ وہ حیوانوں سے مختلف زندگی گزار سکے۔ اور اب آپ مجھے مشورہ دے رہے ہیں کہ سوچنا چھوڑ دوں یہ تو ناممکن لگتا ہے۔"

URDU4U.COM

"اچھا' اگر یہ نہیں کر سکتے تو سوچو ضرور مگر اس کا اظہار کرنا بند کر دو"

"یعنی نہ لکھوں نہ پینٹ کروں"

"ہاں' اپنے خیالات کو اپنے تک محدود رکھو' اپنی سوچ کو اپنے ذہن کی فصیل میں مقفل کر لو۔ اظہار کرو گے تو لوگوں کو تکلیف ہو گی۔ دوسرے بے نقاب ہوں گے تو انتقام لینے کی کوشش کریں گے۔ یاد رکھو' فطرت! یہ سزا بڑی کڑی ہو گی۔ میری زندگی کے تجربوں کا نچوڑ یہ ہے کہ اول تو سوچنا چھوڑ دو اور اگر یہ نہیں کر سکتے تو اپنی سوچ کے اظہار پر خود پابندی لگا دو۔ سخت پابندی"

"یعنی اپنے ذہنی پریشر کُکر کا ڈھکنا خود کس دوں؟"

"ہاں"

"اور اس کے نیچے سوچ کی آنچ کی جلتی رہنے دوں"

"ہاں"

"اور اسی پریشر کُکر کی آنچ میں جلتا رہوں۔ گلتا رہوں' سڑتا رہوں"

"ہاں۔ ہمارے معاشرے میں تخلیق کار کا یہی مقدر ہے"

فطرت کی بھوری بھوری آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے وہ ایک گہری اور لمبی سانس لے کر خاموش ہو گیا۔

ایک دن فطرت اپنے مکان کے صحن میں بیٹھا کچھ پینٹ کر رہا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ فطرت کو اس دستک پر تعجب ہوا۔ کیونکہ پچھلے پانچ مہینوں میں اس کے دروازے پر کسی نے دستک نہیں دی تھی۔ سوائے خاکروب اور دودھ والے کے' جو صبح ہی صبح آتے اپنا کام کرتے اور چلے جاتے۔ اس کے بعد فطرت ہوتا اور اس کی پینٹنگ۔ محلے میں اس کی زیادہ علیک سلیک بھی نہ تھی۔ لے دے کر ایک کھوکھے والا اب ابا غلام

محمد (عرف گاما) اس کا واقف تھا جس سے وہ وقت بے وقت سگریٹ یا پان خرید لیتا تھا اور وہ اب اتنا اعتبار کرنے لگ گیا تھا کہ اگر کسی وقت فطرت کے پاس ٹوٹے ہوئے پیسے نہ ہوتے تو وہ کہہ دیتا "کوئی بات نہیں' بابو جی' پیسے آ جائیں گے' تم جاؤ"

فطرت پینٹنگ چھوڑ کر ہاتھ میں برش لئے دروازے پر پہنچا' جھریوں سے باہر دیکھا تو اسے ایک اجنبی سا چہرہ نظر آیا۔ اس نے دروازہ کھولا تو مزدور نما لڑکے نے کہا:

"بابو' تم پینٹ کرتے ہو"

فطرت لمحے بھر کے لئے سوچ میں پڑ گیا۔ پھر اپنے ہاتھ میں اپنے پیشے کی گواہی (برش) دیکھ کر کہا:

"ہاں' میں پینٹر ہوں' کیا بات ہے"

"تمہیں ملک صاحب نے ملایا ہے"

"کون ملک صاحب"

"ملک غلام حیدر صاحب' اس محلے کے مالک' تم نہیں جانتے انہیں' وہ جنھوں نے نئی حویلی بنائی ہے"

"ہاں' کیا کام ہے"

"ویسے تو ان کی کوٹھی کا سارا کام ہو گیا ہے لیکن باہر والی حویلی کا گیٹ رہ گیا ہے پینٹ کرنے کے لئے انہیں سبز رنگ پسند ہے۔ پوچھ رہے تھے کہ پینٹ تمہارا اپنا ہو گا یا وہ خرید دیں"

فطرت کا جی چاہا کہ وہ برش اس لڑکے کے منہ پر دے مارے لیکن پھر اس نے سوچا کہ بیچارے لڑکے کا کیا قصور ہے۔ وہ تو خود مزدور ہے۔ اسے ملک نے پیغام دینے کو کہا اور وہ چلا آیا۔

"جی بابو جی' ملک صاحب کو کیا جواب دوں"

"انہیں کہنا' میں یہ کام نہیں کر سکتا"

"دیکھ لو! بابو جی' ملک صاحب کا حکم ہے' آج تک ملک صاحب کو کسی نے کسی کام

کے لئے نہیں کی۔ سوچ لو' وہ بڑے غصے والے ہیں"
"ٹھیک ہے بھئی' تم جاؤ میرا وقت ضائع نہ کرو"
مزدور نما لڑکا واپس چلا گیا اور فطرت دوبارہ پینٹنگ میں مصروف ہو گیا۔

URDU4U.COM

گرمیوں کی ایک رات وہ ٹی ہاؤس سے بہت دیر سے لوٹا۔ وارث محلے کو آنے والی آخری بس بھی جا چکی تھی۔ فطرت مجبوراً رکشے پر آیا اور سڑک کی بجائے گلی کے موڑ پر جا اترا۔ اس وقت لوگ نماز تراویح پڑھ کر واپس آ رہے تھے۔ ان کے سفید کپڑے چاندنی رات میں بہت سفید لگ رہے تھے۔ انہوں نے رکشے کی "پھٹ پھٹ" سنی تو سب اس کی طرف دیکھنے لگے۔ فطرت نے نمازیوں کی طرف کوئی توجہ نہ دی اور پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈالے' سر کے بال لٹکائے' گلی میں چلا گیا۔ گھر پہنچ کر دروازہ کا تالا کھولا اور کپڑے بدل کر لیٹ گیا۔

اگلی صبح وہ خاصی دیر سے جاگا۔ جاگ کر بھی وہ بستر پر لیٹا رہا۔ ساتھ والے کمرے کا درمیانی دروازہ کھلا تھا۔ وہاں کئی مکمل اور نامکمل تصویریں رکھی تھیں۔ ایک تو ٹی ہاؤس کے کسی دوست کی فرمائش تھی جس نے اپنی گرل فرینڈ کی تصویر سے اس کا پورٹریٹ بنانے کو کہا تھا جو فطرت نے تین چوتھائی مکمل کر لیا تھا۔ صرف آنکھوں پر کچھ کام کرنا باقی تھا۔ دوسری تصویر8یں زیادہ تر فلمی کرداروں کی تھیں جو یعقوب کے باپ نے بنانے کو کہی تھی۔ فطرت کی روزی کا ذریعہ یہی فلمی تصویریں تھیں جو بڑے بڑے کینوس پر شوخ رنگوں میں بنائی گئی تھیں۔ اکثر اداکاراؤں کے پوز خاصے تیکھے تھے۔ رانوں تک لچا اترا ہوا' سینے پر بلوز ایک طرف کو ڈھلکا ہوا' پیچھے ایک مردانہ ہاتھ اداکارہ کو اپنی لپیٹ میں لیتا ہوا

اصل تصویریں جو فطرت پینٹ کرنا چاہتا تھا وہ ابھی تک اس کے ذہن میں دبی بیٹھی تھیں۔ اسے ابھی تک وہ سکون اور فرصت نصیب نہ ہوئی تھی جس میں وہ اپنے اصل شاہکار تخلیق کر سکتا۔ ابھی تک وہ کمرشل آرٹ پر اپنا وقت ضائع کر رہا تھا کیونکہ اگر وہ

یہ کام نہ کرتا تو اپنی ضروریات زندگی کیسے پوری کرتا۔ اسے باربار خیال آ رہا تھا کہ جونہی حالات سازگار ہوئے وہ ضرور اپنی پسند کی تصویریں بنانا شروع کر دے گا۔ تخلیقی آگ سے بھرپور' زندگی سے قریب' حقیقت کی آئینہ دار تصویریں۔

URDU4U.COM

ماہ رمضان کی وجہ سے ابھی تک مسجد کے لاؤڈ اسپیکر سے آواز آ رہی تھی پہلی نماز فکر کے بعد تلاوت قرآن مجید ہوتی رہی۔ پھر ان آیات کی تفسیر بیان کی جاتی رہی اور اب مولوی صاحب ان آیات پر مبنی تقریر کر رہے تھے' وہ فرما رہے تھے:

"اللہ تعالی بڑا غفور الرحیم ہے۔ اس میں اور اس کے بندوں میں یہی فرق ہے کہ اس کے بندے ذاتی رنجشوں اور ناراضگیوں سے تنگ آ کر انتقام پر اتر آتے ہیں۔ بنی نوع انسان کے لئے عرصہ حیات تنگ کر دیتے ہیں۔ لیکن اللہ غفور الرحیم ہے۔ وہ اپنے بندوں' اپنے گنہگاروں سے بھی نفرت نہیں کرتا وہ قادر مطلق ہے۔ جو چاہے کر سکتا ہے لیکن وہ کسی گنہ گار سے انتقام نہیں لیتا۔ اس سے اس کی روزی ن ہیں چھینتا' اس پر عرصہ حیات تنگ نہیں کرتا۔ وہ عفو اور توبہ کے دروازے ہر وقت کھلے رکھتا ہے"

فطرت پر اس وعظ کا گہرا اثر ہوا۔ اس نے سوچا کہ وہ آج ہی اپنے گناہوں سے توبہ کر لے گا۔ کل سے ضرور روزہ رکھے گا۔ اگر اس کی سحری کا کوئی بندوبست نہ ہوا تو وہ رات کو ایک کی بجائے دو بند (buns) لے آیا کرے گا اور دودھ گرم کر کے روز رکھ لیا کرے گا۔ "اللہ تعالی میری کوتاہیوں کو معاف کرے۔ وہ واقعی بڑا درگزر کرنے والا ہے"

وہ اصلاح کے یہی پروگرام بنا رہا تھا کہ دروازے کے باہر اسے شور سنائی دیا۔ وہ سمجھا شائد لوگ وعظ سن کر اپنے اپنے گھروں کو جا رہے ہیں۔ لیکن بتدریج یہ شور اس کے دروازے کے قریب آتا گیا۔ فطرت کرتے پاجامے میں لیٹا ہوا تھا۔ اسی طرح اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اچانک اس کے دروازے پر زور زور سے مکے برسنے کی آواز آئی۔ اس کے ساتھ ہی ملی جلی آوازیں سنائی دیں:

"نکالو اس خبیث کو یہاں سے' نکالو اس خبیث کو"

"تصویریں بنانا حرام ہے۔ تصویریں بنانا حرام ہے"
"بت تراشی کفر ہے' بت تراشی کفر ہے"
"کافروں کو باہر نکالو۔ محلے کو پاک کرو۔ نعرہ تکبیر۔ اللہ اکبر"

اس کے ساتھ ہی دو تین نوجوان ململ کی سفید ٹوپیاں پہنے دیوار پھلانگ کر اندر پہنچ گئے۔ انہوں نے باہر والے دروازے کی کنڈی کھول دی۔ اور چالیس پچاس آدمیوں کا ایک ریلا صحن میں گھس آیا۔ ان میں سے کسی کی نظر نیم وا دروازے سے بعض مکمل شدہ اور بعض نامکمل تصویروں پر پڑی' وہ چیخا:

"وہ ہے بت کدہ"
دوسرا بولا "جلا دو اسے' مٹا دو اسے"
تیسرے نے کہا "پھاڑ دو' ہٹا دو' جلا دو' محلے کو پاک کر دو"

اس حملے میں ساری تصویریں تباہ برباد کر دی گئیں۔ وہ تصویریں بھی جن میں فطرت کی روزی تھی۔ آج اس نے دو تصویریں دے کر اپنے مہینے بھر کی مزدوری لینی تھی لیکن اس ہیجانی ماحول میں کسی کو کسی روزی کا خیال نہ آیا۔ ہر چیز تہس نہس ہو گئی۔ فطرت نے بڑی مشکل سے غسل خانے میں چھپ کر جان بچائی۔

اس سارے ہنگامے میں صرف ایک آواز بابا گاما کھوکھے والے کی تھی جو کہہ رہا تھا "چلو چھوڑو' کافی ہو گئی' چلو' چھوڑو"

بابا گاما بھی تراویح کے وقت اپنے کھوکھے پر بیٹھا سگریٹ اور بوتلیں بیچتا رہتا تھا لیکن ہجوم کے غصے کا رخ اس کی طرف کبھی نہ ہوا۔ پتہ نہیں کیوں ان کے غصے کا نشانہ فطرت ہی بنا۔ شاید وہ آوٹ سائڈر (Outsider) تھا اجنبی' کسی اور دنیا کا باسی' جو ان کی صفوں میں سما نہ سکتا تھا۔

جب وہ سب اپنا جہاد پورا کر کے چلے گئے تو فطرت ڈرتے ڈرتے غسل خانے سے نکلا۔ دروازے پر آیا' اندر سے کنڈی لگانے سے پہلے اس نے باہر دیکھا تو ملک غلام حیدر صاحب اپنی حویلی کے سبز گیٹ پر کھڑے مسکرا رہے تھے۔

فطرت ملک صاحب کی شرارت کی سمجھ گیا۔ اس نے وارث محلّہ چھوڑ دیا۔ وہ کچھ عرصے کے لئے گاؤں چلا گیا۔

فطرت شہر کے تھپیڑے کھا کر عیدالفطر سے پہلے ہی اپنے گاؤں پہنچ گیا۔ ریشماں اپنے

URDU4U.COM

بیٹے کو غیر متوقع طور پر دیکھکر بہت خوش ہوئی۔

"کیوں بیٹا' اس مرتبہ عید کی زیادہ چھٹیاں ہو گئیں۔"

"ہاں امی' کچھ زیادہ ہی چھٹیاں ہو گئیں۔"

"کتنی چھٹی ملی؟"

"بس عید تک' عید کے بعد چلا جاؤں گا۔"

"بھلا ہو ترے افسروں کا' پہلے ہی چھٹی دے دی' چند دن میرے پا سبھی رہ لے گا میرا بیٹا"

ماں بیٹا یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ گاؤں کے لوگ ملنے آ گئے۔ ان کے جائزے کے مطابق برسرروزگارفطرت کی گاؤں میں یہ پہلی آمد تھی۔ وہ ایم۔ اے کا امتحان دیکر آیا تھا۔ پھر وہ امریکہ میں پڑھائی کر کے واپس آیا تھا اور بیچ میں دو تین مرتبہ نوکری کابندوبست کرتے کرتے واپس آیا تھا۔ اب پہلی مرتبہ چھ ماہ بعد "کماؤ" فطرت گاؤں آیا تھا اور گاؤں کے برسرروزگار سپوتوں کی روایت یہ تھی کہ وہ آتے وقت مٹھائی یا پھل کی ٹوکری ساتھ لاتے تھے جو ملاقات کے لئے آنے والوں میں دانہ بہ دانہ تقسیم کر دی جاتی تھی۔

فطرت اس روایت پر بھی پورا نہیں اترا تھا اور گاؤں کی کئی عورتیں مبارکباد کے بعد خالی ہاتھ اور خالی منہ جاتے ہوی بڑبڑا رہی تھیں کہ "جیسی ماں کنجوس' ایسا ہی پتر کنجوس نکلا' پتلون کس کر خالی ہاتھ گھر آگیا جیسے کوئی مردہ دفن کر کے آتا ہے"

کچھ عورتیں اور مرد اس انتظار میں بیٹھے رہے کہ فطرت اپنی نئی نوکری کی بات کرے گا۔ نئے بنگلے اور نوکروں چاکروں کی بات کرے گا۔ اپنی اتھارٹی اور شان کے قصے سنائےگا۔ صغراں کا بیٹا لطیف تحصیل دار بھرتی ہوا تھا اور کہتا تھا کہ اس نے بڑی بڑوں کو تین

مہینے کے لئے اندر کر دیا تھا۔ آخر پاور ہوئی نا' اس کی' ان کا خیال تھا کہ تعلیم کے حساب دی دیکھا جائے تو فطرت لوگوں کو تین تین سال تک قید کر سکتا ہو گا۔ لیکن فطرت نے اپنا رعب جتانے کی کوئی بات نہ کی۔ وہ عموماً خاموش بیٹھا لوگوں کی باتیں سنتا رہتا اور ملاقاتی اس کی خاموشی کو اس کے غرور اور تکبر سے منسوب کر کے منہ پھیلائے واپس چلے جاتے۔

خدا خدا کر کے عیدالفطر آئی۔ فطرت نے گاؤں والوں کے ساتھ مل کر مسجد میں نماز عید ادا کی۔ رسمہ لوگوں سے گلے ملا لیکن دراصل اس کے دل کی کلی ابھی تک مرجھائی ہوئی تھی۔ وہ لاہور والے صدمے سے ابھی تک نکل نہ سکا۔ وہ رہ رہ کر اپنی پڑھائی' اپنے مشن اور اپنے اندر جلنے والی تخلیقی آگ اور معاشرے کے رویئے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اسے اس مسئلے کا کوئی حل نظر نہیں آ رہا تھا۔ لیکن وہ ہار ماننے کو تیار نہ تھا۔ وہ اپنا جہاد آرٹ کی دنیا کا جہاد جاری رکھنا چاہتا تھا۔

نماز عید کے بعد پھر کئی لوگ فطرت کے گھر جمع ہو گئے اور اپنے اپنے مطلب کی باتیں کرنے لگے۔

چوہدری نواب خاں نے حقہ کا کش لیتے ہوئے کہا

"پتر' لاہور ہوتے ہو' نا"

"جی"

"کہاں رہتے ہو' میرا اکثر لاہور کا چکر لگتا رہتا ہے"

"جی دراصل جی' میں فی الحال تو ایک دوست کے پاس ٹھہرا ہوا ہوں لیکن عنقریب مکان مل جائے گا"

"ہاں' تمہیں مکان مل گیا تو خیر تمہارے پاس ٹھہرا کریں گے۔ لیکن فی الحال تم ایک کام کرنا"

"جی چاچا جی"

"ہائی کورٹ میں میرا ایک مقدمہ چل رہا ہے کوئی چھ سات سال سے' ذرا جج کو ٹیلی

فون کر دینا کہ ابوہ نہ لٹکائے اس مقدمے کو۔ جلدی فیصلہ کرے اور ہمارے حق میں کرے۔ زمین تو پہلے ہی ہمارے پاس ہے۔ قبضہ بھی ہمارا ہے لیکن نورالٰہی ویسے ہی شریکے کی خاطر ٹانگ اڑائے ہوئے ہے۔ ہاں جج کو ساری بات سمجھا دینا' اندر کی بات' وہ تمہاری بات ضرور مان جائے گا۔"

URDU4U.COM

فطرت "ہوں ہاں" کرتا رہا۔

چاچی نور بیگم نے کہا۔

تم پڑھتے تھے تو ہمارے گھر چوری ہو گئی تھی' بہت کچھ لے گئے تھے چور' زیور' نقدی' کپڑے' کھیس' ہر شے' تیرے چاچا نے بڑی کوشش کی بڑا دوڑا بھاگا پیسے بھی دیئے لیکن چوری برآمد نہ ہوئی۔ ہمارا بہت نقصان ہو گیا تھا لیکن سفارش کے بغیر چوری کیسے برآمد ہوتی ہے۔ سنا ہے کہ پولیس والوں کا بڑا افسر لاہور میں بیٹھتا ہے۔ وہیں جہاں تم نوکری کرتے ہو۔ کسی دن اسے ملنا۔ بلکہ جاتے ہی نملنا اور کہنا ہماری چوری برآمد کرا دے۔ اوپر سے ڈنڈا چلے تو پولیس والے فوراً کام کر دیتے ہیں۔ ہاں"

مائی برکتے بولی

"میرا پوتا رزاق آٹھویں جماعت میں فیل ہو کر کئی سال سے گھر بیٹھا ہوا ہے سارا دن آوارہ گردی کرتا رہتا ہے۔ اب تو اس کی حرکتوں پر شکایتیں بھی آنے لگی ہیں۔ اسے کسی جگہ لگوا دے۔ اچھی سی نوکری۔ یہی پانچ چھ سو روپے کی۔ ہمیں کچھ نہ دے۔ خود اپنا آپ تو سنبھالے ریشماں تو بھی بول نا' اپنے پتر سے سفارش کر دے"

ریشماں نے بھی مائی برکتے کی ہاں میں ہاں ملا دی اور فطرت نے "جی ہاں' جی ہاں" کر کے بات ٹال دی۔

باتوں کی یہ گولہ باری ختم ہوئی تو ریشماں کھانستی ہوئی فطرت کے پاس آ بیٹھی۔

"بیٹا تو نے سب کی سفارشیں اور سب کے کام سن لئے' ایک میری بھی سن"

"وہی شادی والی بات؟"

"وہ بات تو ہے ہی' تم نے وعدہ بھی کر رکھا ہے' لیکن میں کچھ اور کہہ رہی ہوں"

"وہ کیا"

"اپنی سکینہ ہے نا"

"کون سکینہ"

"کمال کرتے ہو تم' سکینہ تمہاری بہن۔ تمہاری دوہری بہن خالہ کی بیٹی اور دودھ شریک بہن"

URDU4U.COM

"کیوں کیا ہوا اسے؟"

"وہ ابھی تک بیمار ہے"

"وہ تو کھاتے پیتے لوگ ہیں' علاج کیوں نہیں کراتے؟"

"انہوں نے بہت علاج کرائے ہیں۔ پہلے حکیم کا علاج کرتے رہے۔ پھر تعویذ بھی منگوا کر پہنائے۔ پھر ہومیوپیتھک ڈاکٹر کو دکھایا لیکن دن بدن وہ پیچھے ہی پیچھے جا رہی ہے۔"

"پھر؟"

"شہر والے ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ اسے لاہور لے جاؤ' لاہور وہاں بڑے بڑے ڈاکٹر ہیں شاید کچھ فرق پڑ جائے۔ انہوں نے تو اسے لا علاج کر دیا ہے"

"ہوں"

"تمہاری خالہ آئی تھی پچھلے اتوار کو' وہ کہہ رہی تھی کہ اب فطرت نوکر ہو گیا ہے اور لاہور میں ہے۔ شاید ہماری اور سکینہ کی قسمت کی وجہ سے اسے لاہور میں نوکری ملی ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ وہ اسے تمہارے پاس لے آئے۔ تمہاری نگرانی میں اس کا علاج کرائے۔"

"ہاں' ہاں' یہ ٹھیک ہے لیکن فی الحال نہیں ابھی مجھے ذرا سیٹ ہو لینے دو' پھر انشاء اللہ ضرور سکینہ بہن کا علاج کرائیں گے"

"خوش رہ بیٹا' خوش رہ' اللہ تعالی تجھے جزا دے لیکن ذرا جلدی بندوبست کرنا' سکینہ کی تکلیف بہت بڑھ گئی ہے"

"فکر نہ کرو' امی"

عید کے دوسرے دن فطرت لاہور واپس آ گیا

گاؤں میں طعنوں کی بھرمار سے تنگ آ کر فطرت لاہور پہنچا تو سب سے پہلے مکان تلاش کرنے لگا کیونکہ اس کے بغیر آگے کام چلنا ممکن نہ تھا۔ اس نے عارضی طور پر اپنا سامان خیابان ہوٹل میں رکھا اور پہلے کی طرح مکان ڈھونڈنے میں سرگرداں ہو گیا۔ اتفاق سے اسے بہت جلد سانده کلاں میں ایک مناس سا مکان مل گیا۔ مالک مکان مقامی دکاندار اور صوم و صلوۃ کا پابند شخص تھا۔ اس نے کسی ایجنٹ یا پراپرٹی ڈیلر کی وساطت کے بغیر فطرت کو اپنا مکان پیش کر دیا۔ مناسب کرایہ بتایا اور صرف ایک مہینے کا ایڈوانس طلب کیا۔ بلکہ ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ میرا گھر زیادہ دور نہیں اگر کسی چیز کی ضرورت ہو تو بلا تکلف میرے گھر سے منگوا لینا۔

یہ سارا کام حیران کن سرعت اور خوشگواری کے ساتھ طے پا گیا۔ فطرت نے ڈیڑھ سو روپے مالک مکان کی ہتھیلی پر رکھے اور اس سے چابی وصول کی۔ آخر میں فرشتہ سیرت مالک مکان نے پوچھا:

"گھر والوں کو کب تک لے آؤ گے۔ بابو جی"

"جی؟ جی، گھر والے تو گاؤں میں، والدہ بوڑھی اور بیمار ہیں"

"اور بیوی بچے؟"

"جی، وہ تو نہیں ہیں۔ میری ابھی شادی نہیں ہوئی"

یہ جواب سن کر مالک مکان کا رویہ فوراً بدل گیا۔ اس نے شرافت اور شائستگی کے تمام تقاضوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے ایک جھپٹا مارا اور فطرت کے ہاتھ سے چابی چھین لی۔ اس کا ڈیڑھ سو روپیہ اس کے منہ پر دے مارا اور کہا:

"نکل جاؤ یہاں سے لچے لفنگے، بودے (لمبے بال) رکھ کر آ جاتے ہیں شریفوں کے محلے میں"

"جی میں لچا لفنگا نہیں، میں آرٹسٹ ہوں"

"میں کچھ نہیں سننا چاہتا۔ یہ شریفوں کا محلّہ ہے۔ یہاں آوارہ گردوں، شہدوں اور لفنگوں کا کوئی کام نہیں۔ جا، جا بھاگ جا یہاں سے"

URDU4U.COM

فطرت اپنا سامنہ لے کر وہاں سے نکل آیا۔
کچھ دنوں کے بعد ایک پراپرٹی ڈیلر کی ضمانت پر سنت نگر میں اسے ایک مکان مل گیا جو سانده کلاں والے مکان سے تیس روپے منگا تھا لیکن شہر سے زیادہ دور نہیں تھا۔ مکان چھوٹا تھا مگر صاف ستھرا۔ بجلی تھی' کارپوریشن کا نلکا تھا۔ صحن تھا' باورچی خانہ' برآمدہ تھا اور دو کمرے تھے۔ فطرت نے اسے اپنی ضرورتوں کے عین مطابق پایا اور مالک مکان کی شرائط پر اسے کرائے پر لے لیا۔
اس نے وارث محلّہ والا بچا کھچا سامان۔ دو چار پائیاں' ایک میز' دو کرسیاں ایک بالٹی اور بجلی کا ایک چولہا اپنے نئے گھر میں سجایا اور کام کی تلاش میں نکل گیا۔ اب اسے جو کام ملا وہ پہلے سے ذرا مختلف نوعیت کا تھا۔ گلبرگ کے ایک صاحب نے اپنی مرحوم بیگم کی تصویر دی کہ اس کو سامنے رکھ کر پورٹریٹ بنا دے۔ ایک پبلشر نے اسے پچاس پچاس روپے کے عوض تین کتابوں کے گرد پوش بنانے کو کہا اور ایک بزنس مین نے رازداری سے اسے یہ کام سونپا کہ وہ اپنی پسند کے عام موضوعات پر مبنی چند تصوریں بنا دے جنہیں اس کی آرٹسٹ بیٹی اپنا کر اپنی سہیلیوں پر رعب ڈال سکے اور اگر وہ چاہے تو اپنے گھر میں ہی ان کی چھوٹی موٹی نمائش بھی کر سکے۔ نام بیٹی کا ہو گا اور کام فطرت کا جس کے عوض خرچے کے علاوہ ستر روپے فی پینٹنگ کے حساب سے معاوضہ دیا جائے گا۔
اس نے بیک وقت ان تینوں آرڈرز کی تعمیل شروع کر دی۔ کتابوں کے گرد پوش بنانا اس کے لئے بالکل آسان تھا کیونکہ یہ تینوں کتابیں اس کے ذوق کے مطابق تھیں پورٹریٹ کا مسئلہ اس لحاظ سے ٹیڑھا تھا کہ پورٹریٹ بنوانے والے اوریجنل (اصل) کا خیال نہیں رکھتے بلکہ اپنے تصورات کے مطابق چہرے کو حسین سے حسین بنوانا چاہتے ہیں۔ دو دفعہ پہلے وہ اصل کے مطابق نقل بنا کر پچھتا چکا تھا اور پھر وہ اس وقت تک اسے معاوضہ نہیں ملا تھا جب تک اس نے پورٹریٹ بنوانے والے کی خواہش کے مطابق چہرے سے جھریاں ہٹا کر اس پر جوانی کی مسکراہٹ نہیں پھیلا دی تھی۔ فطرت نے سوچا اگر واقعی

ان صاحب کو اپنی بیوی سے گہری محبت تھی تو وہ یقیناً اسے مرنے کے بعد زیادہ حسین اور پرکشش سمجھنے لگ گئے ہوں گے اور انہیں مطمئن کرنا آسان نہ ہو گا لیکن انہوں نے ایک پورٹریٹ کا ایک سو روپیہ دینے کا وعدہ کیا تھا جو اس زمانے کے مطابق نہایت معقول تھا۔ فطرت پوری احتیاط کے ساتھ اس پورٹریٹ پر کام کرتا رہا۔

بزنس مین کی بیٹی کے لئے تصویریں بنانا فطرت کے بائیں ہاتھ کا کام تھا کیونکہ ان تصویروں پر فطرت نے اپنے دستخط کرنے تھے بلکہ بٹیا" نے خود اپنے ہاتھ سی کونے میں اپنا نام لکھنا تھا۔ فطرت کا کام صرف اس عمر کی لڑکی کے ذوق کے مطابق موضوع منتخب کرنا اور انہیں کچے پکے رنگوں سے تصویر کی شکل دینا تھا۔ کینوس کا سائز بھی کوئی بڑا نہیں تھا۔ ۱×۲ فٹ یا انتائی طور پر ۲×۳ فٹ' جب بھی فطرت کے پاس وافر رنگ ہوتے وہ کینوس کا ایک آدھ ٹکڑا پینٹ کر دیتا۔

فطرت پیٹ کی خاطر یہ چھوٹے موٹے اور جھوٹے سچے کام کرتا رہا لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس کے اندر خالص تخلیقی آرٹسٹ کی خلش بھڑکتی رہی۔ وہ جب روزی کی خاطر گھٹیا سا کام ختم کر کے ہاتھ دھوتا' تو اللہ تعالی سے یہی دعا کرتا کہ "یا اللہ' میں کب آرٹ کے نام پر اس ذلت سے ہاتھ دھوؤں گا' کب مجھے اپنی مرضی کے کینوس پینٹ کرنے کا موقع ملے گا۔ کب میرے ذہن میں کلبلانے والی تصویریں کینوس پر منتقل ہوں گی"

جاگے گرما کی ایک رات وہ کھانا وغیرہ کھا کر چارپائی پر لیٹا سوچ رہا تھا کہ اس نے اپنے مستقبل کے متعلق کیا خواب دیکھے تھے اور انکی تعبیر سامنے آئی ہے۔ اتنے میں دروازے پر دستک ہوئی۔ اس نے اٹھ کر دروازہ کھولا تو سامنے مولواد اور سکینہ کھڑے تھے۔ فطرت نے اپنی حیرت پر بمشکل قابو پاتے ہوئے انہیں اندر آنے کو کہا' دروازہ بند کیا اور انہیں بٹھایا۔ مولا داد اندر سے دوسری چارپائی نکال لایا اور فطرت خود کرسی پر بیٹھ گیا۔ سکینہ چارپائی دیکھتے ہی لیٹ گئی۔

"کیوں مولا داد کیسے' اس وقت؟ خیریت تو ہے"

 © Urdu4U.com

مولا داد جو سکینہ کے والد کی زمینوں پر کام کرتا تھا اور گھریلو ملازم کے طور پر بھی خدمت بجا لاتا تھا کہنے لگا

"پتر کل سے سکینہ بیٹی کی تکلیف بہت بڑھ گئی تھی۔ شہر والا ڈاکٹر بلوایا تھا چوہدری صاحب نے' لیکن اس نے بھی یہی کام کہا کہ ہم سے بھاری ہے۔ اسے لاہور لے جاؤ۔ چوہدری صاحب کو کل ہی رتی بھینس نے سینگوں پر اٹھا کر زمین پر دے مارا تھا۔ اللہ نے بچا لیا ہے صرف ماس وغیرہ میں پھس ہوئی ہے۔ باقی بچت ہو گئی ہے۔ چوہدرانی تو چوہدری صاحب کی سیوا کر رہی ہے اور تیری ماں ویسے ہی سفر کے قابل نہیں۔ سو انہوں نے مجھے حکم دیا کہ مولا داد تو جلدی سے سکینہ کو اس کے بھائی کے پاس پہنچا۔ شاید اس کی جان بچ جائے چوہدری صاحب ٹھیک ہو گئے تو سکینہ کی ماں بھی آ جائے گی۔ میں اسے گھر کا راستہ بتا دوں گا۔ ہم تو جی تانگہ لے کر کس وقت کے پھر رہے ہیں۔ بہن ریشماں سے تمہارا پتہ پوچھا تو اس نے ڈاک کا پتہ بتا دیا بھلا ڈاک کے پتے پر بھی کوئی انسان پہنچ سکتا ہے۔ بہرحال اللہ کی مہربانی سے میں نے امانت پہنچا دی ہے۔ اب مجھے اجازت دیں"

"نہیں مولاداد صبح چلے جانا' پہلے یہ بتاؤ روٹی کھائی ہے"

"جی پھر پھر کے دیر ہو گئی تو میں نے ایک ہوٹل سے روٹی کھا لی۔ سکینہ بیٹی نے کچھ نہیں کھایا' اسی کچھ نہ کچھ کھلا دینا۔ میں چلتا ہوں"

"لیکن اس وقت؟"

"ہاں پتر' ابھی کیونکہ صبح تمباکو کو پانی لگانا ہے۔ چوہدری صاحب بھی بیمار ہیں' مجھے فجر کی بانگ سے پہلے چک پہنچ جانا چاہیے۔"

یہ کہہ کر مولا داد رخصت ہو گیا اور فطرت اٹھ کر اپنی دودھ شریک بہن کی چارپائی کی پٹی پر جا بیٹھا:

"کیوں بہن' طبیعت کیسی ہے"

"شکر ہے' خدا کا"

"اس وقت کوئی خاص تکلیف؟ دوائی وغیرہ لے آؤں؟"

"نہیں' اس وقت دوائی کی ضرورت نہیں' بس پیٹ میں درد رہتا ہے۔ کبھی کبھی تو یہ درد میرے سارے جسم کی طاقت نچوڑ لیتا ہے۔ ڈاکٹر نے کہا تھا ایکسرے میں ایک پھوڑا یا رسولی نظر آتی ہے۔"

"تم فکر نہ کرو۔ کل صبح ڈاکٹر کے پاس چلیں گے۔ انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا"

چند لمحے خاموشی طاری رہی اور سکینہ کا جوان مگر بیمار چہرہ چاندنی میں اور بھی پیلا نظر آنے لگا۔

فطرت نے پوچھا

"دودھ لاؤں۔ ایک پیالی پی لو"

"میرا کچھ کھانے کو جی نہیں چاہتا۔ میرے ویر' پتہ نہیں موت مجھے تیرے پاس لے آئی ہے۔"

"ایسا نہ کہو بہن ایسا نہ کہو۔ لاہور میں اچھے اچھے ڈاکٹر ہیں۔ ولایت پاس' کل ان کے پاس چلیں گے۔ انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

باتیں کرتے کرتے نحیف ونزار سکینہ پر غنودگی طاری ہو گئی۔ فطرت سمجھا شاید وہ سو گئی ہے۔ وہ بھی دوسری چارپائی پر بستر بچھا کر لیٹ گیا۔ لیکن آج کی رات وہ آرٹسٹ ہی نہیں' ایک بھائی اور تیمار دار بھی تھا۔ وہ رات کو اٹھ اٹھ کر سکینہ کی حالت دیکھتا رہا۔

صبح اٹھ کر سکینہ اندر کمرے میں چلی گئی اور مدہم سی آواز میں کہنے لگی

"میں ناشتہ بنا دوں تیرے لئے۔ میرے ویر"

"تم خود بیمار ہو اور میرے ناشتہ کی فکر کرتی ہو' اللہ نے ہوٹل اسی لئے بنائے ہیں۔ لاہور میں بہت ہوٹل ہیں۔ ایک ہوٹل تو اس محلے میں ہے۔ روٹی پانی کی کوئی تکلیف نہیں۔ تمہیں جس چیز کی خواہش یا طلب ہو مجھے بتاؤ' میں لا دوں گا"

میو ہسپتال کے ڈاکٹر سمیع نے سکینہ کا بغور معائنہ کیا۔ پرانے ایکسرے اور دوسرے کاغذات

دیکھے۔ مزید ٹیسٹ کروائے اور مریضہ کو ویٹنگ روم میں بھجوا کر فطرت سے پوچھا:

"آپ مریضہ کے کیا لگتے ہیں"

"بھائی"

"آپ ہی اس کے سرپرست ہیں"

"یہی سمجھ لیں کیونکہ باقی رشتہ دار گاؤں میں ہیں اور یہاں یہ میرے پاس علاج کے لئے آئی ہے"

"آپ کو ان کے مرض کے بارے میں کچھ علم ہے"

"بس اتنا سنا ہے کہ پیٹ میں رسولی ہے جو وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتی جا رہی ہے"

"یہ سولی نہیں‘ کینسر ہے"

کینسر کا نام سن کر فطرت کی ہوائیاں اڑ گئیں اور اس نے بے ساختہ کہا:

"پھر"

"پھر یہ کہ میں آپ کو کوئی جھوٹی امید دلانا نہیں چاہتا۔ یہ نسخہ ہے۔ دوائی دیتے رہنے مریضہ کو کچھ افاقہ رہے گا"

"اور اپریشن وغیرہ"

"اپریشن اول تو یہاں ہوتا نہیں۔ دوسرے اس کا فائدہ بھی نہیں۔ یہ ایسا موذی پھوڑا ہے کہ ایک بار کاٹو تو پھر اگ آتا ہے اور ہر آپریشن کے ساتھ آدھا رہ جاتا ہے"

"اپریشن اول تو یہاں ہوتا نہیں۔ دوسرے اس کا فائدہ بھی نہیں۔ یہ ایسا موذی پھوڑا ہے کہ ایک بار کاٹو پھر اگ آتا ہے اور ہر آپریشن کے ساتھ مریض آدھا رہ جاتا ہے"

"اُفوہ!"

فطرت سکینہ کے سرہانے دودھ‘ دوائیاں‘ پانی اور فروٹ رکھ کر عموماً کام کاج کے لئے باہر نکل جاتا اور جانے سے پہلے باہر سے دروازے کو تالا لگا جاتا تا کہ اس کی غیر حاضری میں سکینہ کے آرام میں کوئی مخل نہ ہو۔ وہ واپسی پر اپنے لئے ناشتے کا سامان اور بہن کی ئے دوائیاں اور موسمی پھل وغیرہ ساتھ لے آتا۔ وہ وقتاً فوقتاً رکشے پر بیٹھا کر سکینہ

کو ہسپتال بھی لے جاتا اور ڈاکٹر سمیع کے مشورے کے مطابق دوائیاں تبدیل کرتا رہتا۔

ایک دن اپنے کمرشل آرٹ کے سلسلے میں ٹی ہاؤس گیا (کیونکہ وہی اس کے رابطے کی جگہ تھی) تو وہاں فیصل لبمل' سجاد اور قیوم بیٹھے تھے۔

URDU4U.COM

قیوم نے کہا "فطرت صاحب بہت دنوں بعد نظر آئے۔ آپ کے چاہنے والے کئی بار ٹی ہاؤس سے پوچھ پوچھ کر واپس جاتے رہے"

"ہاں یار' کچھ غیر حاضری لمبی ہو گئی"

"کیوں خیریت تو تھی"

"بس کچھ گھریلو پریشان تھیں"

فیصل نے کہا "ایسے کام کرو گے تو پریشانیاں تو ہوں گی"

فطرت: "کیسے کام؟"

فیصل: "اتنے بھولے نہ بنو' فطرت"

"یعنی؟"

"یعنی یہ کہ جس پٹاخہ سی لڑکی کو تم روز روز رکشے اور ٹیکسی پر گھماتے پھرتے ہو"

"وہ میری کزن سسٹر ہے"

"شروع شروع میں سب یہی کہتے ہیں"

"بکواس بند کرو"

"کس کس کی زبان پکڑو گے آرٹسٹ صاحب' یہ امریکہ نہیں' لاہور ہے۔ یہاں ایک ایک بات کا چرچا ہو جاتا ہے۔ سب لوگ جانتے ہیں کہ پہلے تم زوبی اور آشا کو خراب کرتے رہے پھر تم نے مس نزہت پر ڈورے ڈالے اور اب تم اس معصوم دیہاتی پرندے کو پھنسا لائے ہو"

"فیصل' زبان سنبھال کر بات کرو۔ وہ میری بہن ہے۔ اس کے پیٹ میں رسولی ہے۔ وہ علاج کے لئے میرے پاس آئی ہے۔"

"فطرت صاحب میں بھی سنت نگر میں رہتا ہوں۔ مجھے پتہ ہے کہ تم دن کے وقت اسے

گھر میں بند کر آتے ہو۔ رات کو اس کے ساتھ بدکاری کرتے ہو' پیٹ میں رسولی نہیں ہو گی تو اور کیا ہو گا۔ اپریشن کراؤ' اپریشن!"

URDU4U.COM

یہ الزام سن کر فطرت کے ضبط و تحمل کے سب بند ٹوٹ گئے۔ اس نے اٹھ کر فیصل کو زناٹے دار تھپڑ رسید کیا۔ فیصل نے جوابی حملہ کیا تو فطرت نے اسے بچھاڑ کر میز پر پھینک دیا پھر دونوں گتھم گتھا ہو گئے۔ بڑی مشکل سے ٹی ہاؤس کے بیروں سے بیچ بچاؤ کیا۔

ٹی ہاؤس کی تاریخ میں یہ پہلا واقعہ تھا کہ کسی غیر ادبی موضوع پر ہاتھ پائی کی نوبت آئی تھی۔

ٹی ہاؤس والے واقعہ کے دو دن بعد کا ذکر ہے کہ فطرت سکینہ کو دوائی وغیرہ دے کر خود سنت نگر کے مقامی ہوٹل میں کھانا کھانے گیا تو چند غنڈوں نے اسے گھیر لیا:

"اوئے' تیرا نام فطرت ہے"

"ہاں' میرا نام فطرت ہے' لیکن ذرا تمیز سے بات کرو"

"تمیز تم میں نہیں' ہم تمہیں سکھائیں گے"

"دیکھو' میرے ساتھ سیدھی طرح بات کرو"

"ہم سیدھی بات نہیں کیا کرتے ہم تیرے جیسے شریف بدمعاشوں کو سیدھا کیا کرتے ہیں"

"یہ کیا بکواس ہے۔ تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔"

"تم اسے بکواس کہتے ہو۔ ایک ہفتے سے جوان لڑکی گھر میں ڈال رکھی ہے۔ رات کے اندھیرے میں ایک دلال اسے تمہارے پاس چھوڑ گیا۔ تم ساری ساری رات اس کے ساتھ حرام کاری کرتے ہو۔ صبح محلے داروں کو دھوکہ دینے کے لئے باہر سے تالا لگا جاتے ہو۔ جیسے ہم سب اندھے ہیں۔ ہمیں کچھ پتہ نہیں"

فطرت نے اس غنڈے پر حملہ کرنے کی کوشش کی تھی لیکن غنڈے نے اسے پیٹ میں ایسا گھونسہ مارا کہ وہ زمین پر لوٹ پوٹ ہو گیا۔ غنڈے نے مونچھوں کو تاؤ دے

کر کہا:
"آیا وڈا بدمعاش' ہم سے ٹکر لینے والا۔ ڈاکٹر سمیع سے ادھر ابارشن کراتا ہے اور ادھر الٹا ہم پر رعب ڈالتا ہے اپنی شرافت کا۔ ایسے بدمعاش کو ہم جیتے جی غائب کر دیں گے۔"

URDU4U.COM

اس پٹائی کے دوران فیصل ہوٹل کے اندر بیٹھا سارا تماشا دیکھتا رہا۔
اگلے روز فطرت سکینہ کو لے کر واپس گاؤں چلا گیا۔

فطرت بیمار سکینہ کو گاؤں چھوڑ کر واپس لاہور چلا آیا کیونکہ اسے اندازہ تھا کہ اگر وہ چند روز گاؤں میں رک گیا تو اسے لوگوں کے مزید زبانی طمانچے سہنا پڑیں گے۔ ادھر شہر میں بھی زندگی کچھ زیادہ خوشگوار نہ تھی لیکن یہاں ٹی ہاؤس کے بعض ادیب اور پروفیسر سعید جیسے مشفق لوگ موجود تھے جن کے سامنے وہ دل کے بھڑاس نکال سکتا تھا۔ ان سے بحث کر سکتا تھا اور رہنمائی حاصل کر سکتا تھا۔
وہ لاہور پہنچ کر پروفیسر سعید کے گھر گیا۔ کیونکہ اس نے کھلی دعوت دے رکھی تھی کہ تم جب چاہو' جس وقت چاہو' چلے آؤ۔ آج ایک مرتبہ پھر فطرت زندگی کی حدت بڑی شدت سے محسوس کر رہا تھا اور اسے کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا کہ وہ کدھر جائے' کیا کرے!
جب وہ کینال پارک پر واقعہ کوٹھی میں پہنچا تو پروفیسر سعید لان میں بیٹھے کوئی کتاب دیکھ رہے تھے۔ اچانک فطرت کو گیٹ پر پا کر اٹھ کھڑے ہوئے اور بڑے تپاک سے کہا "آؤ آؤ' فطرت' کہاں غائب ہو گئے تھے"
"زندگی غلام گردشوں میں' سر"
"خاصے پریشان نظر آتے ہو' بیٹھو' خیریت تو ہے؟"
"سر' خیریت ہے بھی اور نہیں بھی"
پروفیسر سعید نے فطرت کی خواہش کے مطابق پہلے پانی اور پھر چائے لانے کا آرڈر دیا

URDU4U.COM

اور بیٹھ کر فطرت کے دکھ درد سننے لگے۔ فطرت نے کہا:

"سر' آپ کو یاد ہو گا جب میں پچھلی مرتبہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا تو"

"ہاں' ہاں' مجھے یاد ہے تم نے کہا تھا کہ تم نوکری کر کے روٹین زندگی گزارنا نہیں چاہتے کیونکہ اس طرح تمہاری تخلیقی صلاحیتیں سلب ہو جائیں گی۔ لہٰذا تم زمانے کے غم' اندوہ' دکھ اور درد پینٹ کرنا چاہتے تھے تاکہ معاشرے کی خرابیوں کے خلاف رائے عامہ ہموار کر سکو۔ غربت' افلاس' جبر' تشدد اور ناانصافیوں کے خلاف شعور بیدار کر سکو اور دوسرے باشعور لوگ زیادہ باہمت اور باوسیلہ لوگ۔ ان زیادتیوں اور ناانصافیوں کا سدباب کر سکیں۔ اب' بتاؤ کہ اس میں ایک سال کے عرصے میں تمہیں اپنے مشن میں کہاں تک کامیابی ہوئی"

"اس حد تک کہ زمانے کے تھپیڑے کھا کھا کر میرے اندر کی آگ اور بھڑک اٹھی ہے۔ معاشرے کی زیادتیوں کے خلاف میرے جذبات اور شدید ہو گئے ہیں"

"کچھ پینٹ بھی کر سکے یا نہیں"

"اپنی مرضی کی صرف دو تین تصویریں بنائی ہیں' دراصل میں ابھی تک وہ کچھ پینٹ نہیں کر سکا۔ جو پینٹ کرنا چاہتا ہوں۔ ویسے بہت سا رنگ خرچ کیا ہے کئی کینوس نیلے پیلے کئے ہیں۔ لیکن ان میں سے زیادہ کینوس وہ ہیں جو میں نے روزی کمانے کے لئے پینٹ کئے۔ اپنی مرضی کی بہت سی تصویریں ابھی میرے ذہن میں محفوظ ہیں اور انہیں پینٹ کرنے کی حسرت آج تک سینے میں اٹھائے پھر رہا ہوں"

"کوئی بات نہیں' ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے' زمانے کی بھٹی میں اور پک جاؤ گے تو تمہارا فن اور نکھر جائے گا آج کل خطاطی کا بہت فیشن ہے۔ تمہارے ہاتھ میں صفائی ہے۔ اسے ٹرائی کیوں نہیں کرتے۔"

"جہاں تک قرآنی آیات کا تعلق ہے وہ تو مقدس ہیں اور انہیں سجا سجا کر لکھنا اپنی جگہ کار ثواب ہے لیکن آرٹ کے نقطہ نظر سے میں اسی Creative نہیں سمجھتا اور میں تو ویسے بھی آرٹ کو ذریعہ سجاوٹ بنانے کے خلاف ہوں خواہ یہ خاطی ہی کیوں نہ ہو"

URDU4U.COM

"خیر' تمہاری مرضی"

"لیکن' سر میں آپ کو یہی بتانے کے لئے آیا ہوں کہ زمانے کا جو رویہ میرے ساتھ ہے اسے برداشت کرنا۔ اور طویلعرصے تک برداشت کرنا۔ میرے جیسے کمزور انسان کے لئے بہت مشکل ہے۔ میں تو ٹوٹ جاؤں گا۔ ریزہ ریزہ ہو جاؤں گا"

"میں نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ آرام چاہتے ہو تو Compromise کر لو Non-conformist رہنا چاہتے ہو تو سخت سے سخت تھپیڑوں کے لئے تیار رہو۔ لیکن میرا ایک ہی مشورہ ہے اور وہ یہ کہ زمانے کے تھپیڑوں سے تنگ آ کر کبھی خودکشی نہ کرنا۔ خودکشی کی مثالیں تاریخ میں بہت ملتی ہیں۔ خاص کر نو عمر آرٹسٹوں کے بارے میں۔ وہ غیر مسلم تھے تم ایک مسلمان آرٹسٹ ہو۔ اسلام پر ایمان رکھتے ہو۔ تمہیں یہ کبھی نہیں بھولنا چاہئے کہ خودکشی گناہ ہے۔ زندگی اللہ کا بہت بڑا عطیہ ہے۔ اسے اپنے ہاتھوں سے ضائع کرنا کفران نعمت ہے۔ ایسی حرکت نہ کرنا اگر ہمت جواب دینے لگے تو Compromise کر لینا لیکن خودکشی کبھی نہ کرنا"

"آپ کی قطع کلامی ہوتی ہے' سر' لیکن دونوں میں کوئی فرق ہے؟"

یہ جواب سن کر پروفیسر سعید گہری سوچ میں ڈوب گئے۔

فطرت نے اپنے استاد کی نصیحت پر حتی الامکان عمل کرنے کا وعدہ کیا اور کہا "سر' مجھے زیادہ دکھ اس بات سے ہو رہا ہے کہ میرا مشن روز بروز مجھ سے دور ہوتا جا رہا ہے۔ میں روزی کی خاطر پلاسٹک اور ٹین کے بنے ہوئے انسانوں کے پورٹریٹ بناتا رہتا ہوں۔ پیٹ کی خاطر بدشکل سے بدشکل فلم ایکٹریس کو سیکسی سے سیکسی بنا کر پیش کرتا رہتا ہوں۔ کسی امیر زادی کا شوق پورا کرنے کے لئے اس کے نام کی چھوٹی سچی تصویریں بناتا رہتا ہوں۔ میں سوچتا ہوں' سر' آیام ریت خلیق کا یہی مقصد تھا۔ کیا مجھے اللہ تعالٰی نے آرٹسٹ کی صلاحیتیں صرف اس لئے دی تھیں کہ میں آرٹ کے نام پر یہ ذلیل اور گھٹیا حرکتیں کرتا رہوں"

"آپ انہیں ذلیل اور گھٹیا تو نہ کہیں' بہت سے آرٹسٹ اسی طرح اپنا رزق کماتے۔

"کم از کم میں نے اپنے آپ کو اس قسم کا آرٹسٹ کبھی نہیں سمجھا۔ میں ہمیشہ سمجھتا رہا کہ پینٹنگ ایک غیر معمولی عطیہ قدرت ہے۔ اسے بنی نوع انسان کی خدمت اور عظمت کے لئے استعمال کرنا چاہئے اور میں نے سوچا تھا کہ میں بنی نوع انسان کی خدمت ان زیادتیوں اور ناانصافیوں کو بے نقاب کر کے کروں گا جس سے لاکھوں کروڑوں انساندو چار ہیں۔ اور پتہ نہیں کب تک دو چار رہیں گے"

URDU4U.COM

"دیکھو فطرت زندگی گزارنے کے دو طریقے ہیں۔ ایک یہ کہ چند اخلاقی قدروں کو بنیاد بنا کر اپنے لئے ایک آئیڈیل وضع کر لو اور پھر ساری عمر اس آئیڈیل کے لئے کام کرتے رہو۔ اس کے لئے تگ و دو کرتے رہو اور جب تک یہ آئیڈیل نہیں ملتا پریشان ہوتے رہو' اپنا خون جلاتے رہو۔ اپنی نیندیں حرام کرتے رہو اور اسی حسرت و یاس میں بالا آخر پیوند خاک ہو جاؤ۔ کیونکہ کسی وک آج تک آئیڈیل ملا ہے نہ ملے گا۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اپنے آپ کو موم کی طرح نرم رکھو۔ زندگی جو پیمانہ تمہارے سامنے رکھے اس میں فٹ ہو جاؤ۔ پہلے طریقے میں تکلیف ہے۔ رکاوٹیں ہیں' پریشانیاں ہیں جنہیں زندگی بھر برداشت کرنا ہر کسی کے بس میں نہیں ہوتا جبکہ دوسرا راستہ آسان ہے۔ نسبتاً آرام دہ ہے۔ اس میں اپنی آگ ہر وقت جلتے رہنے کا احساس نہیں ہوتا"

"اگر میں اپ کی بات صحیح سمجھا ہوں تو آپ مجھے یہ درس دے رہے ہیں کہ روسی کتابوں میں پڑھی ہوئی تمام باتیں بھول جاؤں جن میں کہا گیا تھا کہ ہمیشہ سچ بولو' باطل کا ساتھ نہ دو' خوشامد سے پرہیز کرو' اپنے ضمیر کے مطابق عمل کرو وغیرہ۔ یعنی آپ کا مطلب ہے کہ میں اخلاقی اقدار کا وہ سارا محل مسمار کر دوں جو میں پچھلے پچیس سالوں سے تعمیر کرتا آ رہا ہوں اور اپنے آپ کو خس و خاشاک کی طرح زمانے کے رحم و کرم پر چھوڑ دوں۔ وہ جو چاہے' مجھ سے کروائے۔ جہاں چاہے مجھے بہا کر لے جائے؟"

"تم نے کبھی اس بات پر بھی غور کیا' فطرت' کہ جو پیمانے ہم اپنے لئے وضع کر لیتے

ہیں ان کی بنیاد کتنی محکم یا غیر محکم ہوتی ہے۔ آپ حق کی خاطر باطل کے خلاف لڑنے کو جہاد سمجھتے ہیں لیکن حق اور باطل کو پرکھنے کا معیار کیا ہے آپ اندھے کو اندھا اور کانے کو کانا کہنے کو حق گوئی اور سچائی کا درجہ دیتے ہیں کبھی آپ نے غور کیا کہ آیا سچ کی یہی تعریف ہے؟"

URDU4U.COM

"گویا مجھے زندہ رہنے کے لئے اپنا یہ مشن ترک کر دینا چاہئے کہ میں اندھے کو اندھا اور کانے کو کانا کہوں گا' کیا مجھے زندہ رہنے کے لئے زمین کو آسمان اور آسمان کو زمین کہنا پڑے گا۔"

پروفیسر سعید نے کہا "بہرحال چوائس آپ کا اپنا ہے۔ آپ نے مشورہ طلب کیا تھا' میں نے اپنی پچاس سالہ زندگی کا نچوڑ پیش کر دیا۔ آگے تمہاری مرضی" اس کے بعد فطرت نے وارث محلّہ' سانده کلاں اور سنت نگر کے واقعات سنائے اور پوچھا کہ اب اسے رہائش کے سلسلے میں کیا کرنا چاہئے۔

پروفیسر سعید نے کہا "میرا غریب خانہ حاضر ہے"

"شکریہ سر' بہت بہت شکریہ۔ لیکن میرے پوچھنے کا مطلب یہ تھا کہ لاہور شہر بھی مجھ پر تنگ ہوتا جا رہا ہے حالانکہ میں نے سنا تھا کہ بالغ نظر شہر کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ ہر قسم کے شخص کو گلے لگا لیتا ہے۔ مجھ سے کیوں یہ سوتیلی ماں والا سلوک کر رہا ہے"

"اس لئے کہ تم نے اسی ٹھیک طرح اپروچ نہیں کیا"

"وہ کیسے؟"

"ہر جگہ کی طرح لاہور شہر میں بھی تین طبقے آباد ہیں۔ امیر' غریب اور متوسط۔ ہمیشہ اخلاقی اقدار کی گرفت متوسط طبقے پر سب سے زیادہ ' سخت ہوتی ہے۔ وہاں درگزر کرنے اور بات سہنے کی صلاحیت بھی کم ہوتی ہے۔ جب کہ دوسرے دونوں طبقے۔ مختلف وجوہات کی بنا پر زندگی کے بارے میں نرم رو رکھتے ہیں۔ آپ کو ایک مثال دیتا ہوں"

"جی"

 © Urdu4U.com

"آپ نے دیہات اور شہر میں دیکھا ہو گا کہ غریب طبقے کی عورتیں اور مرد ایک ہی تانگے میں ٹھونسے ہوتے ہیں۔ ایک مرد کی ٹانگ کسی غیر محرم عورت کی ران سے جڑی ہوتی ہے۔ ایک کیکہنی دوسرے کے سینے کو چھو رہی ہوتی ہے۔ بلکہ بعض اوقات ایک کا سانس دوسرے کو محسوس ہو رہا ہوتا ہے لیکن دونی دونی کرایہ دے کر گھر پہنچنے کی خاطر وہ سب کچھ برداشت کر جاتے ہیں"

"جی"

"اب اوپر والے طبقے کو لے لو' وہاں اتنی آزادی ہوتی ہے کہ ایک امیر آدمی اپنے دوست کی آزاد منش بیوی کو اس کے شوہر کے سامنے اپنی گاڑی پر بٹھا کر لے جاتا ہے اور کوئی احتجاج نہیں ہوتا اسی طرح کانونٹ کی پڑھی ہوئی لڑکی اپنے بوائے فرینڈ کے سکوٹر پر بیٹھی ہوئی یونیورسٹی سے گھر آ جاتی ہے اور کوئی انگلی نہیں اٹھاتا لیکن جب متوسط طبقے کی ایک لڑکی کسی مجبوری کے تحت کسی کی گاڑی میں لفٹ لے کر ہپتال پہنچ جاتی ہے تو اس کا اسکینڈل بن جاتا ہے۔لوگ اسے بدمعاش اور بدکردار سمجھنے لگتے ہیں۔ بعض اوقات تو انہی شبہات کی بناء پر منگنیاں ٹوٹ جاتی ہیں۔ شادیاں رک جاتی ہیں خاندانوں کی ناموس خاک میں مل جاتی ہے۔"

"تو؟"

"تو فطرت صاحب آپ کو لاہور میں ایسی جگہ مکان لینا چاہئے جہاں متوسط طبقے کی بجائے بہت امیر لوگ رہتے ہوں یا بہت غریب یعنی یا گلبرگ میں اپارٹمنٹ لے لو یا گوالوں' ماچھیوں اور بھنگیوں کی کسی کالونی میں چلے جاؤ' ساندہ کلاں' سنت نگر' سمن آباد یہ سب متوسط طبقے کی بستیاں ہیں ان میں انگلیاں اٹھیں گی اور تنقید کے تیر برسیں گے"

"گلبرگ میں اپارٹمنٹ لینا تو میرے بس کی بات نہیں البتہ گوالوں کی کوئی بستی تلاش کرتا ہوں"

چائے پانی پی کر اور یہ مشورے سن کر فطرت جانے لگا تو پروفیسر سعید نے اسے الوداع کرتے ہوئے کہا:

رابطہ رکھنا۔ فطرت مجھ سے۔ شاید میں چند روز تک تمہیں کوئی اور کبر سنا سکوں"
فطرت جاتے جاتے رک گیا "کیا خبر' سر"
"تمہارا پیٹ ہلکا ہے۔ اب تمہیں میں قبل از وقت کچھ نہیں بتاؤں گا۔ ہفتے دس دن تک ملنا۔ یا فون کر لینا۔ او' کے گڈلک"
"شکریہ' سر' شکریہ" کہہ کر فطرت ہاتھ ہلاتا ہوا گیٹ سے باہر نکل گیا۔

دل برداشتہ فطرت کو واپس پلٹنے کی کوئی جلدی نہ تھی۔ وہ پروفیسر سعید کے گھر سے نکل کر لبرٹی مارکیٹ کی خاطر نکل گیا تاکہ اپنا جی بہلا رہے۔ شام کے وقت ویسے بھی وہاں گہما گہمی بڑھ جاتی تھی۔ فطرت نے وہاں پہنچ کر کھوکھے والی سے پان خریدا اور کونے پر بکلینڈ میں کتابیں دیکھنے چلا گیا۔ اس کے پیچھے سنہرے رنگ کی امپالا گاڑی آ کر رکی اس میں سے ایک ادھیڑ عمر جو اترا۔ مرد پچاس سے اوپر کا لگتا تھا۔ اس کی سوکھی ہوئی جلد سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس نے بڑی محنت و مشقت کے بعد زندگی میں یہ مقام حاصل کیاہ ے۔ اس نے کھدر کی بش شرٹ پہنی ہوئی تھی اور منہ میں پائپ تھا۔ ہر کش کے ساتھ قیمتی تمباکو کی مہک دوسروں تک پہنچ رہیتھی۔ بیگم صاحبہ نسبتاً جوان اور تروتازہ تھی۔ اس کا پیٹ ذرا سا ابھرا ہوا تھا لیکنب اقی جسم ٹھیک ٹھاک تھا جیسا کہ امیر اورموڈرن عورتوں کا ہوتا ہے۔ وہ دونوں مارکیٹ کے برآمدے میں داخل ہوتے ہی بائیں طرف مڑ گئے اور فطرت دائیں جانب کتابوں کی دکان میں چلا گیا۔

دکان رسالوں اور کتابوں سے خوب سجی ہوئی تھی۔ اکے دکے گاہک رسالے یا سٹیشنری خرید رہے تھے۔ کتابوں کے خریدار بہت کم تھے۔ البتہ دو تین آدمی انگریزی ناولوں کی شیلف پر کھڑے کتابوں کی ورق گردانی میں مصروف تھے۔

فطرت نے پہلے ادبی شعبے میں کچھ وقت گزارا اور پھر آرٹ سیکشن میں چلا گیا وہاں بڑی عمدہ اور دیدہ زیب کتابیں رکھی تھیں۔ فطرت نے آرٹ کی چند کتابیں باری باری اٹھائیں ان کی ورق گردانی کی' تصویریں دیکھیں اور واپس رکھ دیں۔ افریقی آرٹ سے متعلق

ایک کتاب اسے بہت پسند آئی۔ قیمت دیکھی تو ڈھائی سو روپے۔ فطرت کیلئے یہ بہت زیادہ تھی لیکن کتاب تھی اتنی اچھی کہ فطرت اسے چھوڑنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ وہ بار بار اسے اٹھاتا ورق گردانی کرتا‘ قیمت پڑھتا اور واپس رکھ دیتا۔ وہ دس پندرہ منٹ اس کشمکش میں رہا کہ وہ کیا کرے۔ کیا وہ اپنی گھڑی دے کر یہ کتاب خرید لے یا یا کیا؟ اس کے پاس رہن رکھنے یا بیچنے کی ایسی کوئی چیز نہ تھی جس کے عوض وہ یہ کتاب خرید سکتا۔ وہ اپنی غربت پر کڑھتا ہوا باہر چلا آیا۔

دکان کے باہر برآمدے میں غیر ملکی رسالے رکھے تھے جن سے امپالا گاڑی والے صاحب جی بہلا رہے تھے۔ فطرت برآمدے سے اترنے لگا تو بیگم صاحبہ بھی آ گئی۔ اس کے ہاتھ میں جیولری کا خوبصورت بکس تھا۔ اس نے اپنے شوہر سے کہا

”ظفری‘ یہ دیکھو میں کیا لائی ہوں“

ظفری نے پائپ کا کش لیتے ہوئے ڈبے کی طرف دیکھا۔ بیگم صاحبہ نے وہیں کھڑی کھڑے ڈبہ کھول کر اسے دکھایا۔ یہ سونے کا ہار تھا۔

”مجھے ادھر سنار کی دکان پر یہ ہار نظر آیا‘ میں نے شمع کی برتھ ڈے کے لئے خرید لیا۔ اچھا ہے نا؟“

”ہاں‘ اچھا ہے۔ تمہارا چوائس ہمیشہ بہت اچھا رہا ہے کتنے کا ہے“

”ساڑھے تین لاکھ کا“

”اور پیسے؟“

”وہ مجھے جانتا ہے۔ وہ کہہ رہا تھا بیگم صاحب آپ کو ہار پسند آ گیا ہے تو لے جایئے۔ پیسے آ جائیں گے۔ میں اس سے پہلے بھی جیولری اور جیمز(Gems) خریدتی رہی ہوں۔“

وہ امپالا کار میں بیٹھ کر چلے گئے اور فطرت بس کا انتظار کرنے لگا۔

اگر آپ لاہور شہر سے دریائے راوی کی طرف آئیں تو راوی کے پل سے ذرا پہلے بسوں

کا اڈہ ہے جہاں چند دکانیں اور دو تین چھوٹے چھوٹے ہوٹل ہیں۔ کچھ خوانچے والے بھی ہیں جو گرمیوں میں موسمی پھل' رنگا رنگ شربت اور سگریٹ پان بیچتے ہیں اور سردیوں میں اپنے خوانچوں پر مونگ پھلی اور چلغوزے سجاتے ہیں اور انہیں گرم رکھنے کے لئے ان پر دھکتے کوئلوں کی ایک ڈولی رکھ لیتے ہیں۔ اس بارونق اڈے سے اگر آپ ذرا سا آگے جا کر دائیں طرف مڑ جائیں تو لاہور کے مضافات میں ایک بستی شروع ہو جاتی ہے جس میں زیادہ تر مکان کچے ہیں۔ چند ایک پکے مکان بھی ہیں جو گارے کی مدد سے اینٹیں جوڑ کر بنائے گئے ہیں لیکن ان میں سیمنٹ کا کوئی نام ونشان نہیں۔ دیواریں بارشوں یا سیمک ی وجہ سے اکثر گیلی گیلی رہتی ہیں۔

اس بستی کے سامنے مٹے کا ایک اونچا حفاظتی بند ہے جو موسم برسات میں دریائے راوی کا غصہ روکنے کے لئے بنایا گیا ہے۔ اس بند پر خانہ بدوشوں نے اپنے خیمے گاڑ رکھے ہیں اور ساتھ ہی ان کی مرغیاں' بکریاں' کتے اور گدھے چہل قدمی کرتے رہتے ہیں۔ بند سے اتر کر بستی کی جانب اینٹوں کے تین چار بھٹے ہیں جن کی زنگ آلود چمنیاں ہر وقت آسمان کی طرف منہ کر کے غبار نکالتی رہتی ہیں۔ بھٹوں اور بستی کے درمیان ذرا ایک طرف کو بھنگیوں کی جھگیاں ہیں جو ہر وقت ننگے' گندے اور کالے بچوں سے کلبلاتی رہتی ہیں۔

اس کچی پکی بستی میں' جسے مقامی لوگ نئی بستی کہتے تھے۔ فطرت کو سو روپے ماہور کرائے پر ایک مکان مل گیا۔ مکان کیا تھا ایک وسیع احاطہ تھا جس کے ایک طرف دو کمرے ڈال دیئے گئے تھے اور چار دیواری کھینچ کر ایک پھاٹک لگا دیا گیا تھا صحن کے عین وسط میں کسی غسل خانے کے تکلف کے بغیر ایک ہینڈ پمپ (نل) نصب تھا جس جگہ نل کا پانی گرتا تھا وہاں چار پانچ اینٹیں رکھ کر ایک تھڑا سا بنا دیا گیا تھا۔ جس پر بیٹھ کر نہایا جا سکتا تھا لنگوٹ باندھ کر یا انڈر ویئر پہن کر!

فطرت نے مالک مکان کے نمائندے کو (جس کی توند اس کی دھوتی کی گانٹھ کے اوپر سے لٹک رہی تھی) ایک سو روپیہ تھما کر مکان کی چابی لی۔ گیٹ کھولا تو یکایک سارا

گھر ہی کھل گیا۔ وسیع صحن' بجری سے بھرا ہوا نا مکمل برآمدہ' ساتھ دو کمرے جن میں خوش قسمتی سے پکے فرش پڑ چکے تھے البتہ ان کی دیواریں اور چھتیں ابھی پلستر کی منتظر تھیں۔

URDU4U.COM

فطرت نے برآمدے میں کھڑی ہو کر چاردیواری کے باہر نظر ڈالی تو اسے وسیع منظر دکھائی دیا۔ کھیت' جنگل جھاڑیاں' سر کنڈے وغیرہ' بائیں جانب راوی کام شرقی کنارہ' دائیں جانب سیلاب کا پانی روکنے والا بند' بند پر خانہ بدوشوں کے خیمے وغیرہ۔

یہ جگہ راوی پل کے قریب واقع بس سٹاپ سے بمشکل پانچ منٹ کے فاصلے پر تھی۔ فطرت صبح صبح تیار ہو کر بس سٹاپ پر پہنچ جاتا۔ وہیں ناشتہ کرتا اور پانچ آنے دے کر بس پر بیٹھ جاتا جو اسے اس کی مرضی کے مطابق گول باغ یا مال روڈ پر اتار دیتی اور وہ جب چاہتا مزید پانچ آنے دے کر واپس گھر چلا آتا۔ اگر اس کا ارادہ گھر پر ہی کام کرنے کا ہوتا تو راوی کے پل پر ہوٹل میں ناشتہ کر کے واپس اپنے مکان میں آ جاتا اور ایزل پر کینوس سجا کر پینٹ کرنے لگا۔

فرصت کے اوقات میں فطرت کبھی اپنا ایزل اور کینوس وغیرہ لے کر اور کبھی صرف پنسل اور اسکیچ بک اٹھا کر اس بستی کے مکینوں کی طرف نکل جاتا۔ بھٹے کے پاس کچی اینٹیں ڈالنے والے کمہاروں کے پاس جا بیٹھتا۔ کمہاروں کا کنبہ اپنی روایتی مہارت کے ساتھ اپنا کام کرتا جاتا اور فطرت ان کی تصویریں بناتا جاتا۔ مرد لنگوٹ باندھ کر مٹی کو پاؤں سے گوندھتے' عورتیں اس گارے میں زرم اور صاف مٹیملا کر گول گول "پیڑے" بناتی جاتیں جنہیں دو تینمرد تیزی کے ساتھ لکڑی کے سانچوں میں پٹخ کر یوں زمین پر الٹاتے کہ کچی اینٹ بن جاتی۔ پتہ نہیں وہ کب سے اس کام میں لگے ہوئے تھے کیونکہ جب فطرت وہاں پہنچا تو وہ پچاس پچاس اینٹوں کی بارہ قطاریں ڈال چکے تھے۔ اس نے یہ منظر اپنی اسکیچ بک میں محفوظ کر لیا۔

اس جگہ سے ذرا پیچھے بھنگیوں کی جھگیاں تھیں جو زیادہ تر لکڑی کے ڈنڈوں اور گھاس پھوس

 © Urdu4U.com

سے بنائی گئی تھیں۔ ان جھگیوں کے سامنے والی ڈھلوان پر میلے اور گیلے کپڑے بچھے تھے۔ ایک بوڑھا' خاکروب زمین پر بیٹھا حقہ پی رہا تھا وہ آنکھیں بند کر کے اس زور سے کش لگاتا گویا چلم میں صرف تمباکو نہیں کچھ اور بھی ہے۔ اس بڈھے کے آس پاس چند غلیظ اور ننگے بچے مٹی سے کھیل رہے تھے شائد ان کے والدین اپنی اپنی ڈیوٹی پر کہیں گئے ہوئے تھے۔

URDU4U.COM

اسکیچنگ کے لحاظ سے حفاظتی بند پر مقیم خانہ بدوشوں کا کنبہ فطرت کو زیادہ پرکشش لگتا تھا۔ ایک تو پس منظر میں صاف نیلا آسمان بڑا روشن روشن ماحول پیدا ہوتا تھا۔ اس چمکتے ماحول میں خانہ بدوشوں کی گڈیاں' تہہ در تہہ سلے ہوئے پرانے لحاف' کھانے پکانے کے بکھرے ہوئے برتن' سل پر مرچیں پیستی ہوئی عورتیں اور مرغیوں کے پیچھے بھاگتے ہوئے بچے ایک ہمہ جہت م نظر پیش کرتے تھے۔ جو عام شخص کے لئے کوئی دلچسپی نہ رکھتا تھا لیکن فطرت جیسے آرٹسٹ کے لئے اس میں بڑا مواد تھا وہ کئی کئی گھنٹے صرف کر کے ان حقیقی مناظر کو کبھی کینوس اور کبھی اپنی اسکیچ بک میں جمع کرتا رہتا تھا۔

ان لوگوں میں رہتے ہوئے فطرت نے ایک بات ضرور محسوس کی وہ یہ کہ یہ لوگ ہر قسم کے دباؤ اور کھچاؤ سے پاک زندگی گزار رہے تھے۔ اس چھوٹی سی بستی کے سو ڈیڑھ سو مکینوں میں اس نے کبھی ایک دوسرے کو مات دینے' روندنے یا ریزہ ریزہ کر دینے کا رجحان نہ پایا تھا۔ وہ سب دن بھر اپنے اپنے کام میں مصروف رہتے۔ شام کو تھوڑی دیر کے لئے اپنے دیئے ٹمٹماتے اور پھر جلدی چراغ گل کر کے چین کی نیند سو جاتے۔ صبح پھر اٹھ کر اپنی اپنی محنت میں جت جاتے۔ اور یوں روزانہ اپنی آنکھوں سے سورج کو چڑھتے ڈھلتے اور غروب ہوتے دیکھتے۔

فطرت کے خیال میں یہ لوگ بہت مطمئن اور خوش تھے۔

ایک دن فطرت حسب معمول ٹی ہاؤس گیا تو اسے پروفیسر سعید کا پیغام ملا کہ وہ اس

سے فوراً رابطہ قائم کرے۔ اس نے ٹی ہاؤس سے ہی پروفیسر سعید کو فون کیا اور ابتدائی علیک سلیک کے بعد پوچھا۔

"سر' کیا حکم ہے؟"

URDU4U.COM

"بھئی بات یہ ہے کہ میرے ایک پرانے جاننے والے ہیں۔ کراچی میں رہتے ہیں۔ ان کا نام ہے مسٹر کے۔ ایم۔ پاشا۔ ان کی ایڈورٹائزنگ ایجنسی ہے۔ لاکھوں کا کاروبار ہے۔ وہ لاہور میں اپنی ایجنسی کا آفس کھول رہے ہیں۔ انہیں یوں تو بہت سا سٹاف درکار ہے لیکن مجھ سی انہوں نے ایک آرٹسٹ کی فرمائش کی ہے۔ میں نے تمہاا نام دے دیا ہے اور انہیں تمہارے متعلق تمام ضروری باتیں بتا دی ہیں۔ تم کس وقت ان سے مل لو۔ وہ آج کل لاہور میں ہیں۔ ان کا پتہ ہے ۱۹-اے' مین گلبرگ' فون بھینوٹ کر لو۳۱۶۷۸۰' چاہو تو فون کر لو' چاہو تو خود چلے جاؤ۔ وہ تمہارا انتظار کر رہے ہوں گے۔"

"کام کیا ہو گا"

"کام کے متعلق تو پاشا صاحب ہی بتائیں گے۔ لیکن میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ تم آج کل جو کچھ کر رہے ہو یا آج تک جو کچھ کرتے رہے ہو اس سے یقیناً صاف اور بہتر کام ہو گا۔ تم لڑائی تو کرو۔ مجھے یقین ہے تمہیں کام اور ماحول پسند آئے گا۔"

فطرت نے دوسرا فون پاشا صاحب کو کیا اور ان کی سیکرٹری نے اسے فوری طور پر ملاقات کا وقت دیا۔ فطرت رکشا لے کر گلبرگ روانہ ہو گیا۔

جس کوٹھی کے باہر رکشا والے نے اسے اتارا وہ چھوٹے موٹے محل سے کچھ کم نہ تھی۔ اس کے دو وسیع گیٹ تھے۔ سامنے کشادہ ڈرائیور ان (Drive-in) جہاں کئی کاریں بیک وقت کھڑی کی جا سکتی تھیں۔ خوبصورت کشادہ لان' ہر طرف سبزہ ہی سبزہ اور پھول ہی پھول پورچ میں نئے ماڈل کیبسکٹی رنگ کی مرسیڈیز گاڑی کھڑی تھی۔ برآمدے میں ایک کمرے کے باہر لکھا تھا "استقبالیہ"۔ فطرت نے وہاں اپنا تعارف کرایا اتو استبقال کرنے والی خوبصورت خاتون سے ایک اور لڑکی کے اس لے گئی۔ غالباً پاشا صاحب کی

سیکرٹری تھی۔ اس نے بڑے دل نشین اور سلجھے ہوئے انداز میں فطرت کا استقبال کیا' اسے کافی اور سگار پیش کئے اور کہا:

URDU4U.COM

"پاشا صاحب ایک پارٹی کے ساتھ مصروف ہیں۔ چند منٹ کے لئے انتظار کی معذرت چاہتی ہوں"

"کوئی بات نہیں" فطرت نے جواب دیا۔

تھوڑی دیر بعد ایک مترنم سی گھنٹی بجی جو مس شیلا کے لئے اس بات کا اعلان تھی کہ پہلا ملاقاتی فارغ ہو گیا ہے۔ اگلے مہمان کو اندر بھیج دو۔ مس شیلا خود فطرت کو لے کر اندر گئی اور بڑے شستہ لہجے میں کہا:

"مسٹر فطرت' دی آرٹسٹ"

"اوہو' مسٹر فطرت' ویلکم ویلکم' میں تو کئی دن سے آپ کا انتظار کر رہا تھا۔ کیا حال ہے پروفیسر سعید صاحب کا۔"

"جی' وہ ٹھیک ہیں' آپ کو سلام کہہ رہے تھے۔ دراصل مجھے آج ہی پروفیسر سعید' کا پیغام ملا اور آج ہی حاضر ہو گیا ہوں"

"کوئی بات نہیں' کوئی بات نہیں Tis never too late "تشریف رکھئے"

فطرت سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔

"کیا پئیں گے آپ"

"جی کچھ نہیں' آپ کی سیکرٹری نے بھی اچھا پوچھا تھا"

"اوہو' نوہ' کچھ نہ کچھ تو پینا پڑے گا"

"دراصل مجھے پیاس نہیں ہے۔ نہ ٹھنڈے کی نہ گرم کی"

"مسٹر فطرت' میں نے سنا ہے تم پنجاب یونیورسٹی کے پڑھے ہوئے ہو' امریکہ میں بھی ایک سال رہ آئے ہو۔ یورپ بھی تم نے دیکھا ہے۔ اگر میں غلطی پر نہیں تو مشروبات پیاس لگنے پر نہیں پی جاتیں' وہ سوشل تقاضے پورے کرنے کے لئے استعمال کی جاتی ہیں۔

Don't you agree? (آپ کو اتفاق نہیں اس بات سے؟)"

"جی ہاں' آپ کا مشاہدہ درست ہے"
"پھر؟"
"چائے بلوا دیجئے"
"وائی ناٹ کافی' آج کل چائے کا فیشن نہیں رہا"
"کافی بھی ٹھیک ہے"

پاشا صاحب نے انٹر کوم پر مس شیلا کو دو کافی اندر بھجوانے کا آرڈر دیا اور فطرت سے

URDU4U.COM

کاروباری باتیں کرنے لگا۔

پاشا کی عمر پچاس سال کے لگ بھگ ہو گی۔ یوں تو اس کے زیادہ تر بال سفید ہو چکے تھے مگر کنپٹی پر سفیدی خاصی نمایاں تھیں۔ اس پس منظر میں اس کا کلین شیو چہرہ آسودگی کی سرخی سے بہت جاذب اور پر کشش لگ رہا تھا۔ اس کی ناک اونچی' آنکھیں تیز اور نچلا ہونٹ تھوڑا سا لٹکا ہوا تھا جو بکثرت تمباکو نوشی کی وجہ سے کچھ کچھ سیاہی مائل ہو چکا تھا اور باقی چہرے سے ذرا الگ لگتا تھا۔ اگرچہ ابھی موسم سرما پوری طرح شروع نہیں ہوا تھا لیکن پاشا نے تھری پیس سوٹ پہنا ہوا تھا جو غالباً ٹھنڈے ولایتی کپڑے کا بنا ہوا تھا۔

کمرے کا فرنیچر نہایت قیمتی اور اعلی ذوق کا آئینہ دار تھا۔ آفس ٹیبل قیمتی لکڑی کا بنا ہوا تھا۔ پاشا صاحب کی اپنی کرسی بہت بڑی تھی۔ اونچی' آرام دہ اور گھومنے والی۔ اس کی سیٹ' بازوؤں اور پشت پر قیمتی چمڑا منڈھا ہوا تھا۔ میز کے دوسرے جانب فون کی سیٹوں والی دو کرسیاں ملاقاتیوں کے لئے رکھی تھیں۔ اور بائیں جانب ایک اعلی صوفہ سیٹ بچھا تھا۔ سامنے میز پر پھولدان' سگریٹ کیس اور شیشے کی بڑی سی ایش ٹرے سجی ہوئی تھی پاشا صاحب کی میز کاغذوں سے ہر طرح پاک تھی۔ اس کی زینت صرف تین چیزوں سے تھی۔ خوبصورت ٹیبل لیمپ' ٹیلی فون (ایک سفید' ایک سیاہ) اور غیر ملکی ایش ٹرے (جن میں سے ایک میں استعمال شدہ پایپ اوندھا پڑا ہوا تھا")

ابتدائی گفتگو کی بعد پاشا نے کہا۔

"پروفیسر سعید نے آپ کی بہت تعریف کی ہے خاص کر آپ کے Talen (ذہنی صلاحیت) اورSelf-respect(عزت نفس کی۔ ہم انشاء اللہ دونوں کی قدر کریں گے۔ happy team

URDU4U.COM

We Shall make a (انشاء اللہ ہماری ٹیم اچھی رہے گی۔")

فطرت نے کہا "وہ تو سب ٹھیک ہے لیکن ابھی تک دو بنیادی باتوں کے بارے میں کوئی گفتگو نہیں ہوئی"

"یعنی"

"یعنی کام کی نوعیت اور تنخواہ

"میں نے آپ کو بتایا نا' کہ آپ ہامرے آرٹ اینڈ ڈیزائننگ سیکشن کے انچارج ہوں گے۔ آپ کا کام اپنے ہاتھوں سے پینٹ کرنا نہیں۔ بلکہ رہنمائی کرنا ہو گا۔ اس سیکشن میں پہلے ہی مس شہناز اور مسٹر لودھی کام کر رہے ہیں جنہیں میں کراچی آفس سے یہاں لایا ہوں۔ وہ بہت تجربہ کار ہیں۔ روٹین قسم کے ڈیزائن وہ خود بنا لیتے ہیں۔ آپ ہمارے Creative Artsit (تخلیقی فن کار) ہیں۔ آپ کا کام Visualise کرنا ہے۔ نئے نئے آئیڈیا(Adeas) دینا ہے۔ اس سلسلے میں کبھی کبھی میں بھی آپ کی مدد کیا کروں گا لیکناس نہایت اہم سیکشن کے سربراہ آپ ہوں گے۔ اگر آپ چاہیں تو اپنے اسٹنٹ کے طور پر کسی اور کو بھی ملازم رکھ سکتے ہیں لیکن شائد فی الحال اس کی ضرورت نہیں ہو گی آپ Conceiveکیجیے Visualiseکیجیے Creative کیجیے۔ مس شہناز اور مسٹر لودھی آپ سے ہر طرح تعاون کریں گے۔ باقی تنخواہ کا سوال' تو پروفیسر سعید نے مجھے بتایا تھا کہ آپ کی خواہش تھی کہ آپ فائن آرٹس ڈیپارٹمنٹ میں لیکچرار ہو جاتے اگر یہ نوکری آپ کو مل جاتی تو آپ کی تنخواہ چار سو روپے ماہوار ہوتی۔ ہم آپ کو پانچ سو روپے ماہور آفر کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ پچاس روپے ٹرانسپورٹ الاؤنس اور پچاس روپے Entertainment Allowance (تواضع الاؤنس)۔ کیوں ٹھیک ہے"

"جی ٹھیک ہے"

 © Urdu4U.com

"گُڈ۔ او' کے That's the deal گڈ لگ" (چلو طے ہوا)

"تھینک یو"

"ٹھہریئے ذرا"

فطرت رک گیا۔

پاشا نے مس شیلا کو اندر بلایا اور کہا

"مسٹر فطرت سے ملئے' ہمارے آرٹ سیکشن کے ڈائریکٹر"

URDU4U.COM

اس کے ساتھ ہیمس شیلا نے اپنا نرم نرم ہاتھ مصافحے کے لئے فطرت کی طرف بڑھایا اور کہا

"Congratulations" (مبارک ہو)

"تھینک یو"

"ہاں' تو مس شیلا' میں سیکرٹری انفارمیشن سے ملنے سیکرٹریٹ جا رہا ہوں آپ انہیں باقی سٹاف سے Indroduce (متعارف) کرا دیجئے"

"او' کے' سر"

اس کے بعد فطرت مس شیلا کے حوالے ہو گیا اور پاشا صاحب مرسیڈیز کار میں بیٹھ کر چلے گئے۔

مس شیلا فطرت کو دوسرے دفاتر میں لے گئی:

"یہ مسٹر حمید ہیں' ہمارے اسکرپٹ سیکشن کے انچارج' بنیادی طور پر لٹریچر کے آدمی ہیں تین سال پہلے ٹیچنگ چھوڑ کر ہمارے ساتھ آ گئے تھے۔ بہت اچھا لکھتے ہیں"

"یہ ہمارا فوٹو سیکشن ہے اور یہ ہیں اس کے انچارج' قسور زبیری' فوٹو گرافی کے کئے قومی اور بین الاقوامی مقابلوں میں انعام پا چکے ہیں"

"یہ ہیں جناب کوثر بخاری' ہمارے کمرشل سیکشن کے انچارج' یہ بزنس لانے کے ماہر ہیں۔ اتنا بزنس لاتے ہیں اتنا بزنس کہ پاشا صاحب خود حیران رہ جاتے ہیں"

"یہ ہمارا اکاؤنٹس سیکشن ہے اور یہ ہیں اس کے سربراہ فاروقی صاحب۔ ہم سب انہیں خوش رکھنے کی کوشش کرتے ہیں کیونکہ تنخواہ کا چیک یہی اشو کرتے ہیں"

اور
"اب ملہ اس دفتر کے سب سے اہم شخص چوہان صاحب سے، یہ ایڈمنسٹریشن کے انچارج ہیں۔ آپ کو گاڑی چاہئے، دفتر کا فرنیچر چاہئے، دفتر کا فرنیچر چاہئے، پینٹنگ ا سامان چاہئے، مہمانوں کی تواضع کا اہتمام چاہئے۔ سب کچھ ان کی مٹھی میں ہے۔ یہ خوش تو سارا دفتر خوش"

URDU4U.COM

مس شیلا فطرت کو مختلف دفاتر سے گھما کر بالا آخر آرٹ سیکشن میں لے آئی۔ "یہ ہے سر، آپ کا کمرہ، میز کرسی، ٹیبل لیمپ، سٹیشنری وغیرہ سب کچھ موجود ہے۔ اگر کسی اور چیز کی ضرورت ہو تو چوہان صاحب کو کہئے یا مجھے حکم کیجئے۔ اور ہاں آپ کے ساتھ ہی یہ دوسرا کمرہ شہناز اور لودھی کا ہے۔ آیئے ان سے ملئے، یہ آپ کے اسسٹنٹ ہوں گے۔ امید ہے پاشا صاحب نے بتا دیا ہو گا"
"جی ہاں، شکریہ، مس شیلا!"
"وش یو گڈلک، سر(Wish you good luck, sir")
یہ کہہ کر مس شیلا اپنے فرض سے سبکدوش ہو گئی اور فطرت نے اپنے نئے فرائض سنبھال لئے۔

فطرت کا اپنا دفتر چھوٹا مگر صاف ستھرا تھا، درمیانے سائز کی میز کے گرد چار کرسیاں بچھی تھیں، ایک فطرت کے بیٹھنے کے لئے اور دو تین مہمانوں کے لئے، بائیں طرف کانس پر چھوٹے سے گلدان میں دفتر کا مالی صبح صبح تازہ پھول سجا جاتا تھا۔ فطرت کی سیٹ کے سامنے والی دیوارف پر کسی بیرونی ملک کا خوبصورت کیلنڈر لٹکا ہوا تھا جس کی کچھ تاریخوں کے گرد سرخ دائرے لگائے گئے تھے جن سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ تاریخیں مختلف پروجیکٹ مکمل کرنے کے لئے نہایت اہم ہیں۔
سائیڈ روم میں شہناز اور لودھی بیٹھتے تھے جن کے سامنے چھوٹے چھوٹے میز اور ان پر ٹیبل لیمپ رکھے تھے جو سجاوٹ کم دیتے تھے اور کام زیادہ آتے تھے۔ باہر کھلنے والی کھڑکی کے پاس دیوار کے ساتھ ساتھ ایک لمبی میز رکھی تھی جس پر اشتہارات کے ڈیزائن وغیرہ

تیار کئے جاتے تھے اور عملی طور پر کاپی اسی میز پر جوڑی جاتی تھی۔
مس شہناز انگلش سکول کی پڑھی ہوئی تیز طرار لڑکی تھی۔ عمر کے لحاظ سے ۲۷'۲۸ سال کی ہو گی لیکن جس کی ساخت' بالوں کے اسٹائل اور روز مرہ زندگی میں رویئے کے مطابق بیس اکیس برس کی لگتی تھی۔ اس کے ساتھ کام کرنے والا لودھی چالیس سال کے لگ بھگ ہو گا اور شائد عیال دار بھی تھا لیکن دفتر کے ماحول کے مطابق اب بھی گرے رنگ کی پتلون پر سرخ ٹی شرٹ پہن کر آتا تھا' شہناز اور لودھی کے درمیان پچھلے تین سالوں کی کاروباری رفاقت تھی جس کی وجہ سے وہ ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھتے تھے اور عموماً گیارہ بجے والی کافی اکٹھے پیتے تھے۔ کبھی کبھی ورکنگ لنچ کے طور پر لودھی جو چار سینڈوچ بیوی سے بنوا کر لاتا تھا ان میں س دو مس شہناز کو دے دیتا تھا۔
فطرت نے یہ جوڑے توڑنے کی بجائے اس میں شامل ہونے کی کوشش کی لیکن دفتری معاملات کی حد تک۔ دفتری کام کی خاطر انہیں بار بار بلانے کی بجائے کبھی کبھی وہ خود اٹھ کر ان کے کمرے میں چلا جاتا' ان کے کام نگرانی کرتا' ضروری ہدایات دیتا اور ان کے ساتھ بڑے نرم اور دوستانہ طریقے سے پیش آتا۔ اس دوستانہ رویئے کے باوجود وہ کبھی اپنے ماتحت عملے سے بے تکلف نہ ہوتا وہ شہناز کی روایتی مسکراہٹوں کا بھی غلط مطلب نکالنے کی بجائے اس سے نپا تلا رویہ روا رکھتا۔ بس یوں سمجھئے کہ ان تینوں کے درمیان ایک خوشگوار دوستانہ کاروباری رشتہ قائم ہو گیا اور پاشا صاحب کے بقول وہ ایک چھوٹی سی ہیپی ٹیم (Happy team) بن گئے۔
اگرچہ فوٹو گرافک سیکشن براہ راست فطرت کے ماتحت نہ تھا لیکن کام کاج کی ریت یہ تھی کہ آرٹ سیکشن سے جس قسم کی تصویر کی مانگ آتی فوٹو سیکشن اسے پورا کر دیتا۔
ایک دن فطرت اپنے دفتر سے نکل کر سٹوڈیو میں چلا گیا جہاں ایک ٹائلٹ سوپ کے اشتہار کے لئے ایک ماڈل کی تصویر کھینچی جا رہی تھی۔ لودھی اور شہناز بھی سٹوڈیو میں

موجود تھے' ماڈل لڑکی چہرے پر مسکراہٹ طاری کر کے فوٹو کھنچوانے کے لئے تیار بیٹھی تھی اور فوٹو گرافر "ریڈی" "مس" کہنے ہی والا تھا کہ فطرت نے ایک منٹ رک جانے کو کہا۔

URDU4U.COM

سارا کام روک دیا گیا

فطرت نے کہا "آپ لوگ دیکھتے ہیں کہ ماڈل کے پاؤں کا سینڈل پرانا ہے"

فوٹو گرافر' لودھی اور شہناز سمجھے کہ فطرت بالکل نیا اور اناڑی ہے' انہوں نے تقریباً یک زبان ہو کر کہا

"سر' تصویر تو صرف چہرے کی اتاری جا رہی ہے' تصویر میں سینڈل نظر نہیں آئیں گے"

"وہ ٹھیک ہے لیکن میرا مشورہ آزما لو بہتر تصویر آئے گی"

"جی' وہ کیا"

"میں نے کسی کتاب میں پڑھا تھا' آج آزما کر دیکھ لیتے ہیں' شہناز اگر زحمت نہ ہو تو ایک منٹ کے لئے اپنا نیا سینڈل ماڈل کو پہنایئے"

شہناز نے غیر یقینی سی حالت میں فطرت کی طرف دیکھا اور باد ل نخواستہ اپنا سینڈل اتار کر ماڈل کو پہنا دیا۔

جب ماڈل لڑکی نے نیا سینڈل پہنا تو اس کا چہرہ کھل اٹھا' فطرت نے اپنے ساتھیوں سے کہا:

"کچھ فرق محسوس ہوا آپ کو"

"جی ہاں' ماڈل کا سارا ایکسپریشن Expression ہی بدل گیا۔ حالانکہ بظاہر پاؤں کے سینڈل کا چہرے کے تاثرات کے ساتھ کوئی تعلق نہ تھا"

"میں آپ کو یہی بتانا چاہتا تھا کہ چہرے کا تاثر صرف چہرے کا تاثر نہیں ہوتا' یہ پوری شخصیت کا ایکسپریشن (Expression) ہوتا ہے اب' تصویر لیجئے' آپ خود فرق محسوس کریں گے"

واقعی تصویر پہلے سے بدرجہا بہتر اتری۔

ایک دن لودھی اور شہناز سگریٹوں کے اشتہار کے لئے ایک ڈیزائن پر کام کر رہے تھے اسکرپٹ سیکشن نے جو سکرپٹ تیار کیا تھا اس کا بنیادی نکتہ یہ تھا کہ یہ سگریٹ ہر عمر

URDU4U .COM

اور ہر کلاس کے لوگوں کے لئے ہے' اس کے ساتھ جوان' ادھیڑ عمر اور بوڑھے اشخاص کی تصویر بنوائی گئی تھی اور ان تینوں میں سے ایک شخص کے ہاتھ میں جلتا ہوا سگریٹ تھمایا گیا تھا۔

فطرت حسب عادت اپنے دفتر سے نکلا اور سائیڈ روم میں پڑی ہوئی میز کے پاس جا کھڑا ہوا جہاں لودھی اور شہناز جھک کر کام کر رہے تھے۔ وہ فطرت کو دیکھ کر سیدھے کھڑے ہو گئے۔ فطرت بڑے غور سے ڈیزائن کو دیکھتا رہا۔

"ٹھیک ہے نا' سر' شہناز نے کہا

"ہاں' تکنیکی لحاظ سے ڈیزائن کی کمپوزیشن تو ٹھیک ہے لیکن اس میں دو چھوٹی چھوٹے

خامیاں ہیں"

شہناز نے لودھی کی طرف دیکھا اور پھر دونوں فطرت کی طرف متوجہ ہوئے۔

"سر؟"

"پہلی خامی یہ ہے کہ ان تین چہروں میں سے پتہ چلتا کہ کس کس نے سگریٹ پی لیا ہے اور کس کس نے ابھی سگریٹ پینا ہے۔ ایک اچھے سگریٹ کے اچھے اشتہار کی بنیادی خوبی یہ ہونی چاہئے کہ جس نے سگریٹ پی لیا ہے اس کے چہرے پر طمانیت ہونی چاہئے اور جس نے ابھی نہیں پیا اس کے چہرے پر گریٹ کی پیاس یا طلب نظر آنی چاہئے۔ لہٰذا آپ کو یہ تصویریں دوبارہ بنوانی پڑیں گی"

"اور دوسرا نقص' سر"

"دوسرا نقص تو نہیں لیکن جمالیات کا معاملہ ہے ذوق جمالیات کا تقاضا ہے کہ سگریٹ کے دھوں کو اتنا گاڑھا یا Thick نہ دکھایئے' سگریٹ کا کش لگاتے ہی پہلے ایک سیکنڈمیں دھواں بے شک گہرا ہوتا ہے لیکن اس کے فوراً بعد اس کی Thickness میں فرق

آ جاتا ہے۔ خاص کر جب بیک گراونڈ میں لگی ہوئی سکرین کا اپنا رنگ اتنا ہلکا ہے تو یہ دھواں بھی ہلکا ہونا چاہئے۔ یہ سگریٹ کا دھواں کس نے بنایا ہے؟"

URDU4U.COM

"میں نے بنایا ہے' لودھی نے کہا

"اسے ذرا ہلکا کر دیجئے" فطرت نے کہا

اس کے حکم کے مطابق نئی تصویریں بنا کر نیا ڈیزائن تیار کیا گیا تو اس میں واضح فرق نظر آنے لگا۔

ان چھوٹی چھوٹی باتوں سے ایک ذہین اور Creative آرٹسٹ کے طور پر فطرت کی شہرت ساری دفتر میں پھیل گئی' مس شیلا اور چوہان صاحب نے بھی علیحدہ علیحدہ فطرت کے کام کی تعریف کی پاشا صاحب نے پروفیسر سعید کو شکریئے کا خط لکھا کہ انہوں نے واقعی ایک پڑھا لکھا اور تخیقی تخیل رکھنے والا آرٹسٹ بھجوایا ہے۔

یوں کام کرتے کرتے ایک سال گزر گیا۔ سالانہ ترقی کا وقت آیا تو پاشا صاحب نے فطرت کی تنخواہ میں پچاس روپے سالانہ کی بجائے سو روپے کا اضافہ کر دیا۔

فطرت پر خوشحالی کے کچھ آثار نظر آنے لگے' ابھی تک امریکہ سے خریدے ہوئی کپڑے اس کے ساتھ دے رہے تھے' اس نے دو تین ٹی شرٹس خرید لیں اور جو پیسے بچے اس میں کمپنی سے کچھ ایڈوانس ملا کر ایک موٹر سائیکل خرید لی۔ اب وہ بس کا متحاج نہ رہا تھا۔ مزے سے نئی بستی سے اپنے موٹر سائیکل پر نکلتا اور پندرہ بیس منٹ میں دفتر پہنچ جاتا۔

اب تک زندگی کا دھارا ٹھیک چل رہا تھا' اگرچہ اس عرصے میں فطرت اپنی صرف دو اور پرائیوٹ پینٹنگ بنا سکا تھا اور زیادہ تر وقت دفتری کام میں صرف ہوتا تھا لیکن وہ کام کی نوعیت دفتر کے ماحول اور تنخواہ وغیرہ سے بہت مطمئن تھا۔

اچانک گاؤں سے خبر آئی کہ فوراً پہنچو کیونکہ تمہاری ماں (ریشماں) کو فالج ہو گیا ہے۔
فطرت نے دفتر سے ایک ہفتے کی چھٹی لی اور اپنے ہی موٹر سائیکل پر اپنے گاؤں روانہ

© Urdu4U.com

ہو گیا۔

فطرت گھر پہنچا تو وہاں یاس کا عالم تھا' برآمدے میں کئی عورتیں گم سم چارپائیوں پر بیٹھی تھیں' دو تین نے دہلیز پر ڈیرہ ڈال رکھا تھا' فطرت سیدھا نیم تاریک کمرے میں پہنچا جہاں نیم جاں ریشماں آنکھیں بند کئے پڑی تھی ایک تیمار دار عورت نے اس کا نیممردہ بازو جھنجھوڑ کر کہا "دیکھ ریشماں' دیکھ۔ ارے دیکھ تو سہی کون آیا ہے"

ایک نحیف سی آواز آئی "کون"

"میں فطرت ہوں' امی' فطرت" یہ کہتے ہوئے فطرت نے اپنی ماں کی چارپائی کے ساتھ کچے فرش پر گھٹنے ٹیک دیئے اور اپنا کان ریشماں کے منہ کے سامنے کر دیا۔ وہ نحیف اور ٹوٹی پھوٹی آواز میں کہہ رہی تھی:

"میرا آخری وقت آخری وقت میری آخری خواہش فطری پتر' آخری خواہش' مولوی بلاؤ نکاح نکاح پڑھاؤ زبیدہ میرے مرحوم بھائی کی بیٹی میرا کوئی اعتبار نہیں آخری گھڑی"

جب ریشماں کی پٹی سے لگی ہوء دوسری عورتوں نے یہ الفاظ سنے تو انہوں نے اعلان کر دیا کہ ریشماں کہہ رہی ہے کہ میرا آخری وقت آ گیا ہے' میں چاہتی ہوں کہ میرے مرنے سے پہلے میری آخری خواہش پوری کر دی جائے اور فطرت کا نکاح میری بھتیجی زبیدہ سے کر دیا جائے۔

زبیدہ اور اس کی ماں پہلے ہی فالج کی خبر سن کر تیمار داری کے لئے پہنچ چکی تھیں یہ فیصلہ سن کر زبیدہ تو دوپٹے کا گھونگھٹ کر کے ساتھ والے کمرے میں چلی گئی لیکن اس کی ماں دوسری عورتوں سے مبارکبادیں لینے لگی۔

اسی شام مولوی صاحب کو بلوا کر فطرت اور زبیدہ کا نکاح پڑھوا دیا گیا۔ زبیدہ کی ماں خود اس رشتے کی خواہش مند تھی اور زبیدہ کا باپ پہلے ہی فوت ہو چکا تھا۔ جس شام نکاح ہوا اسی رات ریشماں اس دار فانی سے کوچ کر گئی۔ چوبیس گھنٹے کے اندر اندر ایک ہی گھر میں خوشی اور غمی کی وارداتیں مکمل ہو گئیں۔

گاؤں کی مشترکہ ملکیت چٹائیاں منگوا کر صف ماتم بچھا دی گئی' لوگ باری باری فاتحہ کے لئے آنے لگے' فطرت ہر بار دعا کے لئے ہاتھ اٹھاتا تو اس کے آنسو ابل آتے وہ کبھی انہیں پی جاتا اور کبھی رومال میں جذب کر لیتا' اس کیمتھی میں مسلا ہوا رومال مکمل طور پر بھیگ چکا تھا۔ آج پھر ذکیہ اسے بہت یاد آئی۔ ماں کے بعد کوئی شخص باقی نہ رہا تھا جس سے وہ دل کی بات کہہ سکتا' اسے رہ رہ کر خیال آ رہا تھا کہ اگر آج ذکیہ زندہ ہوتی تو دونوں بہن بھائی ایک دوسرے کا غم بانٹتے ایک دوسرے کو تسلی دیتے اور مستقبل میں ایک دوسرے کا سہار بنتے۔

ریشماں کی وفات کے بعد گھر کا سارا انتظام زبیدہ اور اس کی ماں نے سنبھال لیا وہی دکان سے سودا منگواتیں' وہی ہانڈی روٹی پکاتیں اور وہی مہمانوں کا خیال رکھتیں۔ فطرت اس اچانک حادثے سے یوں گم سم ہو گیا تھا کہ وہ کسی سے بات نہیں کرتا تھا۔ وہ صبح ہاتھ منہ دھو کر صف ماتم پر بیٹھ جاتا' آنے والوں کے ساتھ فاتحہ خوانیکرتا اور پھر گھٹنوں میں منہ دے کر سوچتا رہتا کہ یہ سب کچھ کیا ہو گیا' کیسے ہو گیا۔

ریشماں کے مرنے کے بعد فطرت کو پہلی بار احساس ہوا کہ اس کا باپ مر چکا ہے۔

جب فطرت کی چھٹی ختم ہونے کو آئی تو وہ سوچنے لگا کہ سات دن پہلے جب وہ لاہور میں تھا تو کائنات کتنی حسین' کتنی پر امید اور کتنی دل آویز تھی اور آج جب وہ گاؤں سے روانہ ہونے والا ہے تو زندگی کتنی بدل چکی ہے' والدہ کا سایہ سر سے اچانک اٹھ چکا ہے اور اس کی شادی ایسے وقت کر دی گئی ہے جب وہ ذہنی طور پر اس کے لئے بالکل تیار نہیں ہے۔ وہ زبیدہ کو دیکھ چکا تھا لیکن ایک ماموں زاد بہن کی طور پر' اس نے کبھی اسے اپنی رفیقہ حیات کے روپ میں خوابوں میں نہیں سجایا تھا۔ پتہ نہیں وہ عادتوں کی کیسی ہو گی؟ زندگی میں میرا بوجھ ہلکا کرے گی یا اس میں اضافے کا باعث بنے گی۔ فطرت کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔

وہ سارا گھر بار زبیدہ اور اس کی ماں کے سپرد کر کے لاہور چلا گیا۔

فطرت جس قسم کے موڈرن دفتر میں کام کرتا تھا وہاں کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی کہ اتنے مختصر وقت میں فطرت کی کائنات کس حد تک بدل چکی ہے' اس کے چہرے سے کسی نے اندازہ نہ کیا کہ وہ ذہنی تشنج میں مبتلا ہے' کسی نے اس کے ذاتی معاملات میں دلچسپی نہلی اور دفتر واپس آنے پر مس شیلا برآمدے میں سے گزرتے ہوئے صرف اتنا کہا "ویلکم بیک" (واپسی مبارک)

فطرت اپنے دفتر میں بیٹھا گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا کہ شہناز آئی اور میز کی دوسری جانب کھڑی ہو گئی' تھوڑی دیر بعد فطرت کو اپنے چہرے پر نسوانی نگاہوں کی تمازت محسوس ہوئی۔ اس نے بحر تفکرات سے نکل کر شہناز سے کچھ کہنا چاہا تو اس نے پہل کر دی "سر' ایڈورٹائزنگ میں اتنی گہری سوچ کر ضرورت نہیں ہوتی' سارا کام پی آر اور گلیمر کا ہے اگر تعلقات ٹھیک ہوں تو چھوٹا موٹا آئیڈیا بھی Accept (منظور) ہو جاتا ہے۔ کونسا ڈیزائن سوچ رہے ہیں آپ؟"
"تم چھوڑو میری سوچ کو' یہ بتاؤ کیسے آئی ہو۔ میری غیر حاضری میں کوئی نیا کام کوئی نیا پروجیکٹ؟"
"نہیں کوئی نیا پروجیکٹ تو شروع نہیں ہو' البتہ یہ کارڈ ہے آپ کے لئے"
"بیٹھیے آپ"
شہناز سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی
فطرت نے کارڈ دیکھا تو یہ ڈنر اینڈ ڈانس پارٹی کا دعوت نامہ تھا۔ تھری ڈیز Three D's کے مینجنگ ڈائریکٹر مسٹر کے۔ ایم پاشا کی طرف سے۔
فطرت نے کہا "یہ کیا ہے؟"
شہناز نے شرارت سے کہا "یہ کارڈ ہے"
فطرت شرارت سے محظوظ ہونے کے موڈ میں نہیں تھا اس نے کہا
"وہ تو میں دیکھ رہا ہوں لیکن اس کا موقع محل کیا ہے"
"یہ ہماری فرم کی پرانی ٹریڈیشن (Tradition) ہے' پاشا صاحب سال میں کم از کم ایک

ایسی پارٹی ضرور کرتے ہیں۔ لاہور میں نئے نئے آتے ہیں' پہلے سال یہ فنکشن مس ہو گیا ورنہ پاشا صاحب اسی سالانہ فیسٹیول کے طور پر مناتے ہیں"

URDU4U.COM

"مگر کس لئے"

"اگر کوئی موٹی پارٹی پھنس جائے تو اسے مہمان خصوصی کے طور پر بلا لیتے ہیں ورنہ ویسے ہی گیٹ ٹوگیدر (Get-to-gether) کر لیتے ہیں' پبلک ریلیشننگ کا بڑا اچھا بہانہ ہے۔ یہ بڑے بڑے لوگ آتے ہیں اس پارٹی میں' مکسڈ پارٹی (Mixed Party) ہوتی ہے۔ بڑا مزا آتا ہے' میں تو سارا سال اس کا انتظار کرتی ہوں"

"اگر کوئی شخص اس پارٹی میں نہ آئے تو.....؟"

"آج تک تو ایسا ہوا نہیں۔ کم از کم سٹاف کے لئے تو یہ ناممکن ہے کہ کوئی پارٹی سے غیر حاضر ہو جائے۔ ہم تو ہوسٹ (Host) ہوتے ہیں اس رات"

"کب ہے یہ پارٹی"

"کل رات"

"اچھا دیکھا جائے گا اور کوئی بات' میرا مطلب ہے دفتر کا کوئی کام؟"

"نہیں کچھ نہیں"

"اچھا' تھینک یو"

مس شہناز جیسی ذہین اور ہوشیار لڑکی بھی فطرت کے اندرونی ہیجان کا اندازہ نہ کر سکی۔ وہ جس طرح آئی تھی اسی طرح واپس چلی گئی۔

تھوڑی دیر بعد شیلا نے انٹر کوم پر اطلاع دی کہ پاشا صاحب فطرت صاحب کو یاد کر رہے ہیں۔ فطرت تعمیل حکم کے طور پر حاضر ہو گیا۔

پاشا نے کہا "تشریف رکھیے"

فطرت بیٹھ گیا

"آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے آپ کچھ Depressed لگ رہے ہیں"

"نہیں سر' ٹھیک ہوں' آپ فرمایئے"

"میں نے آپ سے دو باتیں کہنا تھی' ایک یہ کہ کل شام فرم کی طرف سے ڈانس اینڈ ڈنر پارٹی ہے' جمخانہ میں۔ ہم ہر سال یہ پارٹی کرتے ہیں اور اس سال لاہور میں نئے نئے کام کی وجہ سے کچھ دیر ہو گئی ہے امیدہ ے آپ کو کارڈ ملگیا ہو گا۔ آپ اس میں ضرور آیئے سٹاف کے لئے یہ پارٹی نہیں ڈیوٹی ہوتی ہے"

"سر"

"دوسری بات جو زیادہ اہم ہے وہ یہ کہ اس سال پاکستان میں ٹیلی ویژن Introduce ہو رہا ہے پہلی بار ہم ابھی تک اخباری اشتہار سے ڈیل (Deal) کرتے رہے ہیں ٹیلی ویژن ایڈورٹائزنگ ہمارے لئے بہت بڑا چیلنج ہے۔ ہم اس میدان میں کسی سے مات نہیں کھانا چاہتے"

"جی"

"لہٰذا آپ چھوٹے موٹے کام۔ صابن' سگریٹ' ٹوتھ پیسٹ' شربت وغیرہ کے اشتہار شہناز اور لودھی پر چھوڑ دیجئے اور خود اس نئے مسئلے کے بارے میں سوچئے۔ وقت بہت کم رہ گیا ہے۔ ہمیں ابھی سے تیاری شروع کر دینی چاہئے' ابھی بہت کچھ کرنا ہے۔ Clients سے بات کرنی ہے' اشتہاری فلمیں تیار کرنی ہیں' ان فلموں کے لئے کاسٹ ڈھونڈنا ہے پھر لیبارٹری کا بندوبست کرنا ہے"

"جی میں سوچتا ہوں"

"ہم نے آپ کو ایک Creative Artsist کے طور پر لیا تھا' پروفیسر سعید نے مجھے بتایا تھا کہ آپ کو بہت آئیڈیاز(Ideas) آتے ہیں Original and Fantastic (نئے نئے اور عمدہ خیالات)

"آپ فکر نہ کیجئے۔ میں اس موضوع پر کام کرتا ہوں"

"میں کل شام اس پارٹی میں شرکت کے بعد پرسوں صبح کی فلائٹ سے کراچی جا رہا ہوں جہاں میں نے اسی مقصد کے لئے بورڈ آف ڈائریکٹرز کی میٹنگ بلائی ہے' جانے سے پہلے آپ اپنی Proposals(تجاویز) دے دیجئے' میں جہاز میں دیکھ لوں گا۔ او' کے"

"ٹھیک ہے۔ جناب"

دوسری دن وعدے کے مطابق فطرت نے تجاویز کا خاہ تیار کر کے مس شیلا کو پہنچا دیا۔

ڈانس اینڈ ڈنر پارٹی کیا تھی' ایک ہنگامہ تھا' عورتیں اور مرد اپنے بہترین لباس میں رات کے آٹھ بجے جمخانہ پہنچنا شروع ہو گئے۔ پاشا کی ملازم لڑکیاں مس شیلا خورشید (افسر مہمانداری) مس شہناز اور مس چوہدری (اکاؤنٹس ڈیپارٹمنٹ) مہمان کا استقبال کر رہی تھیں۔ مہمان بیگمات رزق برق لباس' نئے ڈیزائن کے زیور اور نایاب قسم کی پرفیوم لگا کر سارے ہال کو بقعہ نور بنا رہی تھیں۔ اکثر مردوں نے سیاہ سوٹ پہن رکھے تھے اور ان کی غیر ملکی نک ٹائی ان کی توند کے اوپر سے ہو کر کوٹ کے نچلے بٹن میں چھپ رہی تھی زیادہ تر مہمانوں کے ایک ہاتھ میں شراب کا جام تھا اور دوسرے میں سگار یا سگریٹ' اگرچہ موسم گرما ابھی پوری طرح رخصت نہیں ہوا تھا لیکن پچھلے تین چار دنوں کی متواتر بارشوں سے گرمی کا زور ٹوٹ چکا تھا اور جم خانے کی موثر ایئر کنڈیشننگ کی وجہ سے ہوا میں رطوبت بھی بہت کم تھی۔

ہال کے ایک نیم تاریک کونے میں آرکسٹرا مصروف عمل تھا' وہ ابھی دھیمی دھیمی بجا رہے تھے' انہیں انتظار تھا کہ حاضرین استقبالیہ حال سے نکل کر پردے کے پیچھے ڈانسنگ فلور پر آ جائیں تو یہ اپنی تیز اور مسحور کن دھنوں سے محفل کو گرمائیں فی الحال جم خانہ کے باوردی بیرے ٹرے میں مختلف شرابیں سجائے مہمانوں کے آگے پیچھے پھر رہے تھے۔ مسز خورشید بڑے اصرار سے مہمانوں کو ان کی پسند کی مشروبات پیش کر رہی تھی۔ پاشا صاحب آج کی پارٹی کے مہمان خصوصی جناب کے۔ اے۔ آر خواجہ کے ارد گرد گردش کر رہے تھے اور مہمانوں کا ایک دوسرے سے تعارف کرا رہے تھے' مس شہناز' مس چوہدری اور مس شیلا اپنی اپنی پسند کا مشروب ہاتھ میں تھامے چل پھر کر مہمانوں سے پوچھ رہی تھیں کہ آپ کو اور شراب چاہئے' کباب چاہئے یا سنیکس چاہئے۔

فطرت جسمانی لحاظ سے پارٹی میں موجود تھا' لیکن ذہنی طور پر وہ کہیں اور پہنچا ہوا تھا۔

اس کے خیالات گاؤں کے قبرستان' اپنے آبائی مکان اور زبیدہ کی طرف گشت کر رہے تھے۔ ایک ویٹر آیا اور شراب کی ٹرے سامنے کر کے کہنے لگا

URDU4U.COM

"آپ کی پسند"

"تھینک یو"

چند منٹ بعد دوسرا ویٹر آیا اور ٹرے سامنے کر کے کہنے لگا

"آپ کی پسندیدہ ڈرنک"

"نو' تھینک یو"

جب مسز خورشید نے تین چار بیروں کو یوں ناکام لوٹتے دیکھا تو وہ فطرت کے پاس آئی اور راز داری سے کہنے لگی "پاشا صاحب دیکھ رہے ہیں' آپ نہ شراب پی رہے ہیں اور نہ مہمانوں میں مکس ہو رہے ہیں' وہ یوں الگ تھلگ بیٹھنے والوں کو ناپسند کرتے ہیں۔ کچھ نہ کجھ لے لیجیے"

"اچھا' تو کوئی جوس یا سافٹ ڈرنگ بھجوا دیجیے"

تھوڑی دیر بعد درمیانی پردہ ہٹا دیا گیا اور ڈانس کے شوقین ڈانسنگ فلور پر چلے گئے جو مرد یا عورتیں اپنے موٹاپے یا بڑھاپے کی وجہ سے اس شغل میں شریک نہ ہو سکتی تھیں وہ صوفوں پر بیٹھ کر تماشا دیکھنے لگیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے ڈانسنگ ہال جاگ اٹھا۔

مردوں نے اپنی اپنی پسند کی عورتوں کے ہاتھ تھام کر ناچنا شروع کر دیا۔ آرکسٹرا کی دھنیں تیز ہونے لگیں اور شراب کی مہک اور قیمتی سگریٹوں کے دواں میں یہ ڈانسنگ پارٹی ہمہ تن رقص بن گئی آدھ گھنٹے کے بعد ایک خاص تان پر آرکسٹرا کی دھن ٹوٹی تو رقص کرتے پاؤں تھم گئے ہاتھ ہاتھوں سے چھوٹ گئے اور ڈانسنگ ہال کی بتیاں روشن ہو گئیں۔

پانچ منٹ کے وقفے کے بعد رقص کا دوسرا دور شروع ہوا۔ پارٹنر بدل گئے دھنیں جاگ اٹھیں' جذبات بھڑک اٹھے اور ڈانسنگ ہال کا لکڑی کا فرش کانپ اٹھا۔

وقفے وقفے سے یہ سلسلہ جاری رہا۔

فطرت ایک کونے میں صوفے پر بیٹھا یہ سارا نظارہ دیکھتا رہا' وہ شریک بھی تھا اور الگ تھلک بھی۔ اس نے دیکھا کہ دو جوانوں نے مس شیلا اور مس شہناز کے ساتھ ڈانس کرتے ہوئے پہلے ان کے ہاتھ تھامے' پھر اپنا ہاتھ ان کے برہنہ شانوں پر رکھا اور جونہی میوزک کی دھن تیز ہوئی تو انہوں نے ان کی پشت پر بلاؤز کی تپلی سی پٹی میں سے ہاتھ ڈال کر انہیں اپنے بہت قریب کھینچ لیا۔

باہر زور کی بارش ہو رہی تھی' فطرت کے اندر زبردست طوفان برپا تھا لیکن رنگ آہنگ کی یہ محفل اپنے عروج پر تھی۔

آدھی رات کے بعد جب آخری دور ختم ہوا اور روشنیاں بحال کر دی گئی تو کئی نوجوان جوڑوں کے چہروں پر پسینے کی بوندیں چمک رہی تھیں حالانکہ حال میں قطعاً گرمی نہ تھی۔

رات کے ساڑھے بارہ بجے ڈنر شروع ہوا' لیکن روسٹ' کباب تکے اور مچھلی اور دوسری اشیاء سے ڈھکنے اٹھائے گئے اور جن عورتوں اور مردوں کی بھوک شراب اور ڈانس کی وجہ سے خاصی تیز ہو چکی تھی کھانے پر جھپٹ پڑے۔ پتہ نہیں کیوں فطرت کی بھوک مر گئی' اس نے ایک نوالہ بھی منہ میں نہ ڈالا۔

محفل برخاست ہو گئی' لوگ اپنے گھروں کو روانہ ہو گئے۔

بارش ابھی زوروں پر تھی' فطرت اپنے چھوٹے سے موٹر سائیکل پر اس بارش میں گھر جانے کی بجائے دفتر میں رک گیا صبح سات بجے کے قریب بارش تو وہ نئی بستی میں اپنے مکان کی طرف روانہ ہوا تاکہ نہا دھو کر کپڑے بدل آئے اور تازہ دم ہو کر دفتر کا کام شروع کرے۔

جب وہ بڈھے راوی سے آگے گیا تو سڑک پر پانی ہی پانی تھا' کچھ پانی دائیں جانب لکڑی دکانوں میں بھی گھس چکا تھا' وہ وہیں رک گیا' وہ سوچ رہا تھا کہ چھوٹے پہیوں والی موٹر سائیکل کو پانی میں ڈالے یا نہیں اتنے میں سامنے سے سکوٹر پر ایک صاحب آتے دکھائی دیئے اس اجنبی نے کسی تعارف کے بغیر فطرت کو کہا "ڈرو مت' پانی زیادہ گہرا

نہیں ہے''

فطرت نے اپنا موٹر سائیکل پانی میں ڈال دیا اور پوری سٹیم کے ساتھ اسے پانی میں سے بحفاظت گزار کر لے گیا۔ وہ بخیر و عافیت دریائے راوی کے کنارے بسوں کے اڈے تک پہنچ گیا' نئی بستی کی طرف راستہ کچا تھا' اس لئے اس نے اڈے پر موٹر سائیکل ایک ہوٹل میں کھڑا کیا اور خود پیدل آگے بڑھنے لگا۔ یہ دیکھکر اس کے صدمے اور حیرت کی حد تک نہ رہی کہ نئی بستی بالکل صاف ہو چکی ہے۔ حفاظتی بند ٹوٹ چکا ہے۔ اس پر خانہ بدوشوں کے خیمے اور ان کے مکین غائب ہو چکے ہیں۔ اینٹیں ڈالنے والے مصلیوں' گوالوں اور بھنگیوں کی جھکیاں بہہ چکی ہیں۔ اب وہاں نہ بستی ہے نہ بستی والے! سیلاب کا تیز دھارا ہر شے کو تیز بلیڈ کی طرح کاٹ کر لے گیا۔ پتہ نہیں وہ گندے' غریب اور کالے بچے کہاں گئے' وہ نشے کا عادی بڈھا خاکروب کہاں گیا' وہ مرغیوں کے پیچھے بھاگنے والی خانہ بدوش لڑکے کہاں گئے؟

فطرت کے اندر جذبات کا ایک سیلاب اٹھا اور اس کے بہت بڑے حصے کو بہا کر لے گیا۔

فطرت کا اپنا مکان (کرایہ والا) منہدم ہو چکا تھا' چار دیواری گر چکی تھی صحن میں پانی کھڑا تھا صرف نلکے کی ہتھی کا اوپر والا سرا پانی سے باہر نظر آ رہا تھا باقی ہر شے غرق ہو چکی تھی۔

گلبرگ اور اس کی رونقیں بدستور اپنے جوبن پر تھیں۔

فطرت کا ایک بار پھر خیابان ہوٹل میں منتقل ہو گیا۔ سردیوں کے کپڑے وہ پہلے ہی گاؤں چھوڑ آیا تھا۔ گرمیوں کے جو کپڑے سیلاب میں بہہ گئے تھے ان کی جگہ اس نے ریڈیمیڈ کپڑے خرید لئے اور معمول کے مطابق دفتر جانے لگا۔ اس کا اصل نقصان وہ کینوس تھے جو سیلاب میں ضائع ہو گئے۔ البتہ اس کی اسکیچ بک بچ گئی جو اس کے ہینڈ بیگ میں ہوتی تھی اور عموماً موٹر سائیکل کی ڈگی میں بند رہتی تھی۔

ایک دن وہ دفتر میں بیٹھا اخبار دیکھ رہا تھا کہ اس کی نظر ایک اشتہار پر پڑی۔ یہ اشتہار ادارۂ شناخت پاکستان کی طرف سے تھا۔ انہیں ایک آرٹسٹ کی ضرورت تھی۔ اس کے لئے جو شرائط مطلوب تھیں وہ فطرت اچھی طرح پوری کرتا تھا۔ اس کا جی چاہا کہ وہ اس نئی نوکری کے لئے درخواست دے دے کیونکہ حال ہی میں اس نے پاشا صاحب کی کامیابی کا جواز دیکھا تھا اس سے وہ کچھ بدمزہ ہو گیا تھا۔ اس نے بعض حلقوں سے یہ بھی سنا تھا کہ تھری ڈیز (3-D's) کا مطلب Deceit,Drinks and Debauchery (دھوکہ دہی' شراب اور بدقماشی) ہے۔ کیا اسے ایسے ادارے میں کام کرنا چاہئے جس کی کامیابی کا زاویہ برائیاں ہیں؟

لیکن نئے ادارے میں بھی فطرت کے لئے زیادہ کشش نہ تھی۔ فطرت نے سوچا کہ یہ ایک روایتی قسم کا ادارہ ہو گا جہاں روایتی قسم کی قیود ہوں گی جو اس کی رہی سہی تخلیقی صلاحیتوں کو بھی سلب کر دیں گی۔ وہ تو اصولی طور پر بنے بنائے سانچوں میں ڈھلنے کے خلاف تھا۔ اگرچہ اس میں ان سانچوں کو ایک لخت بدلنے یا توڑنے کی ہمت نہ تھی لیکن اس کی یہ خواہش ضرور تھی کہ وہ زندگی گزارے تو روٹین سے ہٹ کر اور پینٹ کرے تو منفرد انداز میں۔ لیکن پچھلے چند سالوں کی جدوجہد کے باوجود زمانہ اسے بنے بنائے سانچوں میں بار بار دھکیل رہا تھا۔ تعلیم' ملازمت' شادی! کیا یہی انسان کا مقدر ہے؟ کیا سب کے لئے اسی پیٹرن (Pettern) میں فٹ ہونا یا اسی پٹے ہوئے راستے سے گزرنا ضرور ہے؟ کیا وہ پچھلے چند سالوں میں بنے بنائے ڈھانچے میں فٹ نہیں ہو چکا؟ کیا پہلے ہی وہ اپنا مشن قربان نہیں کر چکا؟ کیا ادارۂ شناخت پاکستان کی ملازمت اس کے باقی ماندہ کنارے بھی رگڑ رگڑ کر ہموار نہیں کر دے گی۔

وہ انہی خیالوں میں گم تھا کہ مس شہناز اس کے کمرے میں آئی اور کہنے لگی "آپ کو ۱۱ بجے کی میٹنگ کی اطلاع مل گئی؟"

"کیوں' ۱۱ بجے کون سی میٹنگ ہے۔ پاشا صاحب اسلام آباد گئے ہوئے ہیں"

پتہ ہے آپ کو وہ اسلام آباد کیوں گئی ہیں!"

"وہ اکثر آتے جاتے رہتے ہیں- اس میں کھوج لگانے کی کیا بات ہے؟"

"جناب کھوج لگانے کی بات نہیں۔ وہ ایک نہایت اہم اور بہت ہی بڑے پروجیکٹ کے سلسلے میں اسلام آباد گئے تھے۔ وزیر اطلاعات خود میٹنگ کی صدارت کر رہے تھے۔ ابھی ابھی اسلام آباد سے پاشا صاحب کا فون آیا ہے کہ وہ جس مقصد کے لئے اسلام آباد گئے تھے۔ اس میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ وہ آج صبح کی فلائٹ سے ساڑھے دس بجے لاہور پہنچ رہے ہیں۔ وہ سیدھے دفتر آئیں گے۔ وہ اس پروجیکٹ کے بارے میں بہت Excited ہیں۔ انہوں نے پیغام بھیجا ہے کہ تمام شعبوں کے سربراہوں کو ۱۱ بجے کانفرنس روم میں بلوا لیں۔ وہ آتے ہی میٹنگ کرنا چاہتے ہیں"

"اوہ' آئی' سی۔"

"میں چوہان صاہ کو کنفرم(Confirm) کر دوں"

"ہاں' ہاں'میں ۱۱ بجے کانفرنس روم میں پہنچ جاؤں گا۔"

دفتر کی گاڑیف دس بجے ائیر پورٹ چلی گئی۔ پاشا صاحبپورے ۱۱ بجے بہترین سوٹ پہنے' پائپ پیتے ہوئ' پورچ میں اترے' مس شیلا نے بڑھ کر ان کا استقبال کیا' پاشا نے کہا

"بندوبست ہو گیا؟"

"یس سر' تمام لوگ اوپر کانفرنس روم میں آپ کا انتظار کر رہے ہیں"

پاشا نے اپنا کوٹ اتار کر مس شیلا کو تھمایا اور کہا

"میں کانفرنس میں جا رہا ہوں۔ تھوڑے دیر بعد کافی اوپر بھجوا دینا۔ سب کے لئے"

"ٹھیک ہے' سر"

پاشا نے کرسی پر بیٹھتے ہیٹائی کی ٹاٹ ڈھیلی کرتے ہوئے کہا

"جنٹلمین' سب سے پہلے میں آپ کو مبارک باد جدیتا ہوں کہ آپ لوگوں نے دن رات محنت کر کے اس فرم کو ایسی منزل تک پہنچا دیا ہے کہ اب مجھے بزنس لی نے کے

لئے کسی پی آر کی ضرورت نہیں پڑتی۔ میرے پہنچنے سے پہلے ہی 3-D's (تھری ڈیز) کی شہرت وہاں پہنچ جاتی ہے۔ یہ سب آپ کا کریڈٹ ہے Congratulations"

URDU4U .COM

سب حاضرین نے تشکر سے سر جھکا دیئے

پاشا نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا:

"جیسا کہ آپ کو معلوم ہے حکومت اپنی کامیابیوں کا جشن منانا چاہتی ہے۔ دس سالہ سنہری دور کا جشن' تاکہ اس پبلٹی کے ذریعے عوام سے وہ ایک بار پھر اعتماد کا ووٹ حاصل کر کے مزید ایک ٹرم (Term) کے لئے اقتدار میں رہ سکے۔ ہمیں اقتدار سے کوئی غرض نہیں۔ ہمیں غرض اس موقع سے فقط فائدہ اٹھانے سے ہے۔ اس کام کے لئے اسلام آباد میں وزیر اطلاعات کی صدارت میں ایک اعلیٰ سحطی کانفرنس بلائی گئی جس میں ابلاغ عامہ کے ماہرین اور ملک کی بڑی بڑی ایڈورٹائزنگ ایجنسیوں کے ایم۔ ڈی شامل ہوئے۔ وہاں یہ فیصلہ کیا گیا کہ دس سالہ کامیابیوں کی پبلٹی کا بوجھ ایک ایجنسی پر ڈالنے کی بجائے مختلف فرموں میں بانٹ دیا جائے۔ ان کی شہرت اور اہلیت کی بنیاد! ہمارے سپرد جو شعبہ کیا گیا ہے وہ زراعت یعنی ایگریکلچر ہے' اور میں نے اپنے طور پر منسٹری سے پتہ کروایا ہے۔ پبلٹی کے کل بجٹ کا ۳۵ فیصد زراعت کی پبلٹی کے لئے مقرر کیا گیا ہے کیونکہ ووٹرز کی کثرت اسی شعبے سے تعلق رکھتی ہے اور حکومت اگر اس شعبے کو اپنی کارکردگی سے متاثر کر لے تو اگلے سال انتخابات میں کامیابی کے امکانات روشن ہو سکتے ہیں۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو ہماری پبلسٹی پر حکومت کی کامیابی کا دار مدار ہے Don't you think so"

سب حاضرین نے تائید میں اپنی گردنیں جھکا دیں۔ ایک آدھ آواز آئی "آپ نے بجا فرمایا۔ بالکل درست جناب"

پاشا نے کہا۔ "او۔ کے' اگر آپ لوگ اس پروجیکٹ کی اہمیت کے بارے میں قائل ہو چکے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم کروڑوں روپے کے اس پروجیکٹ کو کامیابی سے ہینڈل نہ کر سکیں۔ کامیابی اور ہر حال میں کامیابی ہمارا ہال مارک ہے۔"

"بالکل سر' بالکل"

"او' کے' اس پروجیکٹ کو کامیاب بنانے کے لئے یوں تو فرم کے ہر شعبے کو محنت کرنا ہو گی لیکن اس کی کامیابی کا زیادہ تر انحصار ڈیزائنگ ڈیپارٹمنٹ پر ہو گا۔ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ہمارے درمیان فطرت صاحب جیسا Talented (باصلاحیت) اور Creative Thinking (تخلیقی سوچ) کا مالک آرٹسٹ موجود ہے۔ ہم اس پروجیکٹ کیل ئے ان کے علم' تخلیقی ذہن اور حساس طبیعت پر انحصار کریں گے"

"بالکل' سر' بالکل" تقریباً سب نے ایک زبان ہو کر کہا۔

"اس سارے پروجیکٹ میں ایک اہم بات ٹائم فیکٹر (Time factor) ہے۔ پروجیکٹ لانچ کرنے میں صرف ایک مہینہ باقی ہے۔ انہوں نے ہمیں نے آئیڈیا ز (Ideas) سوچنے اور ان کے رف ڈیزائن تیار کرنے کے لئے صرف دو ہفتے دیئے ہیں۔ نئے اسکیچ' نئے ڈیزائن بلکہ پورا پلبسٹی پالان ۸' اکتوبر تک پیش کرنا ہے۔ کیوں کوئی سوال! فطرت صاحب آپ؟"

فطرت: "جی اس کام کے لئے کچھ بیک گراونڈ میٹریل درکار ہو گا"

پاشا: ہاں' ہاں' میں آپ کو بتانا بھول ہی گیا کہ انہوں نے ہر فرم کو اس کے شعبے سے متعلق میٹریل فراہم کر دیا ہے۔ اگریکلچر سے متعلق سارا مواد میری گاڑی کی ڈگی میں رکھا ہے۔ میں ابھی آپ کو بھجوا دیتا ہوں"

جب لوگ مطمئن ہو گئے تو پاشا نے پوچھا'

"فطرت صاحب' آپ رہتے کہاں ہیں"

"خیابان ہوٹل میں"

کہاں یہ ہوٹل"

"میکلوڈ روڈ پر"

"اوہ' وہ تو بڑی ہنگامے کی جگہ ہے۔ آپ آئندہ دس پندرہ دن کے لئے یہاں شفت کر آئیں۔ اوپر دو بیڈ روم خالی ہیں۔ اچھے فضا اور اچھے ماحول میں نئے نئے آئیڈیا ز سکون

سے ان خیالات کو کاغذ پر منتقل کریں اور ۵' اکتوبر کو اپنے اسکیچ اور ڈیزائن وغیرہ اسی کانفرنس ہال میں سب کے سامنے پیش کریں۔ ان ڈیزائنوں پر بحث ہو گی نئی تجاویز سامنے آئیں گی اور اگلے دو روز میں آپ ان تجویزوں اور تبصروں کے مطابق ان اسکیچوں پر نظر ثانی کر کے ۷' اکتوبر تک سارا میٹر (Matter) میرے حوالے کر دیں۔ میں اسی شام اسلام آباد چلا جاؤں گا It's all settled,Isn't it? (یہ سب طے ہوا)

سب نے یک زبان ہو کر کہا:

Settled,sir Settled (طے ہوا' جناب' طے ہوا)

فطرت حکم کی تعمیل میں اپنا بچا کھچا سامان لے کر دفتر کی اوپر والی منزل میں منتقل ہو گیا اور اگلے دس دن کے لئے اپنے آپ کو اس کام میں محو کر لیا۔

پاشا صاحب بے قراری سے ۵' اکتوبر کا انتظار کرنے لگے۔

انہی دنوں گاؤں سے چٹھی آئی کہ فطرت کی دودھ شریک بہن کینسر کی مریضہ سکینہ فوت ہو گئی ہے۔ انا اللہ وانا الیہ راجعون۔ فطرت کا فوری رد عمل یہ تھا کہ وہ گاؤں جائے اور خالہ سے سکینہ کی وفات پر افسوس کرے۔ فاتحہ پڑھے اور اس کی قبر کی تازہ تازہ مٹی پر اپنے شفاف آنسو بہائے۔ اگرچہ سکینہ سے ویسے بھی اسے انس تھا لیکن جب سے ڈاکٹر سمیع نے فطرت کو اعتماد میں لے کر کہا تھا کہ اسی کینسر ہے۔ وہ اسے اور بھی عزیز ہو گئی تھی' فطرت کینسر کے سامنے اپنے آپ کو جتنا بے بس محسوس کرتا تھا اسے اتنا ہی اپنی دودھ شریک بہن پر پیار آتا تھا۔ کاش! موت کے وقت وہ اس کے پاس ہوتا۔ اس کے آخری الفاظ سنتا' اس کے جنازے کو کندھا دیتا اور اسے اپنے ہاتھوں سے لحد میں اتارتا۔

اسے خالہ پر بھی غصہ آیا کہ اس نے اسے پہلے اطلاع نہ دی۔ صرف خط لکھ بھیجا جسے پہنچتے پہنچتے تین دن لگ گئے۔ پھر بھی اس نے گاؤں جانا اور سکینہ کی قبر پر حاضری دینا ضرور سمجھا۔

وہ پاشا صاحب کے پاس گیا اور صرف ایک دن کی رخصت کی درخواست کی اور اس

کی وجہ بھی بتائی۔ پاشا جو ابھی تک فطرت کی بہت ناز برداری کرتا آ رہا تھا اپنے پروجیکٹ میں سے ایک دن بھی قربان کرنے کو تیار نہ تھا۔ اس نے ہمدردی کے دو تین رسمی الفاظ کہے اور پوچھا "کتنا کام مکمل ہو گیا"

URDU4U.COM

"سر' آپ نے ۵ اکتوبر تک کی مجھے مہلت دی ہے۔ میں وقت مقررہ پر آپ کو کام مہیا کردوں گا"

"نوہ' مسٹر فطرت' ان آٹھ دس دنوں کا ایک ایک لمحہ بہت قیمتی ہے۔"

"لیکن' سر' ادھر موت کا معاملہ ہے بہن کی موت"

"ہمارے لئے یہ پروجیکٹ بھی زندگی اور موت کا مسئلہ ہے۔ تمہاری سسٹر فوت ہو گئی' دفن ہو گئی۔ تم بعد میں رسمی تعزیت کے لئے چلے جانا اس کی وجہ سے ہمارے پروجیکٹ کو موت کے منہ میں نہ ڈالو۔

"آپ کا پروجیکٹ نہیں مرے گا پاشا صاحب"

"نوہ' مائی ڈیئر فطرت نوہ' بزنس از بزنس' ڈیوٹی از ڈیوٹی"

فطرت مایوس اور دل برداشتہ ہو کر اپنے کمرے میں آ گیا اور سوچنے لگا کہ یہ عجیب زندگی ہے جس میں پیسے کو انسانی زندگی (اور موت) پر فوقیت حاصل ہے۔ پاشا بھی عجیب شخص ہے۔ اوپر سے امیر اور مہذب' اندر سے بھوکا اور خود غرض' کیا منافقت ہے۔ اپر کلاس کے اس شخص میں۔ پھر اچانک فطرت کو اپنا خیال آیا کہ آیا وہ بھی ایک لحاظ سے منافق نہیں اوپر سے بنے بنائے ڈھانچوں کو قبول کرتا ہوا اور اندر سے ان سانچوں کے خلاف ابلتا ہوا۔ اوپر سے ہنستا مسکراتا باتیں کرتا اور اندر سے روتا' بلبلاتا اور کلبلاتا ہوا۔ کیا ہر شخص پاشا کی طرح خود میری طرح' کسی نہ کسی قسم کی منافقت کا شکار نہیں۔ اندر سے کچھ' باہر سے کچھ۔

فطرت کی یہ سوچ اس عزم پر آ کر ختم ہوئی کہ اگر وہ عملی زندگی میں اس منافقت سے چھٹکارا نہیں پا سکتا تو کم از کم اس لعنت کو اپنے فن میں داخل نہیں ہونے دے گا۔ وہ وہی پینٹ کرے گا' جو وہ خلوص دل سے محسوس کرتا ہے اور وہ وہی آواز بلند کرے

 © Urdu4U.com

گا جو اس کی ضمیر سے اٹھتی ہے۔ انشاء اللہ!

فطرت نے وقت مقررہ کے اندر اندر شعبہ زراعت میں دس سالہ ترقی کے بارے میں ضروری اسکیچ تیار کر لئے اور ۵ اکتوبر کی صبح کو پاشا صاحب کی صدارت میں کانفرنس کے سامنے پیش کر دیئے:

پہلا اسکیچ

ایک کسان کی محنت پر مبنی تھا۔ اس میں یہ منظر دکھایا گیا تھا کہ ایک کسان کمزور سے بیلوں کی ایک جوڑی کے ساتھ ہل چلا رہا ہے۔ اس نے کھیت کا خاصا حصہ کاشت کر لیا ہے اوپر سورج پوری آب و تاب سے چمک رہا ہے اور اس کی کرنیں' کسان کی ننگی پیٹھ پر نیزے کی طرح برس رہی ہیں اور پسینے سے شرابور کسان کا چابک بیلوں کوڑوں کی طرح برس رہا ہے کسنا کے چہرے کی جھریاں' بیل کی پسلیاں اور ہل چلے کھیت کے ابھرے ابھرے بل' تینوں ایک ان کہے رشتے میں منسلک ہیں۔

(یہ اسکیچ دیکھ کر پاشا کے چہرے پر بیزاری کے آثار نمودار ہوئے)

دوسرا اسکیچ

لائیو سٹاک یا حیوانات کے بارے میں تھا۔ دریا کے کنارے ایک وسیع اور سر سبز چراگاہ میں گائیں' بھینسیں' بیل' بھیڑ' بکریاں چر رہی ہیں۔ ان مویشیوں کے جسم فربہ اور ٹانگیں توانا ہیں۔ کچھ جانور ٹھنڈی چھاؤں میں بیٹھے استراحت کے ساتھ جگالی کر رہے ہیں۔

(پاشا کے چہرے پر بیزاری کے تاثرات شدید ہو گئے)

تیسرا اسکیچ

ایک دیہاتی کھلواڑے کا منظر۔ فصل پک کر تیار ہو گئی ہے اسے کسان اپنے اہل خاندان سمیت کاٹ کر کھلواڑے میں لے آیا ہے۔ بھوسہ اور دانے الگ الگ کر دیئے گئے ہیں ایک طرفب ھوسے کا اونچا ڈھیر ہے اور دوسری طرف گندم کے دانوں خا چمکتا تو وہ۔ زمیندار گھوڑے پر سوار ہو کر آتا ہے۔ کسان کو اس کی مزدوری ادا کرتا ہے

اور باقی ساری زندگی گندم اور بھوسہ اٹھوا کر لے جاتا ہے۔ اس مرحلے پر پاشا کے ضبط کے بند ٹوٹ گئے اور اس نے چلا کر کہا:

URDU4U.COM

"شاپ دس نان سینس (یہ بکواس بند کرو)"

فطرت نے باقی اسکیچ روک لئے

پاشا نے غصے سے کہا:

"تم کیا دکھانے کی کوشش کر رہے ہو' تم کیموزم پھیلا رہے ہوClass Confilict(طبقاتی کشمکش) دکھا رہے ہو۔ کسان اور زمیندار کی کشمکش' تمہیں اس بات کا اندازہ نہیں کہ موجودہ حکومت اپنی کمیونسٹ ہے اس کا رجحان رائٹ کی طرف ہے۔ اس کے باوجود تم نے پہلے اسکیچ میں کاشتکار کی پسلیاں' بیل کی جھریاں یہ سب کچھ کیا ہے۔ یہ کیا بکواس ہے"

فطرت نے اپنے تخیل کا دفاع کرتے ہوئے کہا

"یہ اسکیچ انسانی محنت کی عکاسی کرتا ہے۔ اور میرے خیال میں انسان کی ذات اور محنت کے بغیر ترقی کا تصور ناممکن ہے۔"

پاشا: تم بھول گئے ہو فطرت کہ یہ دس سال ترقی کے سنہری دور کا جشن ہے تم نے ترقی دکھانی ہے۔ خوشحالی دکھانی ہے۔ Prosperity

فطرت: اسکیچ نمبر دو میں دیکھئے سارے مویشی خوشحال ہیں۔ گائیں' بھینسیں بھیڑیں' بکریاں.....

پاشا: (مزید غصے سے) گورنمنٹ مویشیوں کی خوشحالی میں نہیں انسانوں کی خوشحالی میں دلچسپی رکھتی ہے۔ اسے پروجیکٹ کرنا چاہتی ہے...

فطرت: مجھے تو انسانوں کی خوشحالی کہیں نظر نہیں آئی' سوائے چند لوگوں کے....

پاشا: "That is not your problem (یہ تمہارا مسئلہ نہیں ہے) کہ کون خوشحال ہے اور کون خوشحال نہیں ہے۔ پبلسٹی مین کے طور پر آپ نے وہی کرنا ہے وج آپ کو کرنے کے لئے کہا گیا ہے۔ تم اپنے اشتراکی یا مارکسی نظریات کو اپنے اندر بند رکھو"

فطرت: میں مارکسی خیالات پر لعنت بھیجتا ہوں۔ میں اس الزام کی سخت ترین الفاظ میں تردید کرتا ہوں۔ میں انسانی محنت اور سماجی عدل کو پروجیکٹ کرنا اسلام کے عین مطابق سمجھتا ہوں۔

URDU4U.COM

پاشا: سوال یہ نہیں کہ تم کیا سمجھتے ہو۔ سوال یہ ہے کہ تمہیں جو کچھ کہا گیا ہے اس کے مطابق کرو۔

فطرت: میں مشین نہیں ہوں پاشا صاحب میں انسان ہوں' آرٹسٹ ہوں۔ میرے بھی کچھ جذبات ہیں۔ احساسات ہیں' آرٹسٹ اپنے مشاہدے اور اپنے احساسات کے زور پر ہی تخلیق کرتا ہے

پاشا: آرٹ پر لیکچر سننے کے لئے میرے پاس وقت نہیں ہے۔ مجھے ایسے آرٹسٹ کی ضرورت نہیں ہے جو میرے حکم کی تعمیل کرنے کی بجائے اپنے محسوسات کو بیچ میں لے آئے مسٹر فطرت میں نے تمہیں گٹر سے اٹھا کر گلبرگ میں جگہ دی کیونکہ میں سمجھتا تھا کہ تم ذہین ہو۔ تخلیقی ذہن کے مالک ہو۔ مجھے نہیں پتہ تھا کہ تم اتنے Naiveاور Stupid (احمق) نکلو گے۔ تم نے...

فطرت: مسٹر پاشا' اپنی زبان سنبھالئے جاب آر نو جاب (ملازمت رہے یا نہ رہے) میں یہ گالیاں سننے کے لئے یہاں نہیں آیا

پاشا: (سختی سے) تم میں دو لفظ سہنے کی سکت نہیں۔ تم جانتے ہو کہ تم نے میرے کروڑوں روپے کے پروجیکٹ پر پانی پھیر دیا ہے۔ فرم کی شہرت کو تباہ کر دیا ہے۔ میں آٹھ تاریخ کو اسلام آباد والوں کو کیا دکھاؤں گا۔ اتنے بڑے نقصان پر تم اتنے چھوٹے افلاظ بھی برداشت کرنے کو

فطرت: میری عزت نفس کے لئے گالی کے دو لفظ آپ کے کروڑوں روپوں سے بھاری ہیں۔ مسٹر پاشا۔Keep your job. Here I go
(رکھئے نوکری اپنے پاس' میں جا رہا ہوں)

یہ کہہ کر فطرت کانفرنس روم سے نکل آیا۔ باقی شرکاء حیرت اور خوف کے ملے جلے

جذبات کی گرفت میں اپنی اپنی کرسیوں پر چپ چاپ بیٹھے رہے اور برآمدے تک پاشا کے یہ الفاظ فطرت کا تعاقب کرتے رہے Stupid , Idiot(احمق بیوقوف)۔ فطرت کا

URDU4U .COM

3-D's میں یہ آخری دن تھا۔

فطرت نے سوچا کہ گلبرگ والی نوکری پروفیسر سعید صاحب کی مہربانی سے اسے ملی تھی قبل اس کے کہ پاشا پروفیسر صاحب سے گلہ کرے کیوں نہ وہ خود اپنی صفائی سعید صاحب کے سامنے پیش کر دے' وہ آخر وہ اس کے استاد رہے ہیں' دوستی کا رشتہ بھی جتاتے ہیں اور ہمدردی سے پیش آتے ہیں' ان کے سامنے تو اس "بدتمیزی" کی وضاحت ضروری ہے۔

فطرت ایک شام پروفیسر سعید کے ہاں پہنچ گیا اور سارا واقعہ الف سے ے تک کہہ سنایا' پروفیسر سعید نے کہا

"میرے لئے تم دونوں میں سے کسی ایک کو قصور ٹھہرانا مشکل ہے' دونوں اپنی اپنی جگہ درست تھے"

"لیکن سر' ساری لڑائی تو اس نکتے پر ہوئی کہ پاشا صاحب کہتے تھے اس میں گورنمنٹ ڈالو' گورنمنٹ کی کارگردگی دکھاؤ' زراعت کی جدید مشینیں دکھاؤ' میرا موقف یہ تھا کہ انسانی محنت کے بغیر انسانی ترقی کا تصور ناممکن ہے۔ آپ کسان کو منہا کر کے زرعی ترقی کیسے دکھا سکتے ہیں۔ وہ اصرار کرتے ہیں گورنمنٹ' گورنمنٹ"

"دیکھو فطرت' بات سیدھی سی ہے اسے کروڑوں روپے کسان نے نہیں گورنمنٹ نے دینے ہیں جس طرح تمہارا کومٹ منٹ آرٹ اور انسان سے ہے' اسی طرح اس کومٹ منٹ روپے سے ہے' وہ وہ کروڑوں کے چکر میں تھا تم سینکڑوں کے چکر میں۔ بڑی مچھلی غالب آ گئی۔ چھوٹی مچھلی جوہڑ سے بھاگ گئی۔ خیر' چھوڑو ان باتوں کو' بتاؤ اب کیا ارادے ہیں؟"

"سر' اب میں فیصل آباد جا رہا ہوں' گھنٹہ گھر کے سامنے کھڑی ہو کر پکوڑے بیچوں گا"

"تم وہ بھی نہیں کر سکو گے"

"گنڈیریاں بیچوں گا"

"تمہارے لئے یہ بھی ناممکن ہو گا"

"اخبار بیچوں گا"

"ناممکن"

"کیوں"

"اس لئے کہ وہاں کئی پاشے بھیڑوں کی طرح تمہارے گرد ہو جائیں گے اور کہیں گے دیکھو ایم اے پاس لڑکا پنجاب میں ٹاپ کرنے والا گنڈیاں بیچ رہا ہے۔ پکوڑے بیچ رہا ہے' اخبار بیچ رہا ہے"

URDU4U.COM

"تو کیا؟ انہیں کہنے دیجئے' آواز سگاں سے رزق گدا پر کیا اثر پڑتا ہے"

"پڑتا ہے فطرت میاں' اب کتے عرفی کے وقت کے نہیں جو صرف بھونکتے تھے۔ اب وہ کانٹے بھی ہیں' پاشا کی کاٹ دیکھی نہیں تم نے"

"تو فیصل آباد والے کیا کرلیں گے میرا"

"بھونک بھونک کر' کاٹ کاٹ کر تجھے باؤلا بنا دیں گے' تمہیں پاگل کر دیں گے' وہ تمہیں مینٹل ہاسٹل پہنچا دیں گے"

"اس سے بہتر سکون کی جگہ اور کیا ہو گی"

"مذاق چھوڑو' فطرت' کام کی بات کرو"

"کام کی بات کیا کروں' سر' معلوم ہوتا ہے کہ جو کچھ میں کرنا چاہتا ہوں وہ مجھے معاشرہ کرنے نہیں دی گا اور معاشرہ مجھ سے کروانا چاہتا ہے وہ میں کرنے کو تیار نہیں ہوں"

"بالکل' اصل المیہ یہی ہے"

"اس کا حل؟"

"وہی جو پہلے بتا چکا ہوں Compromise (سمجھوتہ) مجھے دیکھو جب سے سمجھوتہ کیا ہے

بڑے سکون میں ہوں' بال بچوں کے ساتھ کوٹھی میں رہتا ہوں صبح نوکری کرتا ہوں شام کو آرام کرتا ہوں۔ میری مانو تو اندر کے کپڑے کو مسل ڈالو' اسے دفن کر دو۔ جب تک اندر بتی جلتی رہے گی کھلبلی مچی رہے گی' آرام اور سکون چاہتے ہو تو اس بتی کو گل کر دو ورنہ عمر سر دار لٹکے رہو گے"

فطرت گہری سوچ میں ڈوب گیا

پروفیسر سعید نے کہا "زیادہ مت سوچو' سوچنا ہی خرابی کی جڑ ہے۔ میری مانو' تو کچھ عرصے کے لئے گاؤں چلے جاؤ کھلے کھیتوں میں پھرو' رہٹ کے راگ سنو' فصلوں کا سونا دیکھو' کوئل کی کوکو سنو۔ اندر ایک ٹھہراؤ آ جائے گا تم اپنے اندر ایک بیلنس محسوس کرو گے۔"

جب پروفیسر سعید یہ باتیں کر رہا تھا تو فطرت کا ذہن اپنے گاؤں میں گشت کر رہا تھا جہاں کوئلیں کوکتی تھی نہ سنہری فصلیں لہلہاتی تھیں' بلکہ وہاں بھوک تھی جہالت تھی طعنوں کے بچھو تھے' بے بنیاد الزامات کے لمبے لمبے سانپ تھے۔

"فطرت! کہاں کھو گئے؟"

"ادھر ہی ہوں' سر' آپ کے پاس"

"دیکھو' پریشان ہونے کی بات نہیں روزی رساں اللہ ہے اور ہاں چند روز پہلے ادارۂ شناخت پاکستان کی طرف سے ایک اشتہار نکلا تھا اخبارات میں"

"ہاں' سر' دیکھا تھا اپلائی کرنے کا سوچا لیکن پھر ارادہ ترک کر دیا"

"کیوں؟"

"مجھے اس طرح کے ادارے لینڈ رولر لگتے ہیں۔ سڑکوں پر روڑی کوٹنے والی بھاری انجن' جو اٹھی ہوئی بجری کو سختی سے دبا کر زمین کے ساتھ ملا دیتے ہیں' انہیں اپنی جگہ سے اٹھا ہوا کنکر' اپنے مقام سے ہٹا ہوا پتھر' روایتی سانچوں سے اکھڑا ہوا انسان ایک آنکھ نہیں بھاتا' وہ اسے سختی سے کرش (Cruch) کر دیتے ہیں۔ میں کرش ہونا نہیں چاہتا' میں ریزہ ریزہ ہو کر پیوند خاک بننا نہیں چاہتا' میں Create کرنا چاہتا ہوں' میں زندگی

میں کچھ Achieve کرنا چاہتا ہوں۔"

"دیکھو فطرت' پھر تم پر تخلیقی پاگل پن کا دورہ پڑا ہے تم کب تک دنیا کے ساتھ لڑتے رہو گے۔ تیس برس کے ہونے والی ہو' کہیں Settle ہو جاؤ مستقل نوکری کرو' شادی کرو' گھر بساؤ' آرام سے رہو"

"یہ کیوں نہیں کہتے کہ خودکشی کر لو"

"یہ خودکشی نہیں رسم زمانہ ہے"

"میں سمجھتا ہوں کہ ایک تخلیقی آرٹسٹ کی لئے رسم زمانہ کے ساتھ مدغم ہو جانا اس کی موت ہے' اس کے بعد بھی اگر وہ زندہ رہتا ہے تو ایک زندہ لاش کی طرح جس پر چیلیں جھپٹتی رہتی ہیں' اس کا ماس نوچتی رہتی ہیں اور وہ انہیں اڑانے کی بھی سکت نہیں رکھتا"

"فطرت! پاشا صاحب کے ساتھ تصادم کی وجہ سے تم خاصے Excited ہو میری مانو تو ادارۂ شناخت پاکستان میں نوکری کے لئے درخواست دے دو اور گاؤں چلے جاؤ۔ شہر کے پاگل پن سے دور چلے جاؤ۔ جب نوکری کا بلاوہ آئے گا تو فیصلہ کر لینا۔ فی الحال درخواست دے دو"

"ٹھیک ہے' سر"

فطرت نئی نوکری کے لئے درخواست بھیج کر گاؤں چلا گیا۔

زبیدہ فطرت کے لئے بیری پر لگا ہوا وہ بیر تھا جس کے رنگ و روپ کو دیکھ کر اس کے ذائقے کے متعلق وثوق سی کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ کئی بیر دیکھنے مین ہرے اور کچے لگتے ہیں مگر ذائقے میں شریں ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس بعض دیکھنے میں بہت دلکش مگر چکھنے میں بدمزہ ہوتے ہیں۔ پتہ نہیں فطرت کے لئے زبیدہ کیسا بیر ثابت ہو گی۔

فطرت نے زبیدہ کو کئی مرتبہ پہلے بھی دیکھا تھا۔ وہ جسمانی لحاظ سے گاؤں کی دوسری لڑکیوں کی طرح صحت مند تھی۔ بلکہ اپنے گندمی رنگ' بے داغ چہرے اور صاف ستھرے

 © Urdu4U.com

کپڑوں کی وجہ سے ان میں خاصی ممتاز اور جاذب نظر لگتی تھی۔ البتہ نسوانی اداؤں سے وہ بالکل عاری تھی۔ یہ لچھن اسے آتے بھی کیسے۔ دیہاتی لڑکیاں تو گائے بھینسوں کی طرح اپنے والدین کی کھرلی پر بندھی پلتی رہتی ہیں اور پھر ایک وقت آتا ہے جب انہیں زنجیر سمیت کسی اجنبی کے ہاتھ پکڑا دیا جاتا ہے ۔ وہ جب تک والدین کے گھر میں رہتی ہیں اپنے ہونے والے گھر کے خواب دیکھتی رہتی ہیں اور جب شادی کے بعد نیا گھر خوابوں پر پورا نہیں اترتا تو پیچھے مڑ مڑ کر اپنے بابل کے گھر کو یاد کرتی رہتی ہیں۔

زبیدہ ابھی خواب اور حقیقت کے اسی دوراہے پر کھڑی تھی وہ باپ کا گھر چھوڑ چکی تھی لیکن ابھی اپنے گھر میں آباد نہیں ہوئی تھی۔ اس کا نکاح ہو چکا تھا لیکن وہ ابھی بیاہی نہیں گئی تھی۔ وہ اپنی جگہ دھندلکے میں محصور تھی اور فطرت اپنی جگہ!

فطرت کو خود معلوم نہ تھا کہ اس کی دلہن نے کہاں تک تعلیم پائی ہے۔ اس نے اک دفعہ سنا تھا کہ وہ نویں جماعت میں پڑھتی ہے پھر چند سال پہلے کسی رشتہ دار کی زبانی معلوم ہوا تھا کہ وہ میٹرک میں فیل ہو گئی ہے اور اس کی ماں نے یہ کہہ کر اسے گھر بٹھا دیا ہے کہ ”ہم نے کونسا اسے نوکر کروانا ہے کہ دسویں سند کے لئے ایک سال پھر سکول بھیجتے ہیں۔ اچھا ہے گھر پر رہے گی۔ معذور باپ کی خدمت کرے گی۔ ماں کا ہاتھ بٹائے گی سینا پرونا سیکھے گی اور کیا چاہئے اسے“

جتنا عرصہ زبیدہ اپنے باپ کے گھر میں بیٹھی رہی۔ اس کے ہمجولیاں سہاگ کی مہندی سجا کر اپنے اپنے پی کے نگر روانہ ہوتی رہیں۔ کچھ تو پڑوس کے گاؤں میں ہی جذب ہو گئیں اور کچھ شہروں میں نوکری کرنے والی خاوندوں کی پاس چلی گئیں۔ وہ جب بھی میکے آتیں اپنے شوہروں کے رعب داب اور شہر کی عیش و عشرت کے قصے سناتیں۔

مثلاً بلقیس آئی تو اس نے کہا:

”ہم تو ہفتے میں دو دو مرتبہ فلم دیکھتے ہیں۔ ثریا‘ آشا پوسلے‘ مسرت نذیر‘ محمد علی‘ سدھیر‘

ندیم کی فلمیں۔ خوب مزہ آتا ہے ان فلموں میں ناچ گانا ہوتا ہے۔ ہلہ گلہ ہوتا ہے۔ جب فلم ٹوٹتی ہے تو بوتلیں پیتے ہیں۔ ٹھنڈی ٹھار' برف میں لگی ہوئی۔ جب گھر کھانا پکانے کو جی نہیں چاہتا تو وہ ہوٹل سے نان کباب یا پکی پکائی مرغی لے آتے ہیں"

URDU4U.COM

اسی طرح نورجہاں واپس آئی تو کہنے لگی

"بیدی' تجھی تو کچھ پتہ ہی نہیں کہ شہر میں کیا ہوتا ہے ایمان سے بڑے مزے ہیں۔ سیر سپاٹا کرو' شالیمار' مقبرہ جہانگیر' باغ جناح یا لاہور قلعہ جاؤ دریائے راوی میں کشتی پر سیر کرو۔ ساتھ ریڈیو پر فلمی گانے سنو' واپسی پر کلفی' آئس کریم یا گول گپے کھاؤ"

کچھ عرصہ پہلے جب زبیدہ نے اڑتی اڑتی یہ خبر سنی تھی کہ اس کی شادی فطرت سے ہونے والی ہے اور وہ لاہور میں بہت بڑا افسر ہے تو اس کے دل میں خوشی کے لڈو پھوٹنے لگے' عیش و عشرت کے کئی روپ اس کی آنکھوں کے سامنے ناچنے لگے۔

زبیدہ کا نکاح ایسے حالات میں ہوا کہ وہ کسی سے کچھ نہ کہہ سکتی تھی لیکن جب فطرت اپنی والدہ کو دفنا کر واپس چلا گیا تو زبیدہ نے کئی دفعہ اپنی ماں سے کہا کہ وہ دلہن بننے اور ڈولی میں بیٹھنے کا ارماں ضرور پورا کرے گی اور اس کی ماں کی خوشیاں پوری کرنے کا ہر دفعہ وعدہ کر لیتی تھی۔

فطرت لاہور سے واپس آیا تو اس کی خالہ (اور ساس) نے اسے اس بات پر راضی کر لیا کہ شادی کی رسومات ادا کرنا ضروری ہیں ورنہ لوگ طرح طرح کی باتیں بنائیں گے۔ چنانچہ "شادی" کی تاریخ طے کی گئی۔ دلہن کے لئے نئے کپڑے سلوائے گئے۔

ریشماں اور اس کی بہن کی ملی بھگت سے جو چھوٹا موٹا زیور بنوایا گیا تھا اسے دھلوایا گیا۔ ڈھول اور باجہ منگوایا گیا۔ زبیدہ کو دلہن بنایا گیا اور ڈولی میں ڈال کر اسے گاؤں کے چاروں طرف پھیرے لگوانے کے بعد بڑی دھوم دھام سے فطرت کی ڈیوڑھی میں اتار دیا گیا۔

سہاگ رات کو زبیدہ اور فطرت کے پلنگ ایک کمرے میں سجا دیئے گئے اور زبیدہ کی

ماں دوسرے کمرے میں لیٹ گئی۔ جب آدھی رات کو مہمان چلے گئے اور فطرت کمرہ عروسی میں داخل ہوا تو زبیدہ سرخ جوڑے میں لپٹی ہوئی پہلو کے بل پلنگ پر لیٹی ہوئی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ وہ انتظار کر کے سو گئی ہے لیکن فطرت کے قدموں کی چاپ سے سرخ عروسی جوڑے نے ہلکی سی جھرجھری لی جس نے فطرت کو اندازہ ہوا کہ وہ دراصل سوئی نہیں بلکہ انتظار کر رہی ہے۔

فطرت آ کر پائنے پلنگ پر لیٹ گیا۔ زبیدہ بے حس اپنے پلنگ پر پڑی رہی۔ فطرت خیالات کی کئی وادیوں میں گھومتا رہا۔ اسے لمحے کو اپنی کلاس فیلو زبیدہ (عرف زوبی) یاد آئی جو جارحانہ طور پر اظہار محبت کرتی تھی اور ایک یہ زبیدہ تھی جو زندہ لاش کی طرح پلنگ پر پڑی تھی۔ پھر اسے مس نزہت سے ملاقات' اس کا ویران حسن اور اس کے ساتھ اپنا موہوم تعلق یاد آیا۔ پھر ٹی ہاؤس میں فیصل اور فاروق کا وہ طعنہ یاد آیا کہ "یار چپکے چپکے ہنی مون پر نہ چلے جانا۔ مٹھائی کھلا کر جانا"

تھوڑی دیر کے بعد فطرت کے اندر آرٹسٹ اور فلاسفر جاگا اور سوچنے لگا کہ کیا سب مردوں کی طرح اس کا بھی یہی انجام ہونا تھا۔ نکاح' شادی' اختلاط' بچے! کہاں گئی میری Non-conformism کدھر گئے میرے عزائم۔ کیا پورا معاشرہ مجھے بنے بنائے سانچوں میں ڈھالنے کا تہیہ کر چکا ہے۔ کیا میری ماں بھی میرے خلاف اس سازش میں شریک تھی۔ اس نے سوچ میں تو کیٹس' بائرن' سی زین اور وان گوف بننے کے خواب دیکھتا تھا۔ میں نے تو اپنی غیر فانی تخلیق کے سہارے زندہ رہنے کا عزم کیا تھا۔ وہ سب خاک میں مل گئے۔ کیا وہ دوسرے انسانوں کی طرہ دلدل میں پھنس کر رہ جائے گا اور اس کے تخلیقی خواب ہمیشہ تشنہ تعبیر رہیں گے؟

انہی خیالوں میں رات کا بقیہ حصہ بھی ختم ہو گیا۔

صبح وہ کمرے سے نکلا تو اس کی خالہ نے کہا "پتر وہاں الماری کے اوپر صابن رکھا ہے۔ ٹیوب ویل پر نہا آ' میں تب تک ناشتہ بناتی ہوں تیرے لئے "فطرت تعمیل حکم کے طور

پر صابن اور تولیہ لے کر ٹیوب ویل پر چلا گیا۔
فطرت تین راتیں اسی کشمکش میں رہا بالا آخر جبلی تقاضے اس پر غالب آ گئے اور وہ ایک اور محاذ پر بنے بنائے سانچے میں ڈھل گیا۔

URDU4U.COM

فطرت کا گاؤں میں یہ طویل ترین قیام تھا۔ اس قیام کے دوران اس کا اسٹائل خاص بدل گیا تھا۔ اب وہ ہر وقت امریکن ساخت کی پتلون کے رہنے کی بجائے شلوار یا تہبند کرتہ پہننے لگا تھا۔ اس نے سر اور مونچھوں کے بال بھی خاصے ترشوا لئے تھے۔ وہ اب گم سم اور الگ تھلگ رہنے کی بجائے آنے جانے والون کو سلام بھی کر لیتا تھا اور دوسروں کی خوشی و غمی میں شریک بھی ہونے لگا تھا۔ ایک دفعہ نمبر دار نے گاؤں کے کسی مشترکہ مسئلے کے لئے معززین کو مسجد میں بلوایا تو فطرت بھی خالہ کے سفید دوپٹے کی پگڑی باندھ کر معززین میں شامل ہو گیا۔ بظاہر معلوم ہوتا تھا کہ اس کے دماغ کا کیڑا مر چکا ہے اور وہ اب راہ راست پر چکا ہے۔
گاؤں میں جن لوگوں کے گھر فطرت کا آنا جانا تھا میں اس کے پرانے دوست اور سکول کے کلاس فیلو شاہد کا گھر بھی شامل تھا۔ شاہد میٹرک پاس کرنے کے بعد ایسٹ پاکستان رائفلز میں بھرتی ہو کر بنگال چلا گیا تھا جلد ہی اس کی شادی ہو گئی تھی اور وہ اپنے پہلے بچے (جاوید) کی پیدائش پر ڈھاکہ سے خاص طور پر چھٹی لے کر آیا تھا۔ اس نے بیٹے کی پیدائش پر سارے گاؤں مین مٹھائی بانٹے تھی اور چھٹی ختم ہونے پر جاوید کو بہت سا پیار کر کے واپس ڈیوٹی پر چلا گیا تھا۔
تھوڑے ہی عرصے بعد کسی سرحدی جھڑپ میں شاہد پہلے زخمی اور پھر شہید ہو گیا۔ اس کی میت دشمن اٹھا کر لے گئے۔ گھر والوں کو صرف اتنی اطلاع پہنچی کہ شاہد دفاع وطن کے لئے بہادری سے لڑتا ہوا شہیدہو گیا ہے۔ اس اطلاع کے چند روز بعد اس کے واجبات بھی منی آرڈر کے ذریعے شاہد کی بیوہ حمید کو بھیج دیۓ گئے۔
فطرت اکثر اپنے مرحوم دوست کی نشانی جاوید کو دیکھنے چلا جاتا تھا جو اب میٹرک کا امتحان

دے کر نتیجے کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ کبھی کبھی حمیدہ کے پاس بیٹھ کر اس کے دکھ سکھ بھی سن لیتا اور جب وہ خاموش ہو جاتی تو فطرت شاہد کے بچپن کی باتیں سنانے لگتا تھا فطرت یہ سماجی فرض ادا کر کے ایک روحانی راحت محسوس ہوتی تھی۔

URDU4U.COM

انہی دنوں جاوید کسی کام سے فیصل آباد گیا۔ واپسی پر سڑک کے موڑ پر بس سی اترا تو پیچھے سے آنے والا ٹرک اسے کچلتا ہوا گزر گیا۔ ٹرک والا بھاگ گیا۔ گاؤں میں اس جوان اور یتیم لڑکے کی موت پر کہرام مچ گیا۔ حمیدہ صدمے سے بار بار بے ہوش ہو جاتی تھی۔ اسے سنبھالا دینے میں گاؤں کی عورتیں پیش پیش تھیں۔ فطرت بھی اس موقع پر موجود تھا۔

جواں سال جاوید کی موت کے فوراً بعد فطرت تقریباً ہر روز اپنے مرحوم دوست کے گھر جاتا' پندرہ بیس منٹ بیٹھتا بہن حمیدہ کے دکھ بانٹتا۔ اسے تسلی دیتا اور رضائے الٰہی کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کی تلقین کرتا۔ اگرچہ وہ اسے تسلی دے آتا تھا لیکن خود نظام قدرت پر حیران تھا کہ پہلے شاہد شہید ہو گیا اور جب اس کی بیوہ کی طویل محنت اور صبر کے بعد جاوید جوان ہوا تو ٹرک کے نیچے آ کر کچلا گیا۔ لیکن شرفو جیسے لوگ ابھی تک ٹھیک ٹھاک دندناتے پھرتے تھے۔

گاؤں والوں کے رنگ بھی نیارے ہوتے ہیں۔ لمحہ بھر میں رتی اور لمحہ بھر میں ماشہ۔ فطرت کا باپ صاحب حیثیت تھا تو چوہدری کرم دین تھا اور جب اس کی مالی حالت خراب ہو گئی تو سب اسے کرموں لائن مین کہنے لگے۔ جب تک وہ زندہ رہا تو غریبی اور امیری دونون حالتوں میں کچھ نہ کچھ اس کا دید لحاظ رہا۔ جب وہ فوت ہو گیا تو فطرت' ذکیہ اور ریشماں پر عرصہ حیات تنگ کر دیا گیا۔ پندرہ سال کی محنت و مشقت کے بعد جب فطرت جوان ہو کر اپنے آبائی گھر لوٹا تو گاؤں والوں نے اسے آنکھوں پر بٹھایا۔ وہ امریکہ سی پلٹا تو مستقبل کی توقعات کے گرویدہ لوگوں نے تعریفیں کر کے اسے

آسمان پر چڑھا دیا۔ بعد میں جب بھی وہ لاہور سے دو چار دنون کے لئے گاؤں آتا تو مرد اور عورتیں اسے طویل قیاسم کی دعوت دیتے اور اکثر کہتے "پتر کبھی لمبی چھٹی لے کر آ۔ گاؤں میں رہ، چاچا، تایا، ماسی، پھوپھی، بہن، بھائی سے مل، تجھے بھی کچھ پتہ چلے کہ گاؤں والے تجھ سے کتنی محبت کرتے ہیں۔" لیکن اب جب اسے گاؤں میں نسبتاً طویل قیام کرنا پڑ گیا تھا تو لوگ پھرچہ میگوئیاں کرنے لگے تھے۔ طرح طرح کے الزام لگانے لگے تھے انہونی باتیں کہنے لگے تھے۔ چند ایک باتیں جو فطرت کے سننے میں آئیں تھیں:

"گاؤں اور گاؤں والون سے کیا دلچپی، اسے تو اس زبیدہ کا چکا پڑ گیا ہے۔ جو ریشماں پر فالج گرتے ہی خود بھاگ کر اس کے گھر چلی آئی تھی" "زبیدہ تو پرانی ہو گئی۔ اس لفنگے کی نظریں تو حمیدہ پر ہیں حمیدہ پر۔ اس کے گھر میں نہ خاوند ہے نہ بیٹا۔ وہاں صبح صبح کیا لینے جاتا ہے۔ بڑا شریف زادہ ضرور دال میں کچھ کالا ہے۔"

"ارے، پڑھائی کا بھی چرک ہی ہے۔ سنا ہے کہ اس کی ساری سندیں جعلی ہیں۔ کوئی ایم۔ اے۔ ویم۔ اے پاس نہیں۔ امریکہ والا بھی ڈھکوسلہ ہی تھا، اتنا پڑھا لکھا ہوتا تو یوں گھر میں بیکار بیٹھا رہتا۔ آج کہیں افسر نہ لگا ہوتا۔ بہت بڑا افسر!"

"سنا ہے کچھ دنوں کے لئے لاہو رمیں ایک نوکری لگی تھی اس کی۔ بھوکے خاندان کا بھوکا شخص تھا۔ غبن کر گیا سارا مال، یہ شادی، یہ موٹر سائیکل، یہ کپڑے لتے، یہ سب کچھ ایس ال سے تو ہوا ہے۔ ورنہ انہیں تو گھر کے دانے نہیں آتے تھے کھانے کو، اب کتنے عرصے سے بیوی اور اس کے گوڈے کے ساتھ لگا بیٹھا ہے۔ گاؤں کی لڑکیون کو تاڑتا رہتا ہے۔ کئی گھنٹے نہانے کے بہانے ٹیوب ویل پر کھڑا عورتوں کو دیکھتا رہتا ہے۔ بدمعاش کہیں کا، لچا لفنگا"

"اب تو اسے کہیں نوکری نہیں ملے گی۔ فضل دین کے بیٹے اشرف نے فوج سے ایک کمبل چوری کیا تھا انہوں نے بارہ پتھر کر کے گھر بھیج دیا تھا۔ آج تک بیکار بیٹھا ہے۔

سو درخواستیں دے چکا ہے کوئی نوکری نہیں دیتا اسے' اب بکریاں چراتا پھرتا ہے۔ سارا دن! یہی حال ہو گا اس کا بھی' آیا بڑا پڑھا لکھا۔ شریف زادہ!"

URDU4U.COM

یہ باتیں سن سن کر فطرت کے کان پک گئے تھے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ کدھر جائے۔

ایک دن وہ دوپہر کے وقت اپنے گھر میں لیٹا سوچ رہا تھا کہ وہ پچھلے ۲۹ سال سے زمانے کے تھپیڑے سہہ رہا ہے۔ اسے نہ شہر میں سکون ملتا ہے نہ گاؤں میں پناہ میسر آتی ہے۔ وہ شہر سے ٹھوکریں کھا کر گاؤں میں آتا ہے تو گاؤں اسے بچھوں کی طرح کاٹنے لگتا ہے وہ گاؤں سے بھاگ کر شہر جاتا ہے تو شہر اسے ڈسنے لگتا ہے۔ اس کی حالت تو جولاہے کی پھرکی کی طرح ہے جو ضربیں کھا کر دائیں سے بائیں اور بائیں سے دائی شٹل (Shuttle) (پھرتی) کرتی رہتی ہے شائد اس کی حالت تو شٹل سے بھی بدتر ہے کیونکہ شٹل کے ٹھوکریں کھانے سے کپڑا تو بنا جاتا ہے۔ اس نے پچیس تیس سالوں میں ایک گز کپڑا بھی نہیں بنا۔ وہ تو جولاہے اور اس کی شٹل سے بھی بیکار نکلا۔

وہ انہی سوچوں میں گم گھا کہ اس کی خالہ نے جو باورچی خانہ میں مصروف تھی اسے ایک سرکاری لفافہ تھمایا۔ کھولا تو اس میں ادارۂ شناخت پاکستان کی طرف سے انٹرویو کے لئے کال تھی فطرت اس لفافے کو اپنی چھاتی پر رکھ کر سوچنے گا کہ وہ اس کا کیا کرے۔ اگر وہ گاؤں مستقل رہ سکتا تو شائد وہ کبھی شہر کا رخ نہ کرتا لیکن گاؤں میں رہنے کا مطلب طعنوں کے بچھوؤں میں رہنا تھا۔ غربت اور افلاس میں رہنا تھا اور سب سے بڑھ کر یہ پینٹنگ کے مشن سے ہمیشہ کے لئے دستبردار ہونا تھا؟ کیا وہ اس مشن سی دستبردار ہو سکتا ہے؟

وہ اس نکتے پر خاصی دیر غور کرتا رہا۔ فیصلہ کبھی حق میں اور کبھی مخالفت میں جاتا رہا۔ اگر آرٹ اس کے لئے محض ایک ذریعہ معاش ہوتا تو شاید وہ اسے ترک بھی کر دیتا لیکن آرٹ تو اس کے لئے ذریعہ اظہار تھا اپنے اندر کی تخیققی آگ کے اظہار کا ذریعہ۔اپنے ہم وطنوں کے دکھوں' غموں اور اندوہوں کے اظہار کا ذریعہ! کیا وہ آرٹ کو ترک کر

کے اپنے وطن سے بیوفائی کر جائے گا' کای وہ اپنی زندگی کے مشن سے دستبردار ہو جائے گا۔ نہیں' ہر گز نہیں' آرٹ میری زندگی ہے' پینٹنگ میری روح ہے۔ میں اپنی روح سے کس طرح دستبردار ہو سکتا ہوں۔ میں اسے کیسے رضاکارانہ طور پر عزرائیلوں کے حوالے کر سکتا ہوں۔

پھر اس نے یہ بھی سوچا کہ اگر سماجی لحاظ سے وہ صدیوں پرانے سانچوں میں فٹ کر دیا گیا ہے تو کم از کم تخلیقی سطح پر وہ اپنی انفرادیت ضرور برقرار رکھے گا۔ وہ ایسے کینوس پینٹ کرے گا جو اس کی ذات کی پہچان کا حوالہ بن سکیں۔ وہ ایسے شاہکار تخلیق کرے گا جو بیرون ملک پاکستان کا نام روشن کر سکیں۔ اسے اپنے تخلیقی جوہر اور اپنے فن پر بہت اعتماد تھا۔ وہ اپنی صلاحیتوں کو چک نمبر ۲۳۰ کی گلیوں میں ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔

اسی ادھیڑ بن میں وہ انٹر ویو دینے چلا گیا۔ انٹر ویو دینے والے زیادہ نہ تھے۔ اسی دن سہ پہر کو انٹرویو کا نتیجہ سنا دیا گیا۔ اگلی صبح تقرری کا خط ٹائپ کر کے فطرت کے ہاتھ تھما دیا گیا۔

یوں اس کا مستقبل لاہور یا آباد کی بجائے اسلام آباد سے وابستہ ہو گیا۔

ادارۂ شناخت پاکستان کا دفتر اسلام آباد کی ایک پرائیویٹ کوٹھی میں تھا جس کے خوبصورت لان میں پھول ہی پھول تھے۔ برآمدے میں درآمد شدہ ٹائلیں نصب تھیں اور اندر ساری فٹنگز ولایتی تھیں۔ اس ادارے کو اس عمارت میں وہ رہ کر پاکستان کا تشخص ابھارنا تھا۔

اس ادارے میں تین ڈائریکٹرز' ایک ڈپٹی ڈائریکٹر جنرل اور ایک ڈائریکٹر جنرل تھا۔ ڈی۔ جی کے عہدے ر ایم۔ زیڈ' نصرت فائز تھے۔ اور ڈی ڈی جی کی آسامی بخاری صاحب کے پاس تھی۔ ان کے نیچے دو شعبے تھے' پرفارمنگ آرٹس (Performing Arts) اور وژیول آرٹس(Visual Arts) جنہیں مختلف طور پر پی۔ اے سیکشن اور وی۔ اے سیکشن

کہتے تھے۔ پی۔ اے سیکشن کے انچارج شمسی صاحب تھے اور وی۔ اے سیکشن فطرت کے سپرد ہوا۔

اچھے اچھے کمرے پہلے ہی سنبھالے جا چکے تھے۔ فطرت کو دفتر کے لئے جو کمرہ ملا وہ کوٹھی کا ڈائننگ روم تھا جس کے ساتھ نہ باتھ روم تھا اور نہ مہمانوں کے بیٹھنے یا ایزل وغیرہ سجانے کے لئے مناسب جگہ۔ فطرت نے اس کا ذکر ڈی۔ جی سے کیا تو انہوں نے کہا:

"آپ نے یہاں بیٹھ کر پینٹ نہیں کرنا' آپ کا کام بصری فنون کو فروغ دینا ہے جس کے لئے آپ کو نئے اور پرانے فنکاروں سے رابطہ قائم کرنا ہو گا۔ ان کے فن پاروں کی نمائشیں کرانا ہوں گی۔ ملکی اور غیر ملکی وفود کے لئے تجاویز مرتب کرنا ہوں گی۔ اس سلسلے میں آپ نے اس دفتر کو انتظامی امور کے لئے استعمال کرنا ہے۔ یہاں بیٹھکر کینوس نہیں گھسانے۔ میرے خیال میں آپ کی اس بیک وقت دو چار آرٹسٹوں سے زیادہ نہیں آئیں گے۔ ان کے بیٹھنے کی لئے جگہ کافی ہے۔"

فطرت یہ جواب سن کر خاموش ہو گیا۔

اپنے رفقائے کار سے فطرت کی دوستی پر فارمنگ آرٹس کے ڈائریکٹر صاحب سے ہو گئی جو اس کی طرح فائن آرٹس میں ایم۔ اے کی ڈگری اور پانچ سالہ تجربہ رکھتے تھے ایڈمنسٹریشن کے انچارج ایک پرانے گھسے پٹے سابق آفس سپرنٹنڈنٹ تھے جس کے ساتھ فطرت کی دوستی تھی نہ دشمنی۔ بس بین بین معاملہ تھا۔ البتہ پتہ نہیں کیوں شروع دن سے ہیف طرت کی ڈی۔ جی بخاری صاحب سے نہ بن آئی۔ بخاری صاحب کی زیادہ تر زندگی پولیس کے شعبے میں گزری تھی اور اب وہ ملازمت کے ایسے مرحلے میں تھے جہاں انہیں مزید ترقی کی توقع نہ تھی۔ ان کے بچے جوان اور ملازمت بوڑھی ہو چکی تھی۔ انہوں نے اسلام آباد میں اپنا مکان بنوانے اور ریٹائرمنٹ کے بعد اس میں آباد ہونے کے لئے خاص طور پر اس ادارے میں اپنی پوسٹنگ کروائی تھی۔ وہ سمجھتے تھے کہ ان کا کام ڈی۔ جی صاحب کو خوش رکھنا اور باقی سب کو دبا کر رکھنا۔ پہلی ملاقات

میں ہی بخاری صاحب فطرت کو کچھ اکھڑ سے لگے جن کی موجودہ تقرری کی وجہ سے آرٹ سے ان کی وابستگی نہیں بلکہ متعلقہ حلقوں میں ان کا اثر و رسوخ تھا۔

URDU4U.COM

فطرت نے ان حوالات میں یہ طریقہ اپنایا کہ وہ اپنی شعبے کا کام براہ راست ڈی جی صاحب کو دکھاتا تھا اور وہ بھی براہ راست اپنے اپنے پاس بلاتے رہتے تھے۔ اس سے بخاری صاحب کچھ اور کھنچ گئے۔ آتے جاتے فطرت ان کو سلام کرتا تو وہ بڑی بے رخی سے جواب دے کر آگے نکل جاتے۔

فطرت کی ملازمت کے ابتدائی دنوں کی بات ہے کہ بخاری صاحب نے فطرت کو اپنے دفتر میں طلب فرمایا اور اسے دو تین چھوٹے چھوٹے کینوس دکھائے جو بخاری صاحب کے بھتیجے نے بنائے تھے۔ دراصل وہ ان تصویروں کے ذریعے اپنے بھتیجے کا ایک آرٹسٹ کے طور پر تعارف کرانا چاہتے تھے۔ تاکہ اسے آئندہ کسی غیر ملکی دوری پر جانے والے وفد میں ڈالا جا سکے۔ فطرت اپنی ناتجربہ کاری کی وجہ سے اصل بات کو نہ بھانپ سکا۔ چنانچہ بخاری صاحب نے ان تصویروں کے متعلق اس کی بے لاگ رائے پوچھی تو اس نے کہا

"مجھے نہیں معلوم کہ ان تصویروں کے بنانے والے کا بیک گراؤنڈ کیا ہے لیکن یہ تصویریں بتاتی ہیں کہ وہ ایک دن بھی کسی استاد کے پاس نہیں بیٹھا"

"اس میں Talent تو ہے' نا"

"سچ پوچھیں تو اسے پینٹنگ کی ابجد بھی نہیں آتی"

"تھینک یو' آپ جا سکتے ہیں"

کچھ عرصے بعد بخاری صاحب نے فطرت کو دوسرا موقع دیا' اسے اپنے دفتر میں بلوایا اور کہا:

"مجھے مقامی آرٹ کونسل میں ایک نمائش کا افتتاح کرنا ہے۔ آپ مجھے تقریر لکھ دیں۔"

"لیکن آرٹ کے متعلق مجھے آپ کے خیالات کا علم نہیں"

"تقریر لکھنے کے لئے خیالات جاننا ضروری نہیں"

"تو میں کیا لکھوں؟"

"اسی لئے تو تمہیں بلایا ہے۔ ابھی آج اور کل کا دن باقی ہے۔ سوچ لو' کتابیں Consult کرنا ہے تو کتابیں دیکھ لو۔ پرسوں صبح مجھے لکھی ہوئی تقریر چاہئے"

URDU4U.COM

"آپ اس تقریر میں کہنا کیا چاہتے ہیں؟"

"فطرت تم اچھی بھلی پوسٹ پر ہو۔ تم سمجھتے کیوں نہیں' موقع و محل کے مطابق آدھ گھنٹے کی تقریر لکھ دو"

"سوری' سر' میں اپنے خیالات کو آپ سے منسوب کرنے میں کوئی عزت محسوس نہیں کرتا۔ اور نہ میرا یہ کام ہے۔"

بخاری صاحب نے غصے سے کہا "او کے' او' کے' آئی ول سی یو" (اچھا اچھا میں نپٹ لوں گا تم سے)

فطرت کو اسلام آباد کے سیکٹر جی ۶/۴' میں ایک مکان الاٹ ہو گیا۔ جس کا ظاہر امیرانہ اور باطن غریبانہ تھا۔ ایسا غریبانہ بھی نہیں تھا۔ البتہ اس کے اندر کی مکانیت اس کے ظاہری رکھ رکھاؤ کا ساتھ نہ دیتی تھی۔ باہر سے ایک بنگلہ لگتا تھا۔ لوہے کا گیٹ نچلی چار دیواری کے ساتھ ساتھ سنتھے کی باڑ' چھوٹا سا خوبصورت لان' لان کے کناروں پر موسمی پھولوں کی کیاریاں۔ البتہ اندر صرف تین کمرے تھے۔ ایک ڈرائنگ مع ڈائننگ روم اور بیڈ روم' فطرت نے ایک بیڈ روم کو فوراً اپنے سٹوڈیو میں بدل لیا اس کا پروگرام تھا کہ دفتری اوقات کے بعد وہ اس کمرے میں پینٹ کیا کرے گا اور ایک عرصے سے جو تصویریں اس کے ذہن میں کھلبلی مچا رہی تھیں انہیں کینوس پر منتقل کر سکے گا۔

وہ مکان ملتے ہی زبیدہ کو بھی اسلام آباد لے گیا۔ اس نے آ کر سب سے پہلے باورچی خانہ دیکھا۔ گھر کے سامان پر سرسری سی نظر ڈالی اور نئے گھر میں مقیم ہو گئی۔

فطرت ہر ماہ تنخواہ ملنے پر گھر کی کوئی نہ کوئی شے خرید لاتا۔ کبھی میز کبھی کرسی' کبھی پنکھا' کبھی باورچی خانے کے مزید تن' کبھی پردے' کبھی بستر کی چادریں' کبھی فالتو تکیے۔

اس کا خیال تھا کہ تنکا تنکا اکٹھا کر کے گھونسلہ آباد ہو جائے گا۔
شروع شروع میں تو زبیدہ کچھ نہ بولی' فطرت جو خرید لاتا' اسے گھر میں سجا لیتی۔ باورچی خانے کے لئے جو کچھ لے آتا پکا لیتی۔ لیکن رفتہ رفتہ جب اسکا میل جول محلے والیوں سے ہوا تو اس کے پر پرزے نکلنا شروع ہو گئے۔ چوہدری صلاح الدین کی اکلوتی بیٹی اپنے چک میں مقامی معیار کے مطابق بڑی ٹھاٹھ دار زندگی گزار چکی تھی۔ اب شہر میں بھی اسے عزت بے عزتی کا خیال رہتا تھا۔ وہ جس کے گھر میں جو شے دیکھتی اس کے حصول میں اپنی عزت سمجھتی اور اگر وہ چیز مہیا ہونے میں تاخیر ہو جاتی تو وہ اسے اپنی بے عزتی سمجھنے لگتی۔ فطرت اسے آرام سے سمجھاتا کہ رفتہ رفتہ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا لیکن وہ تو ہتھیلی پر سرسوں جمانا چاہتی اور جب تک سرسوں جم نہ آتی وہ سمجھتی کہ وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہی
فطرت اس کی باتیں اور اس کے مطالبے سہتا رہا۔

فطرت اپنے سرکاری کام میں خاصا طاق تھا۔ اس نے چارج سنبھالتے ہی نہ صرف اپنا کام اچھی طرح سمجھ لیا بلکہ اسے انجام دینے کے لئے تین مہینے کے اندر اندر ایک جامع منصوبہ بھی تیار کر لیا۔
اس منصوبے کے دو حصے تھے۔ پہلے حصے میں دھرتی سے آرٹ کے رشتے اور ملکی اقدار کے اظہار کے لئے فنون لطیفہ کی اہمیت اور کردار پر روشنی ڈالی گئی تھی اور دوسرے حصے میں اس تھیوری کو عملی شکل دینے کے لئے ایک لائحہ عمل تیار کیا گیا تھا اس لائحہ عمل میں تین تجاویز پیش کی گئی تھیں۔ پہلی تجویز یہ تھی کہ قومی سطح پر بصری فنون کی ایک نمائش کا اہتمام کیا جائے جس میں تمام صوبوں سے تعلق رکھنے والے نامور فنکاروں کو نمائندگی دی جائے اور اس نمائش میں پینٹنگ' مجسمے' ظروف سازی اور دوسرے فن پارے رکھے جائیں۔ دوسری تجویز نو عمر اور نو آموز آرٹسٹوں کے بارے میں تھی۔ اس تجویز میں کہا گیا تھا کہ شکر پڑیاں یا اس قسم کی مرکزی جگہ پر جونیئر آرٹسٹوں کا

تین روز ورکشاپ منعقدکیا جائے جہاں وہ مہمانوں کے سامنے اپنے فن پارے تخلیق کریں
اور تیسری تجویز یہ تھی کہ سال کے آخر میں جونئیر اور سنئیر آرٹسٹوں کا ایک مشترکہ
کنونشن بلایا جائے جس میں وہ نہ صرف آپس میں مل جل سکیں بلکہ آرٹ کے شائقین
بھی ان سے تبادلہ خیال کر سکیں۔

اس کے علاوہ اس پچاس صفحاتی منصوبے کے آخر میں ایک عظیم الشان آرٹ گیلری تعمیر
کرنے کو کہا گیا تھاا ور ایک آوٹ لائن میں اس گیلری کے بنیادی خدوخال کی نشاندہی
کی گئی تھی۔

فطرت نے یہ سارا پلان ڈی۔ جی کو بھیج دیا۔ جنھوں نے دوسرے دن ہی فطرت کو
اپنے دفتر میں بلا لیا۔ جب وہ ان کے کمرے کی طرف جانے لگا تو راستے میں شمسی
صاحب مل گئے۔

"سنا ہے آج تمہاری پیشی ہے' ڈی۔ جی کے پاس"

"پیشی تو نہیں' بس انہوں نے بلوایا ہے"

"اسے یہاں پیشی کہتے ہیں جو دراصل ڈی ڈی جی صاحب کی اختراع ہے۔ پیشی کے بعد
تخت یا تختہ۔ گڈ لک"

اس کے بعد فطرت ڈی۔ جی صاحب کے حضور پیش ہو گیا۔ انہوں نے اسے بیٹھنے کا اشارہ
کیا اور فرمایا۔ "فطرت' میں نے تمہیں دو باتوں کے لئے بلایا ہے"

"جی"

ایک بات تو یہ ہے کہ میں تمہاری رپورٹ کے آخری حصے کو جو آرٹ گیلری کی تعمیر
سے متعلق ہے منسٹری میں بھیج رہا ہوں۔ اس کے لئے باقاعدہ منظوری اور فنڈز کی ضرورت
ہو گی۔ اور اسے عملی شکل دینے میں خاصی دیر لگے گی۔ البتہ اگر نتائج فوری طور پر
سامنے نہ آئیں تو Don't be frustated (مایوس و پریشان نہ ہونا) دوسری بات تم سے
پوچھنا تھی کہ بصری فنون کے متعلق اگر تمہاری تینوں تجاویز مان لی جائیں تو کیا تم انہیں
Implement کر سکو گے"

 © Urdu4U.com

"جی' بالکل۔ آپ کی سرپرستی چاہئے' میں نے جو کچھ لکھا ہے اسے پریکٹیکل سمجھ کر ہی لکھا ہے۔"

"اچھا' تو یہ تینوں تجاویز منظور سمجھو' میں اس پروگرام کی ایک کاپی اور اطلاع کے لئے بھیج رہا ہوں Go ahead (شروع کر دیجئے کام)

URDU4U.COM

فطرت نے تینوں تجاویز کو تین مہینوں کے وقفوں تک پھیلا دیا تاکہ سال کے باقی نو مہینے ان تقریبات میں گزر جائیں۔

پہلی تقریب کے لئے فطرت نے ایک تفصیلی پروگرام بنایا۔ تمام صوبوں سے تعلق رکھنے والے بصری فنون کے ماہرین کے نام اور پتے اکٹھے کئے۔ پہلے انہیں سرکاری چٹھی کے ذریعے اس نمائش کے بارے میں اطلاع دی۔ پھر پرانے اور ممتاز آرٹسٹوں کو اس نمائش میں شرکت پر آمادہ کرنے کے لئے سفارشیں ڈھونڈیں۔ آخر میں خود چاروں صوبائی دارالحکومتوں میں گیا۔ متعلقہ فنکاروں سے ذاتی طور پر رابطہ قائم کیا۔ انہیں اپنے فن پارے مستعار دینے کی اپیل کی اور ساتھ ہی ان فن پاروں کو صحیح و سالم واپس کرنے کی گارنٹی دی اور جو آرٹسٹ سابقہ تلخ تجربوں کی وجہ سے اپنے فن پاروں سے جدا ہونے کو تیار نہ تھی انہیں قائل کرنے کے لئے ڈی۔ جی صاحب کے دستخطوں والی ایک چٹھی دکھائی کہ اگر کسی فن پارے کو کسی قسم کا نقصان پہنچا تو ادارۂ شناخت پاکستان اس کی مقررہ قیمت سی بڑھ کر معاوضہ ادا کرے گا۔

دو تین مہینوں کی دوڑ دھوپ کے بعد تمام مطلوبہ فن پارے اسلام آباد میں جمع کر لئے گئے۔ ہوٹل شہر زاد کا ایک حصہ بک کروا لیا گیا۔ اس کے ہال میں تمام فن پاروں کو سجا دیا گیا۔ ایک ایک دیوار کے ساتھ ایک ایک صوبے کو نمائندگی دی گئی اور درمیان میں اسلام آباد کے آرٹسٹوں کی تخلیقات رکھی گئیں اور یوں قوم یکجہتی کا ایک تاثر پیش کیا گیا۔

اس عظیم الشان نمائش کا افتتاح کرنے کے لئے وزیراعظم کو دعوت دی گئی جو انہوں نے

بخوشی قبول کر لی۔ افتتاح کے لئے بھی روایتی قسم کا فیتہ لگانے کی بجائے ایک نیا طریقہ اپنایا گیا ایک طشتری میں چار موم بتیوں کو اس طرح سجایا گیا کہ ایک موم بتی کو روشن کرنے سے بیک وقت چاروں موم بتیاں روشن ہو جاتی تھیں۔

جب نمائش کے افتتاح کا وقت آیا تو ڈی جی صاحب نے جو انتظامی امور کے انچارج تھے' فطرت اور اس کے دونوں نائبین کو سختی سے ہدایت کی کہ جب پی۔ ایم صاحب تشریف لائیں تو وہ کہیں نظر نہ آئیں۔ نہ استقبالیہ قطار میں اور نہ ہال کے اندر' البتہ وہ گمنامی کی حالت میں کہیں قریب ہی رہیں تاکہ اگر ڈی جی صاحب کو ان کی ضرورت پڑ جائے تو انہیں فوراً طلب کیا جا سکے۔

اگرچہ فطرت کو یہ ہدایت خاصی کڑوی اور بے جواز لگی لیکن وہ ایک شخص کی خاطر ساری تقریبات کو خراب کرنا نہیں چاہتا تھا۔ چنانچہ وہ اور اس کے دو مددگار نمائش گاہ میں حاضر ہونے کے باوجود بھی غیر حاضر رہے۔ وزیراعظم' وزیر ثقافت سمیت تشریف لائے۔

وزیراعظم افتتاح کے نئے انداز سے متاثر ہوئے اور اندر نمائش دیکھ کر اور بھی خوش ہوئے۔ انہوں نے ادارۂ شناخت پاکستان کو ایک لاکھ روپے کی اضافی گرانٹ سے نوازا اور بعد میں ڈی۔ جی کے نام ایک توصیفی خط بھی بھیجا۔

اس نمائش کے تین ماہ بعد فروری کے اوائل میں سارا راولپنڈی/اسلام آباد شکر پڑیاں پر امڈ آیا۔ سردیوں کی چمکتی دھوپ میں یہاں ایک میلے کا سماں تھا آرائشی دروازے اور محرابیں کھڑی کی گئی تھیں۔ آرٹسٹوں کو اپنے اپنے فن کے مطابق گروپوں میں تقسیم کر کے کام پر لگا دیا گیا تھا۔ ارد گرد چائے' سگریٹ' پان وغیرہ کے عارضی سٹال خود بخود اگ آئے تھے۔ پہلے دن اس ورکشاپ کا رسمی افتتاح وزیر ثقافت نے کیا اور اس کے بعد تقریب خاص و عام کے لئے کھول دی گئی۔ صبح و شام ہزاروں کی تعداد میں شائقین آتے اور فن کاروں کو مجسمے بناتے اور پینٹنگ کرتے دیکھتے۔ ان کے پاس آتے'

© Urdu4U.com

ان کا نام پوچھتے' فن کے بارے میں ان سے باتیں کرتے اور خوش خوش واپس چلے جاتے۔ فنکار بھی خوش تھے کیونکہ عوام اور خواص کی سطح پر ان کی آج تک اتنی پذیرائی کبھی نہیں ہوئی تھی۔

URDU4U .COM

اگلے دو تین ماہ کے اندر فطرت نے تیسرا کامیاب فنکشن منعقد کر کے ایک ہی سال میں ہیٹ ٹرک کر دیا۔ نئے اور پرانے آرٹسٹوں کا یہ کنونشن اس لحاظ سے یاد گار تھا کہ اس کا افتتاح خود صدر مملکت نے کیا اور اس دو روزہ کنونشن میں (جسے بعض لوگ ملن پارٹی کہتے تھے) چاروں صوبوں کے جونیئر اور سینئر آرٹسٹ گھل مل گئے۔ اس کنونشن میں بعض ایسے فن کار بھی نظر آئے جن کا نام تو عرصے سے سنا جا رہا تھا لیکن انہیں لوگوں نے بہت کم دیکھا تھا۔ لوگوں نے دل کھول کر آرٹسٹوں کی عزت کی۔ ان سے آٹو گراف لئے۔ ان کے ساتھ تصویریں بنوائیں اور چند ایک کو اپنے ہاں چائے یا کھانے پر بلوایا۔

یکے بعد دیگرے یہ کامیاب تقریبات منعقد کرنے کی وجہ سے فطرت کی پیشہ وارانہ مہارت کا سکہ بیٹھ گیا۔ مداح تو مداح اس کے مخالفین بھی یہ تسلیم کرنے لگے کہ فطرت میں چیزوں کو پلان کرنے کے لئے Imagination (تخیل) بھی ہے اور انہیں عملی شکل دینے کے لئے انتظامی صلاحیت بھی۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ نئے اور پرانے آرٹسٹوں کی طرف اس کا رویہ بہت اچھا تھا۔ وہ سچ مچ نہیں اپنے وطن کی ثقافتی شناخت کا حوالہ سمجھتا تھا۔

اس کامیابی سے جہاں فطرت نے اپنے لئے کئی قدر دان پیدا کر لئے وہاں اس کے حاسدوں کی تعداد میں بھی خاصا اضافہ ہو گیا۔

ایک دن ڈائریکٹر (ایڈمنسٹریشن) ریاست نے فطرت کو دفتر میں بلایا اور کہا "ڈی۔ جی صاحب کی بیگم لندن سے آج رات واپس آ رہی ہیں۔ آپ نے انہیں Receive کرنا ہے۔ کسٹم والوں سے ان کا سامان کلئیر (Clear) کروانا ہے اور پھر انہیں کوٹھی پر پہنچانا

ہے۔ چاہو تو دفتر کی گاڑی استعمال کر سکتے ہو"

"لیکن بیگم صاحبہ سے میرا کیا تعلق؟"

"اسے بڑا تعلق اور کیا ہو گا کہ وہ آپ کے باس کی بیگم ہیں"

URDU4U.COM

"لیکن میرا ان سے کوئی تعارف نہیں' ذاتی طور پر جان پہچان نہیں"

"فطرت۔ تم ایک واقف کار یا دوست کو لینے نہیں جا رہے ہو۔ تم ڈیوٹی پر جا رہے ہو"

"میری ڈیوٹی بصری فنون کو فروغ دینا اور آرٹسٹوں کی حوصلہ افزائی کرنا ہے۔ بیگم صاحبہ آرٹسٹ ہیں کیا؟"

طنز نہیں چلتی فطرت صاحب دفتروں میں۔ ڈیوٹی از ڈیوٹی۔ اگر آپ یہ ڈیوٹی نہیں کرنا چاہتے تو صاف بتا دیجئے تا کہ ڈی ڈی جی صاحب کو اطلاع کر دوں۔"

"سوری! میں نہیں جا سکتا۔"

یہ کہہ کر فطرت واپس اپنے دفتر میں چلا آیا۔ ڈی۔ جی صاحب تو خود کراچی گئے ہوئے تھے فطرت کا خیال تھا کہ شاید ڈی ڈی جی صاحب اسی طلب فرمائیں گے لیکن ان کی طرف سے کوئی بلاوا نہ آیا۔ دن خیریت سی گزر گیا۔

کچھ عرصے بعد ڈیزائنر (Designer) بھرتی کرنے کا مرحلہ آیا۔ ان کا امتحان لینے کا کام فطرت کو سونپا گیا۔ اس نے ابتدائی گفتگو کے بعد تینوں امیدواروں سے کہا کہ وہ اگلے روز ڈیزائننگ اور اسکیچنگ کے سامان سمیت اس کے دفتر میں آ جائیں۔ وہ آ گئے۔ فطرت نے انہیں اپنے سامنے بٹھا کر اسکیچنگ کا کام دیا۔ اپنی میز پر خالی گلدان رکھ کر انہیں کہا کہ آپ تینوں مختلف زاویوں پر بیٹھ کر اپنے اپنے زاویے سے اسکا پنسل اسکیچ تیار کریں۔ انہیں کام میں لگا کر فطرت خود تھوڑی دیر کے لئے بی۔ اے سیکشن کے انچارج شمسی صاحب کے پاس چلا گیا۔ آدھ گھنٹے کی گپ شپ کے بعد وہ واپس آیا تو تینوں امیدوار کورے کاغذ سامنے رکھے ایک دوسرے سے باتیں کر رہے تھے۔

فطرت نے تینوں کو فیل کر دیا۔

اگلے دن ڈائریکٹر ایڈمنسٹریشن (ریاست) خود فطرت کے دفتر میں آئے اور کہنے لگے:

"فطرت' کچھ خدا کا خوف کرو' اپنی نوکری کے ساتھ ہمارا بھی پٹڑا کروانے پر کیوں تلے ہوئے ہو۔ تم تو آرٹسٹ ہو۔ کینوس لال پیلے کر کے روزی کما لو گے ہم جیسے لوگ جو Unskelled Labour (بے ہنر ملازمین) کی فہرست میں آتے ہیں' کیا کریں گے"

"کیوں' کیا ہوا۔ ریاست صاحب"

"بھئی تم نے غضب کر دیا۔ تینوں لڑکوں کو فیل کر دیا"

"تو اس میں غضب ڈھانے کی کیا بات ہے"

"بھئی ایک لڑکا فنانس سیکرٹری صاحب کا تھا جن کے ہاتھ میں مالی لحاظ سے ہماری جان ہوتی ہے' دوسرا کلچر سیکرٹری صاحب کا اور تیسرا وزیر صاحب کا نامزد کردہ تھا۔ ان تینوں اعلیٰ افسروں کی سفارش کو نظر انداز کر دینا روزی پر لات مارنے کے مترادف ہے۔ سمندر میں رہنا اور مگر مچھ سے بیر۔

"میں نے تو ادارے اور ملک کے مفاد میں انہیں فیل کیا ہے۔ اگر آرٹ سے واقفیت ضروری نہیں تو اپنے دفتر کے چپڑاسی کو آپ یہ نوکری کیوں نہیں دے دیتے"

"پتہ ہے اوپر سے ڈی جی اور ڈی ڈی جی کو فون آنے شروع ہو گئے ہیں۔ تیار ہو جاؤ بوریا بستر لپیٹنے کے لئے۔ اپنا بھی اور ہمارا بھی!"

فطرت انتظار میں ہی رہا۔ لیکن کسی کے سامنے نہ "پیشی" ہوئی نہ بوریا بستر لپیٹنے کے آرڈر آئے۔ ہر شے اندر ہی اندر پکتی رہی۔

کئی دنوں کے بعد ڈی۔ جی صاحب نے طلب فرمایا اور کہا:

"یہ ہمارے ایک دوست کی بیٹی کی تصویر ہے۔ اس تصویر سے پورٹریٹ تیار کرنا ہے۔"

"اگر وہ خود آ سکتیں تو ماڈل سے بہتر پورٹریٹ بن جاتا۔" فطرت نے کہا

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن وہ دراصل امریکہ میں ہے۔ اس کے والدین کی خواہش ہے کہ وہ اپنی بیٹی کا خوبصورت پورٹریٹ ڈرائنگ روم میں سجائیں۔"

فطرت نے تعمیل ارشاد کے لئے تصویر قبول کر لی۔ ہفتہ دس دن اس پر کام کیا اور آئل کلر میں ایک تصویر بنا کر پیش کر دی۔

URDU4U.COM

ڈی۔ جی صاحب کی طرف سے داد ملی نہ بیداد۔ فطرت بھی خاموش ہو گیا کہ چلو بلا ٹلی۔ درحقیقت یہ آئل پینٹنگ ڈی۔ جی صاحب کو پسند نہ آئی لیکن انہوں نے اس کا اظہار نہ کیا۔

دفتر میں یونہی آنچ تپتی رہی۔ کبھی ہلکی' کبھی تیز!

گھریلو محاذ پر بھی حد تیز ہو گئی۔ زبیدہ کا سماجی حلقہ جوں جوں بڑھتا گیا اس کے مطالبات بڑھتے گئے۔ ایک دن فطرت دن بھر کا تھکا ماندہ واپس گھر آیا تو زبیدہ نے اس کے سامنے کھانا چن دیا۔ ادھر پہلا نوالہ منہ میں ڈالا' ادھر حسب عادت زبیدہ نے پہلا تیر پھینکا:

"تم تو سارا دن باہر پھرتے رہتے ہو۔ تمہیں تو گھر کی کوئی فکر ہی نہیں"

فطرت نے نوالہ چبانے کے ساتھ پہلا تیر بھی چبا کر کہا:

"میرا تو محلے میں رہنا مشکل ہو گیا ہے"

"کیوں کوئی وجہ بھی بتاؤ"

"کیا بتاؤں؟ کئی دفعہ بتا چکی ہوں' جب ذکر کرتی ہوں' کھانا آدھا چھوڑ کر باہر چلے جاتے ہو"

"اچھا بابا' کھانا چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔ تم اپنا بوجھ اتار لو"

"بات یہ ہے کہ آپ چند دنوں بعد ایک بچی کے باپ بننے والے ہیں۔ ویسے بھی لوگوں کا آنا جانا ہے۔ اس کے بعد اور زیادہ لوگ آئیں گے۔ میرے میکے والے بھی آئیں گے۔ شائد خالہ اور چچی بھی آئیں' وہ آ کر دیکھیں گے۔ ہمارے گھر کا حال' ہماری تو رہی سہی عزت بھی ختم ہو جائے گی"

"کیوں گھر میں کیا کمی ہے۔ اچھا خاصا آباد ہے۔ ڈائننگ ٹیبل اور چار کرسیاں ہیں۔ دو پلنگ اور تین فالتو چارپائیاں ہیں۔ بیٹھک میں دری اور صوفہ ہے۔ دوسرے کمرے

میں۔"

"لو یہ بید کا صوفہ بھی کوئی صوفہ ہوتا ہے۔ میں گدیاں بدل بدل کر تھک گئی ہوں۔ ساتھ ایس ڈی او صاحب کا گھر دیکھ لو' ادھر سیکشن آفیسر کا گھر دیکھ لو' سامنے فارسٹ آفیسر کا گھر دیکھ لو۔ دس دس ہزار کا صوفہ سیٹ پڑا ہے۔ بیٹھک میں' صوفے پر ریشمی کپڑے کی گدیاں رکھی ہیں اور گدیوں پر سندھی کام کیا ہوا ہے ہر گھر میں قالین ہے۔ ہر بیڈ روم میں پلنگ بچھے ہیں۔ اپنے لئے بھی اور مہمانوں کے لئے بھی۔ پھر چائے کی ٹرالی' جاپانی ٹی سیٹ' ڈنر سیٹ' کافی سیٹ اور پتہ نہیں کیا کیا سیٹ' میں تو کسی سہیلی کو اپنے گھر آنے کو بھی نہیں کہہ سکتی"

"ٹھیک ہو جائے گا۔ سب کچھ۔ آہستہ آہستہ

"تمہارے' آہستہ آہستہ' سے تو کئی سال لگ جائیں گے اس گھر کو بساتے بساتے"

"بس ذرا ہاتھ میں پیسے آ جائیں تو"

"وہ تو کبھی نہیں آئیں گے میں جب کوئی چیز لانے کو کہتی ہوں تو پیسوں کا بہانہ کر دیتے اور اپنا شوق پورا کرنے کے لئے جب چاہتے ہو' رنگ' برش' کینوس' فریم وغیرہ خرید لاتے ہو میری تو قدر ہی کوئی نہیں اس گھر میں"

"کیوں قدر نہیں' تم تو اس گھر کی ملکہ ہو' ملکہ"

"ملکہ ہوں؟ یہ کتابی باتیں میں کئی بار سن چکی ہوں۔ میں ملکہ کیسی ہوں جب میں نہ اپنی پسند کے کپڑے بنوا سکتی ہوں تو ملکہ کیسی' بس اک تمہاری چھوٹی سی پھٹ پھٹی رہ گئی ہے جس پر ہسپتال جاتے ہوئے بھی شرم آتی ہے"

"ٹھیک کہتی ہو' ہر کسی کا جی چاہتا ہے کہ اس کے پاس کار ہو۔ گھر میں قالین ہوں' عمدہ سے عمدہ فرنیچر ہو۔ زیور ہوں' کپڑے ہوں لیکن پیسہ"

"جس طرح تم نوکری کر رہے ہو۔ اس طرح تو تمہارے پاس کبھی بھی اتنے پیسے نہیں ہوں گے کہ تم ھر کی چیز خرید سکو۔"

"تو کیا میں چوری کر لوں' ڈاکہ ڈالوں کیا کروں"
"میری مانو' تو گاؤں والی جائیداد بیچ دو۔ ایک مکان اور چند ایکڑ زمین"
"لیکن وہ تو خاندانی جائیداد ہے۔ میرے والد کی یادگار"
URDU4U.COM
"اس گاؤں میں جہاں تم ایک رات بھی آرام سے نہیں گزار سکتے؟"
"پھر بھی اپنا گاؤں ہے"
"خاک اپنا گاؤں ہے۔ چھوٹے تھے تو گاؤں والوں نے وہاں سے نکال دیا پڑھ لکھ کر واپس آئے تو طعنوں کی بوچھاڑ کر دی۔ نوکری چھوڑ کر گھر آ بیٹھی تو جینا حرام کر دیا۔ میرا کیا ہے' میں تو دکھ سہنے کو پیدا ہوئی تھی اور دکھ سہہ لوں گی۔ لیکن وہاں نہ تم رہ سکو گے' نہ تمہاری اولاد میری مانو تو اسے فوراً بیچ دو۔ چند پیسے ہاتھ آ جائیں گے۔ گھر کی ضرورتیں پوری ہو جائیں گے زمینیں ویسے بھی کاری ہو گئی ہیں اور گاؤں کا مکان بھی چند سال بعد گر جائے گا اور چاچا شرفو پلاٹ پر قبضہ کر لے گا"
جائیداد بیچنے کی بات پہلے بھی کئی بار ہو چکی تھی لیکن فطرت کا یہ کام کرنے کو جی نہیں چاہتا تھا لیکن اب رفتہ رفتہ زبیدہ کا دباؤ اتنا بڑھ گیا کہ مجبور اسے وہ کام کرنا پڑا جو شاید نارمل حالات میں وہ کبھی نہ کرتا۔
اس نے گاؤں کی جائیداد بیچ دی۔
کل پچاس ہزار روپے موصول ہوئے۔ اس رقم سے گھر کی موٹی موٹی ضرورتیں پوری ہو گئیں۔ فرخ کی پیدائش کا مرحلہ گزر گیا۔ پندرہ ہزار کی فوکس ویگن خرید لی اور فطرت کے ذاتی سٹوڈیو میں ایک میز' دو کرسیوں اور بہت سے رنگوں' مجابرلوں اور برشوں کا اضافہ ہو گیا۔ فطرت نے اپنا شوق پورا کرنے کے لئے اس رقم سے پانچ سو روپے کا ایک ٹیپ ریکارڈر اور کیٹ پلیئر بھی خرید لیا۔
گاؤں کی چھوٹی موٹی جائیداد فروخت کرنے کے بعد فطرت یوں محسوس کرنے لگا کہ اس نے اپنی جڑیں کاٹ کر فروخت کر دی ہیں۔ اب اس کے پاؤں اپنی دھرتی پر نہیں رہے بلکہ وہ اسلام آباد کے خوبصورت خول میں معلق ہو کر رہ گیا ہے۔ پہلے وہ زمین

پر تھا اب وہ فوکس وین کے چار پہیوں پر آباد آ گیا ہے۔ پہلے وہ پا بہ گل تنا ور درخت تھا اب پر کاہ بن گیا ہے پہلے وہ سب کچھ تھا اب سب کچھ کھو بیٹھا ہے۔

URDU4U.COM

لیکن یہ غم ایسا غم تھا جو زبیدہ کی سمجھ سے باہر تھا۔ زندگی کے بہت سے تھپیڑوں کی طرح یہ صدمہ بھی فطرت اکیلے ہی سہہ گیا۔ تن تنہا!

ایک دن فطرت اپنی چارپائی پر لیٹا گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا کہ زبیدہ نے پھر پرانا موضوع چھیڑ دیا۔

"تمہارا گریڈ کیا ہے؟"

"کیا مطلب؟"

"میرا مطلب ہے تم کس گریڈ میں نوکری کرتے ہو۔ گریڈ ون' گریڈ ٹو' افسر' گزٹیڈ افسر' گزٹیڈ افسر کلاس ون؟ سنئیر کلاس ون؟

"یہ سارے لفظ تم نے کہاں سے سیکھ لئے۔ کب سیکھ لئے"

"میں تین سال سے اس شہر میں رہ رہی ہوں جہاں گریڈوں کے علاوہ اور کوئی بات ہی نہیں ہوتی۔ جہاں جاتی ہوں سب عورتوں سے یہی باتیں سنتی ہوں۔ میرا میاں گزٹیڈ افسر ہے۔ میرا میاں سنئیر کلاس فن افسر ہے۔ میرے میاں کا دفتر اتنا بڑا ہے۔ میرے میاں کو اتنی بڑی گاڑی ملی ہوئی ہے۔ میں ان کی باتیں سن سن کر تنگ آ چکی ہوں"

"تم کیا جواب دیتی ہو"

"کیا جواب دے سکتی ہوں تم تو کچھ بتاتے ہی نہیں ہو' میں اپنی عزت رکھنے کے لئے جھوٹ موٹ بکتی رہتی ہوں"

"مثلاً"

"مثلاً یہی کہ میرا میاں ایم۔ اے پاس ہے۔ گولڈ میڈل لیا تھا اس نے میرا میاں امریکہ پاس ہے۔ ایک سال رہا تھا وہاں' میرا میاں زمیدار خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ مربعے ہیں فیصل آباد میں"

"اگر تم ان واہیات دعووں پر تین سال گزار سکتی ہو تو مجھے یقین ہے باقی دن بھی گزار لو گی"

"نہیں یہ ناممکن ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ ان پر میری ان چھوٹی بچی باتوں کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ ان پر رعب پڑتا ہے تو اونچے گریڈوں کا یا مال و دولت کا۔ اور یہ دونوں ہمارے پاس نہیں ہیں"

فطرت کے منہ کا ذائقہ یک دم زہریلا ہو گیا۔

فطرت نے زبیدہ کو تسلی دیتے ہوئے کہا:

"کوئی بات نہیں۔ تم انہیں بتا سکتی ہو کہ تمہارے میاں کے پاس تعلیم ہے شہر میں اس کی عزت ہے' نام ہے' وہ آرٹسٹ ہے"

"میں ان چیزوں کا ان پر خاک رعب ڈالوں' جب ڈالڈا اور شکر شہر سے غائب ہوئے تھے اور میں دفتر جاتے وقت ہر روز تمہیں یاد دلاتی تھی کہ گھی اور چینی کا بندوبست کرنا اور تم نہ کر سکے تو میں نے ایس۔ ڈی او صاحب کی بیوی سے ڈالدا اور چینی لے کر گزارہ کیا تھا۔ پھر اور باتوں کا بھی تو اثر پڑتا ہے"

"کن باتوں کا؟"

"مثلاً ان کے بچے ٹرائی سائیکل گلیوں میں دوڑاتے پھرتے ہیں اور ہمارا فرخ سارا دن پلاسٹک کے فٹ بال کو ٹھڈے مارتا رہتا ہے۔ ان کے گھر میں ایک ایک پرائیوٹ اور ایک ایک سرکاری ملازم کام کرتا ہے اور میں سارا دن خود برتن مانجھتی رہتی ہوں۔ وہ روز روز نئے جوڑے پہن کر ملنے کے بہانے مجھے ستانے آ جاتی ہیں اور میں کسی کے گھر نئے کپڑے اور نیا زیور پہن کر نہیں جا سکتی"

"کوئی بات نہیں اگر ہمسائے کا منہ سرخ و سپید ہو تو اپنا منہ طمانچے مارم ر کر سرخ نہیں کر لینا چاہئے۔"

"یہ کتابی باتیں عملی زندگی میں نہیں چلتیں۔ پتہ نہیں تم کس دنیا میں رہتے ہو۔ تم پر

تو کسی چیز کا اثر ہی نہیں ہوتا۔ سارے طعنے' سارے دکھ تو مجھی سہنا پڑتے ہیں۔ قسمت تو میری پھوٹی ہے' جو میری شادی ایک پینٹ والے سے ہو گئی ہے۔ میرا شوہر بھی تحصیل دار' تھانے دار' ایس۔ ڈی۔ او یا فارسٹ افیسر ہوتا تو میں بھی عیش کرتی' میرے تو بھاگ ہی پھوٹ گئے ہیں مگر کیا کروں' کدھر جاؤں؟"

یہ دنیوی رونا روتے زبیدہ واقعی رو پڑتی۔ آنسو بہانے لگتی اور ننھا فرخ اس کے آنسو پونچھتا ہوا توتلی زبان میں کہتا "امی' امی آپ کیوں رو رہی ہیں۔ ابو نے مارا ہے آپ کو' ابو تھو' ابو گندے"

فطرت اپنی ماں کی حمایت کرنے والے ننھے منے فرخ کو اٹھا لیتا اور اسے ہوا میں لہر کر پیار کرنے لگتا۔ پیار کے اس مرہم سے اس کے زخم وقتی طور پر چھپ تو جاتے مگر مندمل نہ ہو پاتے۔

ایک شام فطرت چارپائی پر سرہانے کی ٹیک لگا کر کتاب پڑھ رہا تھا۔ زبیدہ باورچی خانے میں بیٹھی کھانا پکا رہی تھی۔ اتنے میں مغرب کی اذان ہوئی۔ فطرت نے کتاب بند کر کے پوچھا۔

"فرخ کہاں ہے؟"

"ہمسایوں کے گھر ٹی وی دیکھنے گیا ہے"

"ہمسایوں کے گھر۔ ٹی وی دیکھنے؟"

"ہاں"

"کیوں جانے دیا"

"کیا کرتی' تو ضد کرتا ہے' بچے آپس میں اپنے اپنے پسندیدہ ٹی وی پروگراموں کا ذکر کرتے ہیں تو"

"لیکن' نہیں جانے دینا تھا"

"گھر میں ٹی وی نہ ہو تو میں اسے کیسے روکتی۔ وہ گھر میں نہیں محلے میں رہتا ہے۔ گلی میں کھیلتا ہے۔ بچے باتیں کرتے ہیں"

"لیکن دوسروں کے گھر جا کر ٹی وی دیکھنے سے بچوں میں احساس کمتری پیدا ہو جاتا ہے"

"اگر اتنی ہی فکر ہے تو لے آؤنا ٹی وی" (فطرت کو وہ چند ہزار روپے یاد آئے جو اس نے پچاس ہزار میں سے بچا کر رکھے تھے)

URDU4U.COM

"ٹی وی لانا تو رنگین لانا۔ بڑی سکرین والا"۔ فرخ فاریسٹ آفیسر صاحب کے گھر رنگین ٹی وی ہی دیکھنے کا عادی ہے۔ عام ٹی وی پر اسے مزہ نہیں آئے گا۔ ورنہ وہ بلیک اینڈ وائٹ ٹی وی چھوڑ کر پھر پڑوسیوں کے گھر چلا جائے گا۔"

فطرت ایک اور محاذ پر جنگ ہار گیا اور رنگین ٹی وی خرید لایا۔

ایک سال بعد دوسرے بچے کی پیدائش کا وقت آ گیا۔ زبیدہ نے وقت آنے سے پہلے ہی کہہ دیا کہ اب میں جنرل وارڈ میں داخل نہیں ہوں گی۔ فرخ کے وقت میں نئی نئی تھیں۔ مجھے اسلام آباد میں عزت بے عزتی کا کوئی زیادہ پتہ نہیں تھا۔ اب میں نے سنا ہے بلکہ دیکھا ہے کہ صرف چپراسیوں اور کلرکوں کی بیویاں جنرل وارڈ میں بچے جنتی ہیں۔ افسروں اور اور عزت داروں کی بیگمیں علیحدہ کمرہ لیتی ہیں۔ ان پر ڈاکٹر بھی زیادہ توجہ دیتے ہیں اور ہسپتال کی نرسیں اور آیا بھی۔ ابھی سے بتا رہی ہوں' پھر نہ کہنا تمہیں اچانک دردیں شروع شروع ہو جاتی ہیں

بچے کی پیدائش سے پہلے جس لیڈی ڈاکٹر کے پاس فطرت زبیدہ کو لے جاتا تھا اسی سے اس نے کہہ دیا کہ جب ہسپتال میں داخل ہونے کا وقت آئے تو براہ مہربانی کسی کمرے زبیدہ کو داخل کرے۔ لیڈی ڈاکٹر نے وعدہ بھی کر لیا لیکن جب وقت آیا تو اسے الگ کمرہ نہ مل سکا۔ اسے چار عورتوں والے ایک کمرے میں بیڈ پر لٹا دیا گیا اور اس کے ارد گرد لوہے کے ڈنڈے سے لٹکا ہوا پردہ سرکا دیا گیا۔

ان حالات میں فطرت جب بھی ہسپتال جاتا زبیدہ اسے کمرہ نہ لینے کا طعنہ دیتی۔ جب وہ کہتا کہ کوئی کمرہ خالی نہیں ہے تو دو تین چار عورتوں کے نام گنوا دیتی جو اس

کے بعد داخل ہوئیں اور علیحدہ علیحدہ کمروں میں چلی گئیں۔ "میں لیکھوں کی ماری' اس پلیٹ فام پر پڑی ہوں۔ آنے جانے والی مشٹنڈوں کے راستے میں۔"

URDU4U.COM

ہسپتال میں یہ جھک جھک پتہ نہیں کب تک چلتی لیکن جلد ہی زبیدہ کو درد نہ شروع ہو گئی۔ وہ اسے اسٹریچر پر لٹا کر لیبر روم میں لے گئے۔ فطرت باہر کھڑا برآمدے میں انتظار کرنے لگا۔ انتظار کی گھڑیاں ویسے بھی لمبی ہوتی ہیں لیکن ایسے موقعوں پر تو ان کی طوالت کئی گنا بڑھ جاتی ہے۔ جب انتظار کرتے کرتے ایک گھنٹہ ہو گیا تو اس نے ادھر ادھر سے پتہ کرنا شروع کیا کہ کیا بات ہے؟ کوئی پیچید گی تو نہیں ہو گی۔ پتہ چلا کہ زچگی کی ماہر لیڈی ڈاکٹر اپنے ملاقاتی کے پاس ائرکنڈیشنڈ دفتر میں بیٹھی چائے پی رہی ہے۔ جب ملاقاتی چلا جائے گا تو وہ لیبر روم میں تشریف لے آئیں گی۔

ادھر لیبر روم سے زور زور سے رونے اور آہیں بھرنے کی آوازیں آنے لگیں۔ فطرت سارے آداب توڑتے ہوئے لیڈی ڈاکٹر کے کمرے میں چلا گیا جہاں وہ مسکرا مسکرا کر اپنے مہمان کو چائے کا دوسرا کپ پلانے پر اصرار کر رہی تھی۔ اپنی خلوت میں ایک اجنبی مخل ہونے پروہ بہت ناراض ہوئی اور غصے میں کہنے لگی:

"پتہ نہیں جنگلی لوگ کہاں سے چلے آتے ہیں منہ اٹھائے"

"ڈاکٹر ایمرجنسی ہے ایمرجنسی"

"کیا ایمرجنسیہے؟ یہاں جو آتا ہے ایمرجنسی لے کر آتا ہے"

"میری بیوی کو لیبر روم میں پڑے ہوئے ڈیڑھ گھنٹہ ہو گیا ہے۔ ڈاکٹر' وہ سخت تکلیف میں ہے"

"ایسے موقعوں پر تکلیف تو ہوتی ہے۔ ٹھیک ہو جائے گی تھوڑی دیر بعد آپ ادھر جا کر ویٹنگ روم میں بیٹھیں۔"

فطرت ویٹنگ روم کی طرف جانے لگا تو ایک مرسیڈیز کار ہسپتال کے پورچ میں آ کر رکی جہاں ایک دیوار پر لکھا ہوا تھا "یہاں گاڑیوں کا داخلہ ممنوع ہے" کار سے ایک بیگم صاحبہ اتریں' اس کے ساتھ دو عورتیں اس کی مدد کر رہی تھیں۔ ڈاکٹر اور نرسیں

اس کا استقبال کرنے پورچ میں ہی پہنچ گئیں اور سیدھا سے وی آئی پی لیبر روم میں لے گئیں۔
ادھر زبیدہ نے چیخ چیخ کر ایک بچی کو جنم دے دیا۔

URDU4U.COM

فطرت اپنی انا کی کرچیاں چنتا رہا۔

ادھر دفتر کا لاوا اپنی جگہ ابل رہا تھا۔ فطرت حسب معمول اپنی صلاحیتوں کے مطابق پوری محنت سے کام رہا تھا لیکن حالات سے سمجھوتہ کرنے کی صلاحیت ابھی اس میں پیدا نہیں ہوئی تھی۔ اس تناؤ کی وجہ سے لاوا پھٹنے کے قریب پہنچ رہا تھا۔
انہی دنوں معمول کے کاموں کے ساتھ ساتھ یکے بعد دیگر تین اور کام فطرت کے سپرد کر دیئے گئے کیونکہ ان کا تعلق بصری فنون سے بنتا تھا۔ پہلا کام بابائے قوم حضرت قائداعظم کا پورٹریٹ تیار کرنا تھا۔ اوپر کہیں فیصلہ ہوا تھا کہ قائداعظم کا ایک خوبصورت پورٹریٹ تیار کروا کر کابینہ سے منظور کروایا جائے اور پھر اس کے پرنٹس تمام دفاتر کو مہیا کئے جائیں۔
ڈی۔ جی صاحب نے فطرت کو بلا کر ذاتی طور پر یہ کام دیا اور تاکید کی تصویر میں قائداعظم کو لاغر اور کمزور دکھانے کی بجائے انہیں عزم اور قوت کے سمبل کے طور پر پیش کیا جائے۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کی آنکھوں میں ایک کہنہ مشق قائد کی بصیرت اور دور اندیشی بھی ہونی چاہئے۔
نمونے کے طور پر قائداعظم کی جوانی کی چند تصاویر بھی فطرت کے حوالے کی گئیں جن میں ان کا چہرہ بھرا بھرا اور جاذب نظر دکھائی دیتا تھا۔
اگرچہ قائد کی جوانی اور توانائی کے ساتھ ساتھ ان کی کہنہ مشق بصیرت دکھانا مشکل تھا لیکن فطرت نے سارے کام چھوڑ چھاڑ کر اس پر خاصی محنت کی کیونکہ اسے ذاتی طور پر قائد اعظم سے بہت عقیدت تھی اور وہ انہیں جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کا نجات دہندہ

سمجھتا تھا۔
کوئی ایک مہینے کی محنت شاقہ کے بعد فطرت قائداعظم کا ایک پورٹریٹ بنا کر ڈی۔ جی صاحب کے پاس لے گیا۔ فطرت کے خیال کے مطابق اس پورٹریٹ میں وہ ساری خوبیاں یکجا ہو گئی تھیں۔ جو ڈی۔ جی صاحب چاہتے تھے۔ انہوں نے اس پر ایک سرسری نظر ڈالتے ہوئے کہا:

URDU4U.COM

"فطرت میاں! تم ادارۂ شناخت پاکستان کام کرتے ہو۔ پورٹریٹ بنا رہے ہو بابائے قائداعظم کا اور پہنا دیا ہے مغربی سوٹ۔ کچھ خدا کا خوف کرو۔"
"جی دراصل تصویر میں وہ سوٹ ہی پہنے ہوئے ہیں"
"So what (تب کیا) تم انہیں شیروانی پہنا دو"
"لیکن سر' تاریخی لحاظ سے یہ تبدیلی غلط ہو گی کیونکہ اس تصویر میں ہم قائد کا جو چہرہ دکھا رہے ہیں وہ آغاز جوانی کا ہے اور اس دور میں انہوں نے کبھی اچکن یا شیروانی نہیں پہنی' آپ نے جو تصویریں دی تھیں وہ ۱۹۲۴ء سے پہلے کی ہیں۔"
"ایک تو آپ لوگوں کی ٹیکنیکل باتیں لے کر بیٹھ گئی ہیں۔ سیدھا سادا کام تھا' تصویر سامنے رکھ کر تصویر بنانا اور سوٹ کی جگہ اچکن پہنا دینا اور بس!"
"سر' یہ مسئلہ اتنا سادہ نہیں جتنا آپ سمجھ رہے ہیں"
"فطرت! سنو' میں نے یہ بال دھوپ میں سفید نہیں کئے اگر تم جیسے Finicky (مین میخ نکالنے والے) آرٹسٹ کی بجائے کوئی سمجھ دار قسم کا آرٹسٹ ہوتا تو ایک ہفتے میں آرڈر کے مطابق چیز تیار کر دیتا"
"تیار تو میں بھی کر سکتا ہوں ایک ہفتے کے اندر اندر' لیکن میں سمجھتا ہوں کہ میرے آئیڈیل اور مسلمانوں کے عظیم نجات دہندہ کے ساتھ یہ سراسر زیادتی ہو گی کہ ہم ۱۹۲۰ء کے قائداعظم کو ۱۹۴۰ء کا لباس پہنا دیں"
اسی بات پر ڈی۔ جی اور فطرت کے درمیان اختلاف پیدا ہو گیا۔ جو اچھی خاصی بحث

میں بدل گیا۔ تنگ آ کر ڈی۔ جی صاحب نے کہہ دیا "آپ جا سکتے ہیں"
فطرت پورٹریٹ اٹھا کر واپس کمرے میں چلا گیا۔
اس واقعہ کے چند روز بعد اخبارات میں یہ خبر چھپی کہ حکومت ملک کے آرٹسٹوں کو دعوت دینے والی ہے کہ وہ پاکستان کی مناظر پینٹ کریں۔ بعد میں ان مناظر میں سے حکومت ایسی تصویروں کا انتخاب کرے گی جو بیرون ملک پاکستانی سفارت خانوں میں لٹکانے کے لئے بھیجی جا سکیں۔ اول آنے والی تصویر پر پچاس ہزار روپے' دوم پر تیس ہزار روپے اور سوم پر بیس ہزار روپے نقد انعام دیا جائے گا۔ گویا پاکستان کی تصویری عکاسی کے لئے حکومت ایک لاکھ روپیہ خرچ کرے گی اور بیرون ملک سفارت خانوں کو ہدایت کی جائے گی کہ وہ پکاسو' گوگین یا مائیکل اینجلو کی تصویروں کی بجائے پاکستانی مصوروں کی بنائی ہوئی پاکستانی تصویریں لگائیں اور یوں پاکستان کے تشخص کو ابھاریں۔
اس اعلان کے چند روز بعد ڈی۔ جی صاحب نے فطرت کو بلایا اور کہا "تم اس مقابلے میں حصہ کیوں نہیں لیتے۔ ویسے بھی شناخت پاکستان کے ادارے میں تم بصری فنون کے ڈائریکٹر ہو اور پینٹنگ تمہارا پیشہ ہے۔ "ٹرائی" کرو' ممکن ہے پہلا یا دوسرا انعام تمہیں مل جائے۔ تمہارا بھی فائدہ ہو جائے گا اور ادارے کی شہرت بھی ہو جائے گی۔ کیا خیال ہے؟"
"جیسے آپ کہیں سر!"
"تو کل سے بسم اللہ کر دو
"دفتر میں تو' جیسا کہ آپ کو معلوم ہے جگہ نہیں ہے اس کام کے لئے اگر آپ اجازت دیں تو میں گھر پر اس موضوع پر کام کروں"
"جیسے تمہاری مرضی۔ اصل چیز تو کام ہے۔ جگہ کی کوئی پابندی نہیں۔ دفتر یا گھر' جو تمہیں سوٹ کرے"
فطرت نے اس تصویر پر بہت محنت کی۔ پہلے تو وہ اس کے متعلق سوچتا رہا۔ اس نے امریکہ' یورپ اور سعودی عرب دیکھے تھے۔ ان ملکوں کا اپنا حسن تھا لیکن اس کے خیال

میں جو قدرتی حسن اور اس کا تنوع اللہ تعالی نے پاکستان کی ودیعت کیا تھا وہ کسی اور ملک کو نصیب نہیں۔ اس میں اونچے پہاڑ ہیں۔ جن میں یہ پہلا سلسلہ بھورے رنگ کے پہاڑوں کا ہے۔ اس کے پیچھے کالے سیاہ پہاڑ ہیں اور ان کے پیچھی آسمان کو چھوتے ہوئے برف پوش پہاڑ ہیں۔ سفید اور بے داغ پہاڑ۔ اگر پہاروں سے اتر کر نیچے کی طرف سفر کیا جائے تو لہلہاتے کھیت' وسیع ریگستان اور پھر سمندر کا کنارہ۔ کتنے دیس ہیں جنہیں اللہ تعالی نے اتنے حسین مناظر سے نوازا ہے۔ یہ سوچ کر فطرت کے دل میں شدید خواہش پیدا ہوئی کہ وہ کسی طرح ان سارے حسین مناظر کو ایک کینوس پر جمع کر سکے۔ اوپر کھلا آسمان ہو۔ صاف' نیلا' کشادہ' آسمان' نیچے آسمان کو چھوتے ہوئے پہاڑ اور پھر دوسرے مناظر۔

فطرت نے بڑی سوچ بچار کے بعد ۵x۳ کے کینوس پرایک تصویر بنائی جس کا درمیانی حصہ سرسوں کے لہلہاتے کھیت پر مشتمل تھا۔ لہلہاتا کھیت' سونا ہی سونا۔ آنکھوں کو طرز طراوت اور روح کو حرارت بخشنے والا۔ کھیت سے پرے بیک گراوٴنڈ میں پہاڑ تھے' بھورے کالے اور برف پوش پہاڑ۔ فور گراوٴنڈ میں کھیت سے پہلے دو پتلی پتلی لکیریں تھیں جن میں سے ایک صحراوٴں کی نمائندگی کرتی تھی اور دوسری سمندر کے کنارے کی۔

فطرت اپنی اس تخلیق پر بہت خوش تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ جو کچھ وہ Visualise کر رہا تھا اسے وہ کامیابی کے ساتھ کینوس پر منتقل کر سکا ہے۔ اس نے تصویر کے فنی اور تکنیکی پہلووٴں پر تنقیدی نظر ڈالی اور اسے کوئی نقص نظر نہ آیا۔ اس کا خیال

تھا کہ فن کے اساتذہ کو چھوڑ کر شاید ہی کوئی آرٹسٹ اتنی انوکھی' اتنی متوازن اور اتنی پختہ تصویر بنا سکے۔

وہ یہ تصویر ساتھ لے کر بڑے ارمانوں سے ڈی جی صاحب کے پاس گیا انھوں نے تصویر کو دور سی دیکھتے ہی کہا:

"فطرت صاحب! اپنے گاوٴں کے کھیت کی تصویر اٹھا لائے ہو"

"جی ہاں! بنیادی طور پر ہے تو گاؤں کا کھیت ہی' لیکن آپ اسے ایک نظر دیکھ لیں شاید آپ کو اس میں کچھ اور بھی نظر آ جائے"

URDU4U.COM

"لائیے"

فطرت نے دیوار کے ساتھ یہ تصویر کھڑی کر دی۔

ڈی۔ جی اور فطرت الگ الگ زاویئے سے اس کا جائزہ لینے لگے فطرت تبصرے کا منتظر رہا۔

ڈی۔ جی صاحب نے کہا "شاید دو تبدیلیوں کے بعد یہ تصویر مطلوبہ معیار پر پوری اتر سکے"

"جی وہ کون سی؟"

"پہلی بات تو یہ ہے کہ اب سرسوں پاکستان کی پرنسپل کراپ (بڑی فصل) نہیں رہی' اس کی جگہ کاٹن نے لے لی ہے۔ جن کی بیرون ملک بہت مانگ ہے تم نے سنا ہو گا کہ ہم لاکھوں کانٹھیں ہرسال برآمد کرتے ہیں۔ اگر تم سرسوں کے پیلے پھول ہٹا کر کپاس کی سفیدی پھٹیاں بنا دو تو شاید اس تصویر کو دیکھ کر بعض ممالک کاٹن کے مزید آرڈر بھیج دیں۔ اس تصویر میں دوسری کمی یہ ہے کہ اس سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ ہم دقیانوسی طریقوں کو چھوڑ کر Mechanized farming (مشینی طریقہ کاشت) اپنا چکے ہیں۔ اگر تم کھیت کے درمیان میں بجلی کا کھبا' کشادہ سی سڑک یا جاپانی ٹریکٹر دکھا دو تو یہ تصویر اپ ٹو ڈیٹ (Up-to-date) ہو جائے گی ورنہ موجودہ حالت میں تو یہ تصویر تقسیم ہند سے پہلے کی لگتی ہے۔؟Don't you agre (آپ اتفاق کرتے ہیں مجھ سے)"

یہ تبصرہ سن کر فطرت کا دل جل جل کر راکھ ہو گیا۔ اس نے کسی قسم کی وضاحت کے بغیر تصویر اٹھا لی اور باہر آ گیا۔

ڈی۔ جی صاحب کی آواز آئی "اگر میری ہدایت کے مطابق تم اس تصویر پر نظر ثانی کر لو تو تمہیں پہلا یا دوسرا انعام دلوا دوں گا"

فطرت واپس اپنے کمرے میں آ کر سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

اگلے مہینے اس سلسلے کا تیسرا واقعہ ہو گیا۔
ماہ رمضان کا چاند نظر آیا تو اوپر سے حکم ہوا کہ ایک ایسا عید کارڈ ڈیزائن کیا جائے جو خوشی کے اس موقع پر وزیراعظم صاحب اندرون ملک چیدہ چیدہ اشخاص کو اور بیرون ملک مسلم سربراہوں کو بھیج سکیں۔ پہلے تو یہ کہیں راستے میں ہی اٹکا رہا۔ لیکن جب عید کو صرف تین دن رہ گئے تو ڈی۔ جی صاحب نے فطرت کو بلا کر یہ کام اسے سونپ دیا اور ساتھ ہی یہ تاکید بھی کر دی کہ کل صبح تک ڈیزن تیار ہو جانا چاہیے کیونکہ وقت کم ہے اور ابھی اس کی منظور اور طباعت کے مراحل باقی ہیں۔
فطرت نے پوچھا "کوئی خاص ہدایت؟"
"بس اسب ات کا خیال رکھنا کہ یہ اشتراکی نہیں اسلامی مملکت ہے اور اسلام کا حکم ہے کہ اپنی خوشیوں میں غریبوں اور مسکینوں کو بھی شامل کیا کرو"
"ٹھیک ہے' سر"
فطرت آدھی رات تک ڈیزائن سوچتا رہا۔ اس کے ذہن میں کئی خاکے آئے جو اس نے خود ہی رد کر دیے۔ بالا آخر ایک آئیڈیا اسے پسند آیا جو فطرت کی اپنی سوچ کے بھی قریب تھا اور ڈی۔ جی صاحب کی ہدایت پر بھی پورا اترتا تھا۔ اس نے فوراً اس تخیل کو کاغذ پر منتقل کرنا شروع کر دیا۔ ادھر صبح کی اذان ہوئی ادھر فطرت نے ڈیزائن تیار کر لیا۔
عید کارڈ کا یہ ڈیزائن بہت سادہ مگر بہت بامقصد تھا۔ اس میں مغربی افق پر ہلالعید دکھا گیا تھا۔ پس منظر میں خوشی اور انبساط کی نمائندگی کرنے والے رنگ تھے۔ فوراً گراؤنڈ (Foreground) میں دائیں جانب ایک بیچہ مصلے پر بیٹھا نماز پڑھ رہا تھا اور ہلال عید کی طرف دونوں ہاتھ اٹھا کر کہہ رہا تھا ہائے ابا"
فطرت کے خیال میں یہ ڈیزائن مطلبہ مقصد بھی پورا کرتا تھا اور خالص اسلامی روایت میں سادہ اور بامعنی بھی تھا۔
وہ صبح نو بجے کے قریب یہ ڈیزائن لے کر ڈی۔ جی صاحب کے پاس چلا گیا۔ انہوں

© Urdu4U.com

نے ڈیزائن دیکھے بغیر کہا:

"بھئی دیر کر دی' جلدی بھاگو' پی ایم۔ ہاؤس وزیراعظم کے سیکرٹری ڈیزائن کا انتظار کر رہے ہیں۔ دو دفعہ فون آ چکا ہے ان کا"

"آپ ایک نظر دیکھ لیتے تو اچھا تھا"

"بھئی آرٹسٹ تم ہو' بریفنگ میں نے تمہیں دے دی ہے۔ اب میں اس میں کیا مسالہ ڈالوں گا۔ بھاگو اور لے جاؤ پی۔ ایم کے سیکرٹری کے پاس' ان کا پھر فون آنے والا ہو گا"

فطرت نے اپنی گہرے نیلے رنگ کی فوکس ویگن نکالی اور تیز تیز چلاتا ہوا پی۔ ایم ہاؤس پہنچ گیا۔ اسے پی۔ ایم کے سیکرٹری صاحب کے پی۔ اے کے پاس بٹھا دیا گیا۔ اس نے دو تین مرتبہ اپنے مشن کی اہمیت اور وقت کی قلت کا ذکر کیا تو اسے کہا گیا "آپ آرام سے بیٹھیں سیکرٹری صاحب فارغ نہیں ہیں"

کوئی دو بجے کے قریب فطرت کو سیکرٹری صاحب تک رسائی حاصل ہوئی۔ اس نے ڈیزائن پیش کیا تو سیکرٹری صاحب آگ بگولہ ہو گئے انہوں نے غصے سے کہا:

"اگر میں یہ ڈیزائن پی۔ ایم صاحب کو دکھا دوں تو ...... کیا نام ہے تمہارا؟ ...... تمہارے سمیت تمہارا ڈی۔ جی سب لوگ گھر بھیج دیئے جائیں۔ بلکہ ادرۂ شناخت پاکستان کو ہی بند کر دیا جائے۔"

فطرت خاموش کھڑا رہا۔

سیکرٹری صاحب کا غصہ ابھی ٹھنڈا نہ ہوا تھا۔ انہوں نے کہا:

"ادراۂ شناخت پاکستان کو اتنا بھی علم نہیں کہ یہ خوشی کا موقع ہے کھانے پینے اور خوشیاں منانے کا دن ہے۔ اس میں حرف شریف' مینارے' آیت کریمہ کہاں لے آئے ہو۔ بیچ میں یتیم بچہ ٹھونس دیا ہے۔ حد ہوتی ہے ہر چیز کی۔ عید کارڈ پر بھی مذہب' مذہب' مذہب ...... تمہیں یہ سب کچھ بنانے کو کس نے کہا تھا"

ڈی۔ جی صاحب نے بریف کیا تھا"

اس کے بعد سیکرٹری صاحب نے ڈی۔ جی کو برا بھلا کہتے ہوئے انہیں فون کیا کہ "آپ نے یہ کیا بنوا کر بھجوا دیا"

URDU4U .COM

ڈی۔ جی صاحب صاف مکر گئے۔

انہوں نے جواب دیا "میں نے ڈیزائن دیکھا ہی نہیں' پتہ نہیں یہ لونڈا کیا بنا کر لے گیا آپ کے پاس"

"لیکن یہ کہتا ہے کہ بریفنگ آپ نے کی تھی اس کی"

"بکتا ہے' کل کے لونڈے ڈائریکٹر بن کر آ جاتے ہیں' اپنی غلطی تک تسلیم نہیں کرتے جھٹ دوسروں پر ذمہ داری ڈال دیتے ہیں۔ آپ بھیج دیجئے اسے واپس' سر میں اسے ٹھیک کرتا ہوں Sorry, sir, for inconvenience (تکلیف کی معافی چاہتا ہوں)"

سیکرٹری صاحب نے فطرت کو واپس کرتے ہوئے کہا:

"جاؤ یہ ڈیزائن اپنے ڈی۔ جی کے منہ پر دے مارو۔ اسے دوبارہ بناؤ شام سے پہلے پہلے اور اس میں عوام ڈالو' عوام' عید پڑھتے' گلے ملتے' خوشیاں مناتے' عوام ہی سرچشمہ ہیں اس ملک کی طاقت کا صرف عوام' مذہب کی ایل ایس ڈی (نشہ آور گولی) مت کھلاؤ انہیں۔ مذہب ہر ایک کا ذاتی معاملہ ہے۔ او' کے؟"

"یس سر"

فطرت واپس اپنے دفتر پہنچ کر سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کا قصور کیا ہے؟ سرکاری کاموں کی حد تک وہ ٹھیک ٹھاک چل رہا تھا لیکن غیر سرکاری اور اضافی کاموں کے لئے ہر طرف اسے جھاڑیں پڑ رہی تھیں۔ قبل اس کے کہ فطرت کسی نتیجے پر پہنچتا شمسی پھرتا پھراتا اس کے پاس چلا آیا۔ کہنے لگا

"کیوں بھئی' بڑے فلسفیانہ موڈ میں بیٹھے ہو' خیریت تو ہے؟"

"بس یونہی"

"یار مجھ سے بھی چھپاؤ گے تو بوجھ کس کے سامنے ہلکا کرو گے۔ بولو کیا بات ہے؟"

"شمسی' تم نے بچپن میں آٹا پیسنے کی چکی دیکھی ہو گی جس کی چمنی کے ساتھ ایک ڈبہ

بندھا ہوتا تھا اور جب چکی چلتی تھی تو اس ڈبے سے پھک پھک کی تیز آواز نکلتی تھی"

"ہاں! یہ ہمارے بچپن کا عام سین تھا"

URDU4U.COM

"اور تم نے اینٹوں کے بھٹے کی چمنی بھی دیکھی ہو گی جو چپ چاپ آسمان کی طرف منہ اٹھائے دل کا غبار دھوئیں کی شکل میں اوپر پھینکتی رہتی ہے"

"ہاں' ایسی چمنیاں اسلام آباد کے اردگرد بھی نظر آتی ہیں۔ لیکن تم کہنا کیا چاہتے ہو"

"میں محسوس کرنے لگا ہوں کہ میں ایک ایسی چمنی میں بدل گیا ہوں جو نہ آٹا پیسنے والی چکی کی طرح پھک پھک کر سکتی ہے اور نہ بھٹے کی چمنی کی طرح دھواں باہر پھینک سکتی ہے۔ بس ہر شے اندر ہی اندر' ہر غم اندر' ہر اندوہ اندر' سہتے رہو' سلگتے رہو' مگر بولو مت' کہو مت'

لیکن فطرت یہ صرف تمہارا مسئلہ تو نہیں' یہ تو ہر انسان کا مسئلہ ہے۔ اپنے اپنے حالات میں' اپنی اپنی جگہ' ہر شخص تنگ ہے' پریشان ہے' اداس ہے"

"میں کب کہتا ہوں کہ میں اس عذاب میں تنہا ہوں یا صرف میرے اندر جہنم دھک رہا ہے میں تو زندگی کے بارے میں عام بات کر رہا ہوں۔ تمہیں یوں محسوس نہیں ہوتا کیا؟

"ہوتا ہے۔ میں بھی بنیادی طور پر آرٹسٹ ہوں۔ لیکن مجھے عملی زندگی کا آغاز کئے دس سال ہو گئے ہیں۔ میں اپنا رویہ خاصی حد تک بدل لیا ہے۔ بہت آرام سے ہوں"

"ہاں لاہور میں پروفیسر سعید بھی یہی مشورہ دیتے تھے۔ میں ان کے کہنے پر کچھ عرصہ گاؤں بھی چلا گیا تاکہ ہنگاموں سے دور کر اندر کی بتی کو گل کر دوں' ضمیر کے کیڑے کو مسل دوں۔ لیکن میرے اندر کوئی ایسی شے ہے جو مجھے مصالحت یا Compromise کرنے نہیں دیتی۔ میں اس بے نام' بے نشان' بے وجود شے کی تشریح نہیں کر سکتا۔ میں اس کا نام لے کر اس کی شناخت بھی نہیں کر سکتا لیکن کچھ ہے۔ اسے تخلیقی آگ کہہ لو' اسے آرٹ سے میری کومٹ منٹ کہہ لو' اسے ضمیری کی چبھن سمجھ

لو' اسے انا یا عزت نفس کہہ لو۔ کچھ بھی نام دے لو' لیکن ایک تڑپ ہے' ایک لگن ہے' ایک آگ ہے جو مجھے سرینڈر (Surrender) کرنے نہیں دیتی۔ پتہ نہیں کیوں مجھے محسوس ہوتا ہے کہ اگر میں نے سرینڈر کر دیا تو میری پیدائش کا مقصد فوت ہو جائے گا۔ مشیت الٰہی کی نفی ہو جائے گی۔ میرا وجود ختم ہو جائے گا"

یہ سب باتیں اپنی جگہ صحیح ہیں۔ لیکن یاد رکھو تم ایک بیوی کے شوہر اور دو ننھے بچوں کے باپ ہو۔ تمہاری کچھ ذمہ داریاں ہیں جنہیں پورا کرنے کے لئے تم نے زندہ رہنا ہے' نوکری کرنا ہے"

"وہ تو کر رہا ہوں"

"اسے نوکری کرنا کہتے ہیں؟ ڈی ڈی جی سے تمہاری لڑائی' ڈی۔ جی صاحب سے تمہاری ان بن' بوس کا بھتیجا پینٹ کرے اور تم فتویٰ دے دو کہ اسے پینٹنگ کی ابجد نہیں آتی۔ وزیر اور سیکرٹری کا بھیجا ہوا امیدوار ملازمت کے لئے آئے اور تم سب کو ٹیسٹ میں فیل کر دو۔ بوس تمہیں آرٹ کونسل کی تقریر لکھنے کو کہے اور تم انکار کر دو۔ یہ نوکری کرنے کے طریقے ہیں"

"ٹھیک ہے شمسی' انہوں نے مجھے نکالنا ہے تو نکال دیں۔ تنگ کرنا ہے تو کر لیں لیکن میں ٹین کے خالی کھمبوں کو صرف اس لئے سلام نہیں کر سکتا کہ وہ قد میں مجھ سے اونچے ہیں"

جوں جوں دفتری اور گھریلو محاذ پر دباؤ بڑھتے گئے' فطرت اپنا زیادہ سے زیادہ وقت اپنے پرائیوٹ سٹوڈیو میں گزارنے لگا۔ جس میں لکھنے پڑھنے کی ایک میز اور اس کے ساتھ ایک کرسی پڑی تھی پینٹ وغیرہ رکھنے کے لئے ایک الگ میز نما پھٹا رکھا تھا جس پر کچھ تازہ اور کچھ سوکھے پینٹ پڑے تھے۔ پینٹ کی چھوٹی موٹی ٹیوبز (Tubes) بھی اس پر پڑی رہتی تھی۔ بیک وقت الگ الگ ایزل پر دو تین کینوس رکھے تھے جن پر فطرت کام کر رہا تھا۔ اس کے علاوہ کتابوں کی ایک الماری جس کے نیچے کے چار شیلف کتابوں

سے بھرے ہوئے تھے اور اوپر والے شیلف میں کینوس کا کپڑا' فریم کے لئے لکڑی کی پھٹیاں اور کچھ رنگ اور برس تھے۔

URDU4U.COM

سٹڈی ٹیبل کی دراز میں وہ ٹیپ ریکارڈر تھا جو فطرت نے فیصل آباد والی جائیداد فروخت کرنے کے بعد خریدا تھا۔ وہ رات کو پینٹ کرتے کرتے جب تھک جاتا تو یا تو کوئی کتاب نکال کر پڑھنے لگتا یا پھر کیسٹ لگا کر اپنی پسند کا کوئی مغموم گانا یا غزل سننے لگتا۔ وہ زیادہ پریشان ہوتا تو ایک علیحدہ کیسٹ میں اپنی پریشانیاں ریکارڈ کرتا جاتا تاکہ اس کا اپنا بوجھ ہلکا ہو جائے اور کسی دوسرے شخص کو پتہ نہ چلے۔ وہ عموماً ٹیپ ریکارڈر اور کیسٹ وغیرہ دراز میں رکھ کر تالا لگا دیا کرتا تھا۔

اسی سٹوڈیو میں سردیوں کی لمبی راتوں میں اس نے بہت سی ایسی تصویروں پر کام کیا جو ایک عرصے سے اس کے ذہن میں کلبلا رہی تھیں۔ کچھ زمانہ طالب علمی کے وقت کی تصویریں تھیں جو وہ ایم۔ اے کے امتحان کے لئے بنانا چاہتا تھا اور نہ بنا سکا تھا کچھ پاکستان کے حوالے سے اس کے مشاہدات اور احساسات کا نچوڑ تھا۔ کچھ ان گوالوں' بھنگیوں اور جھگیوں کی تصویریں تھیں جو سیلاب میں بہہ گئی تھیں اور کچھ وہ تصویریں جو اس نے پاشا صاحب کی اشتہاری مہم کے لئے سوچی تھیں لیکن پاشا صاحب سے لڑائی کی وجہ سے نامکمل رہ گئی تھیں۔

اک دن حسب معمول وہ رات کے کھانے کے بعد اپنے سٹوڈیو میں چلا گیا۔ سردیوں کی رات تھی اور گھر میں صرف ایک ہیٹر تھا جو اس نے زبیدہ اور بچوں کی سہولت کے لئے بیڈ روم میں لگا دیا تھا اور خود کمبل کی بکل اوڑھ کر پینٹ کرنے کے ارادے سے علیحدہ کمرے میں آ گیا تھا۔ لیکن زبیدہ عمر کے ایسی دور میں تھی جب اسے ہیٹر کی بجائے فطرت کی زیادہ ضرور تھی۔

فطرت سٹوڈیو میں کرسی پر بیٹھا کچھ سوچ رہا تھا۔ اس کا پینٹ کرنے کا طریقہ بھی عجیب و غریب تھا۔ پہلے وہ ایزل پر خالی کینوس سجا کر اسے غور سے دیکھتا رہتا سوچتا رہتا' تصویر کے خدوخال اپنے ذہن میں واضح کرتا رہتا اور پھر پنسل یا برش استعمال کئے بغیر تخیلی

تصویر کو خیال ہی خیال میں کینوس پر منتقل کرنے لگتا اور جب اس کے خیال کے مطابق تصویر کا واضح حلیہ خالی کینوس سے ابھرنے لگتا تو وہ پنسل یا برش لگا کر اس تصویر کو نمایاں کر دیتا۔ یوں ایک دفعہ آؤٹ لائن یا خاکہ تیار ہو جاتا تو پھر چھوٹی چھوٹی جزئیات بھر کر وہ رفتہ رفتہ تصویر کو مکمل کرتا رہتا۔

فرخ اور حنا گرم کمرے میں سو گئے لیکن زبیدہ کو نیند نہیں آ رہی تھی وہ بیڈ روم سے نکل کر سٹوڈیو میں آ گئی اور فطرت کو یوں خیالوں میں محو دیکھ کر کہنے لگی:

"اتنے چپ چپ کیوں ہو"

"کیا مجھے چپ رہنے کا بھی حق نہیں"

یہ فقرہ زبیدہ کے سرف کے اوپر سے گزر گیا۔ اس نے کہا

"تم سے ایک ضروری بات کرنا تھی"

فطرت نے خیالوں کی پوٹلی الگ رکھ کر کہا

"جی فرمایئے' کیا حکم ہے"

"مجھے فرمایئے فرمایئے والا مذاق اچھا نہیں لگتا۔ میں یہ کہنے آئی تھی کہ انگلش سکول میں فرخ کے داخلے کا کیا ہوا؟

"بتا تو چکا ہوں کہ وہ وہاں داخل نہیں ہو سکتا"

"کیوں"

"وہ ان کے ٹیسٹ میں فیل ہو گیا ہے"

"پہلی جماعت بلکہ کچی پہلی کی بات ہے' فیل پاس کا تو صرف چکر ہے' رضوی صاحب' رحیم صاحب' طفیل صاحب' نیازی صاحب کیا ان سب کے بچے عالم فاضل ہیں جو داخل ہو گئے۔ سفارش چلتی ہے' اوپر سے ٹیلی فون آیا اور بچے داخل ہو گئے۔ تمہارا تو رعب ہی کوئی نہیں۔ میں اپنے بچے کو یوں گلیوں میں کھلنڈرا بنتے نہیں دیکھ سکتی"

"یعنی سارے محلے کے بچے جائیں انگریزی سکول میں اور میرا فرخ جائے ٹاٹ والے سکول میں"

"میں یہ بے عزتی برداشت نہیں کر سکتی"
"اس میں بے عزتی کی کوئی بات نہیں"
"بے عزتی کی بات ہے۔ تمہیں تو ادیبوں اور آرٹسٹوں کے ساتھ گھومنے پھرنے کے سوا کوئی کام ہی نہیں۔ تمہارے اندر تو غیرت ہی مر گئی ہے۔ میری طرح محلے میں رہو' لوگوں سے ملو تو پتہ چلے کہ دنیا کہاں سی کہاں پہنچ چکی ہے سب کے گھروں میں گیس کے ہیٹر ہیں۔ بیٹھک میں الگ' سونے کے کمرے میں الگ' عورتیں گرم کوٹ اور قیمتی شالیں لے کر پھرتی ہیں اور میں دو گرم چادروں میں پچھلے تین سالوں سے گزارہ کر رہی ہوں۔ میں تو گھر سے باہر بھی نکل سکتی۔"
"کیوں"
"ایک ہی گرم چادر اوڑھ کر میں کتنی مرتبہ کسی کے گھر جا سکتی ہوں۔ اتنا بھی نہیں کرتے کہ ہر مہینے ایک آدھ شال ہی خرید دیا کرو"
"زبیدہ کیا کہہ رہی ہو' گھر کا سارا بجٹ تمہارے سامنے ہے۔ ہر مہینے نئی شال کے لئے پیسے کہاں"
"ہاں ان نیلے پیلے رنگوں' لکڑی کے پھٹوں' کینوس کے کھردرے کپڑوں اور دوسری الا بلا کے لئے تمہارے پاس پیسے نکل آتے ہیں لیکن بیوی کی چادر کے لئے تمہارے پاس کچھ نہیں"
"یہ الا بلا چھوڑ دوں؟" فطرت نے کہا
"ضرور چھوڑ دو۔ جب سے آئے ہو' تمہاری ایک تصویر بھی تو نہیں بکی۔ کبھی امجد صاحب کو پیش کر دی۔ کبھی کمال صاحب اٹھا کر لے گئے۔ کبھی کسی کو خوش کر دیا' کبھی کسی کو' بس اک بیوی بیچاری ہے جس کی خوشی کا تجھے کوئی خیال نہیں"
"تو چھوڑ دوں یہ سب کچھ؟"
"میں تو یہی کہنے آئی تھی کہ تم نے گھر میں ایک کمرہ خواہ مخواہ خراب کیا ہوا ہے' کوئی مہمان آ جائے تو چارپائی بیٹھک میں ڈالی پڑتی ہے۔ کہو' تو کل یہ سب کچھ اٹھا

کر جمعدار کو دے دوں۔ اور صفائی کر کے اپنی شادی والا نواڑی پلنگ یہاں بچھا دوں"
فطرت کے اند ر ایک زبردست ابال آیا:
"زبیدہ خدا کے لئے کچھ خیال کرو میرے لئے باہر بہت سے دباؤ ہیں۔ تم اس گھر کو تو پریشر ککر نہ بناؤ' پریشر ککر"
"اس گھر کی قسمت میں پریشر ککر کہاں' میں تو گاؤں میں بھی گیلی لکڑی پھونکتی رہی یہاں بھی مٹی ہانڈی میں ڈوئی ہلاتی رہتی ہوں۔ ککر ہو تو میرا کام کتنا آسان ہو جائے"
زبیدہ کا یہ رویہ فطرت کو پاگل بنانے کے لئے کافی تھا لیکن وہ ہر بات سہہ گیا اس نے حسب معمول کمبل کی بکل ماری' کانوں کے گرد مفلر لپیٹا اور آدھی رات کو اسلام آباد کی سنسان سڑکوں پر نکل گیا۔
زبیدہ کو پتہ تھا کہ وہ گھوم پھر کر رات کے کسی نہ کسی حصے میں یا صبح تک واپس آ جائے گا۔ اس لئے اس نے یوں اچانک باہر نکل جانے پر اسے نہ پہلے کبھی ٹوکا تھا اور نہ آج روکا۔
فطرت اپنے غم اپنی بکل میں چھپائے موسم سرما کی ٹھنڈی رات کو اسلام آباد کی سڑکوں پر پھرتا رہا۔ اور صبح کی اذان سے ذرا پہلے واپس گھر آ گیا۔

ایک دن اچانک فیصل آباد سے فطرت کا پرانا کلاس فیلو نواز پہنچ گیا۔ جو اس کے ساتھ کافرستان بھی جا چکا تھا اور فطرت کے قریبی دوستوں میں شمار ہوتا تھا' فطرت اسے خندہ پیشانی سے ملا۔ اس کی خاطر تواضع کی۔ اسے اپنے پاس ٹھہرایا اور اس کے آنے کا مقصد پوچھا تو اس نے کہا:
"یار سچ پوچھو تو آیا تو کام سے ہی ہوں"
"ہاں' ہاں' کہو؟"
"یار' تمہیں معلوم ہے نا' کہ ہمارا ٹرانسپورٹ کا کاروبار ہے۔ آج کا نہیں کئی سالوں سے ہے لیکن اب سرگودھا ڈویژن میں نئے ڈی۔ آئی۔ جی (ٹریفک) آئے ہیں' میری سمجھ

میں نہیں آتا کہ یہ شخص چاہتا کیا ہے۔ ہم نے ہر طرح اسے خوش کرنے کی کوشش کی ہے لیکن وہ کسی طرح قابو نہیں آتا"

URDU4U.COM

"مسئلہ کیا ہے؟"

"مسئلہ یہ ہے کہ ہماری جو گاڑی اڈے سے نکلتی ہے' فٹ چالان کر دیتا ہے"

"وہ ہر وقت کہاں ہوتا ہو گا"

"اس نے خود چالان کیا کرنا ہے۔ اس کے چمچے ہیں۔ ایس' ایس پی ٹریفک ہے۔ ٹریفک انسپکٹر ہے۔ ٹریفک سارجنٹ ہے۔ پتہ نہیں کیوں وہ سب ہمارے پیچھے پڑ گئے ہیں۔ فٹ چالان' فٹ جرمانہ بلکہ دو ایک تو ہمارے روٹ پرمٹ بھی معطل کر دیئے ہیں۔ وہ تو ہماری روزی پر لات مار رہا ہے"

"میرے لائق کیا حکم ہے" "بس یار' اونچی جگہ پر بیٹھے ہو' اسلام آباد میں رہتے ہو' کوئی ٹیلی فون وغیرہ کھڑکاؤ تاریں ہلاؤ' اس الو کے پٹھے کو ایسی ڈانٹ پلواؤ کہ چھٹی کا دودھ یاد آ جائے اسے"

فطرت سوچ میں پڑ گیا۔ اس نے اپنا دماغ ہر طرف دوڑایا۔ لیکن اسے کوئی دوست یا واقف کار نظر نہ آیا۔ جیسے وہ یہ کام سونپ سکے۔ اسے کہا

"یار نواز' تم پہلی دفعہ کام لے کر آئے ہو اور وہ بھی ایسا' جس کا تعلق وفاقی حکومت سے نہیں صوبے سے ہے"

"ہاں تو لاہور آئی۔ جی پولیس کو ایک فن یہاں سے چلا جائے تو ڈی آئی جی سیدھا ہو جائے گا۔"

"لیکن یار برا نہ ماننا 'سچی بات یہ ہے کہ میرے واقفوں میں ایسا کوئی شخص نہیں جو میرے کہنے پر آئی جی کو لاہور فون کر سکے"

نواز مایوس ہو کر واپس فیصل آباد چلا گیا۔

کچھ دنوں کے بعد فطرت کا سب سے گہرا دوست ارشد پہنچ گیا۔ دونوں بڑی تپاک سے

ملے۔ بیتے دنوں کا ذکر کرتے رہے۔ مشترکہ دوستوں کی موجودہ مصروفیات کے بارے میں باتیں ہوتی رہیں۔

جب تمہیدی گفتگو ختم ہو گئی تو ارشد نے کہا۔

URDU4U.COM

"پچھلے دنوں نواز یہاں سے ہو کر گیا تھا۔ اس نے بتایا کہ تم نے اس کے لئے بڑی کوشش کی لیکن اس کا کام نہیں ہو سکا کیونکہ اس کا تعلق صوبائی حکومت سے تھا اور تم نے کہا تھا کہ اگر وفاقی حکومت میں یعنی اسلام آباد میں کوئی کام ہو تو تم مدد کر سکتے ہو۔"

"خیر میں نے یہ تو نہیں کہا تھا لیکن تم بتاؤ کام کیا ہے"

"پارٹنر تمہیں پتہ ہے کہ ہمارا ٹیکسٹائل کا بڑا پرانا کاروبار ہے۔ ہمارے پاس جو ایکسپورٹ لائسنس ہے اس کے تحت ہم صرف دو کروڑ روپے کا مال ہر سال برآمد کر سکتے ہیں۔ یہ حد کئی سال پہلے مقرر ہوئی تھی۔ اب ہماری پروڈکشن بڑھ گئی ہے اور اندرو ملک اور ملیں لگنے سے پاکستان میں ہمارے مال کی مانگ کم ہو گئی ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ یا تو دو کروڑ روپے کی حد بڑھا کر پانچ سات کروڑ روپے کر دی جائے یا ہماری ایک علیحدہ چھوٹی سی فرم ہے اس کے نام ایک علیحدہ ایکسپورٹ لائسنس مل جائے۔ بلکہ یہ ہو جائے تو اچھا ہے تاکہ اگر کسی مرحلے پر کسی وجہ سے ایک لائسنس منسوخ ہو جائے تو کاروبار بالکل ہی ٹھپ نہ ہو جائے۔"

فطرت نے ارشد کے مسئلے میں گہری دلچسپی لی۔ رات کو اپنے گھر ٹھہرایا اور اگلے روز اسی اپنی فوکسی میں بیٹھا کر اپنے ساتھ دفتر میں لے گیا۔

اس نے ارشد کے سامنے کئی لوگوں کو فون کیے جو اس کے خیال میں اس بارے میں مدد کر سکتے تھے۔ لیکن کسی نے خاص پروا نہ کی۔ دراصل فطرت کی واقفیت بھی زیادہ تر ادیبوں شاعروں اور مصوروں سے بھی جو اس میدان میں بالکل کورے تھے۔

ارشد دفتر میں بیٹھا چائے اور سگریٹ پیتا رہا اور فطرت کی کوششوں کا جائزہ لیتا رہا۔

جب ایک گھنٹے کی مسلسل کوشش کے بعد فطرت نے ہار مان لی تو ارشد نے کہا

 © Urdu4U.com

"کوئی بات نہیں یار، تم نے کوشش تو کی۔ میرے لئے یہی بہت ہے۔ تھینک یو"
وہ بھی واپس فیصل آباد چلا گیا اور نواز کی طرح پھر فطرت سے کبھی نہ ملا۔

URDU4U.COM

اس طرح فطرت کے جو بھی پرانے دوست کسی نہ کسی کام کے سلسلے میں اس کے پاس آئے مایوس ہو کر چلے گئے۔ کچھ تو کام ہی ناجائز ہوتے تھے جن میں فطرت ہاتھ نہیں ڈالنا چاہتا تھا اور جن جائز کاموں کے لئے وہ کوشش کرتا تھا ان میں بھی ناکام ہو جاتا تھا۔ رفتہ رفتہ اس کے پرانے احباب میں یہ تاثر عام ہو گیا کہ "فطرت کسی کا کام نہیں کرواتا، فضول آدمی ہے، بیکار ہے، مغرور ہے"
پرانے دوستوں کے کٹ جانے سے فطرت کے گرد تنہائی کا شور اور شدید ہو گیا۔

اسلام آباد میں فطرت کا حلقہ احباب زیادہ وسیع نہ تھا، مقامی یونیورسٹی کے دو تین استاد کسی تقریب میں اس کے واقف بن گئے تھے ایک آدھ ادبی محفل میں چند ایک ادیبوں شاعروں سے تعارف ہو گیا تھا اور بس دفتری حوالے سے اس کے پاس عموماً مقامی نو عمر فنکار اس امید پر آتے رہتے تھے کہ شائد کبھی فطرت کی وساطت سے انہیں سرکاری سرپرستی مل جائے۔ کسی وفد میں نام پڑ جائے یا کمرشل پینٹنگ کا کوئی چھوٹا موٹا کام مل جائے۔
ان معدودے چند دوستوں کے بارے میں بھی فطرت کے اعلیٰ افسروں کا رویہ خاصا مخاصمانہ تھا۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ فطرت فنی، ثقافتی یا ادبی حلقوں میں مقبول ہو جائے۔ چنانچہ جونہی دو چار احباب ملنے کو آتے، ڈی۔ جی صاحب یا ڈی۔ جی صاحب کی گھنٹی بجتی۔ فوراً چپڑاسی آ کر پیغام دیتا "صاحب بلا رہے ہیں"
وہ یوں اسے بلا کر بلا وجہ اپنے سامنے بٹھا لیتے اور لایعنی قسم کے سوال پوچھنے لگتے جن کی فوری طور پر کوئی اہمیت نہیں ہوتی تھی۔ مثلاً یہ کہ "تین سال پہلے آڈٹ ٹیم نے جو اعتراض کیا تھا وہ بعد میں طے ہو گیا تھا یا نہیں" سنا ہے کہ عنقریب ایک غیر ملکی ثقافتی وفد پاکستان آنے والا ہے۔ شائد وہ ہماری ادارے میں بھی آ جائے۔ اس لئے

ہمیں اس کے متعلق کچھ نہ کچھ سوچ رکھنا چاہئے" یا "سنا ہے آج کل بڑے بڑے افسروں کو تحفہ تصویریں پیش کر رہے ہو۔ اپنی اچھی پی آر کر لیتے ہو۔ لیکن دفتر کا بھی خیال رکھا کرو" "سٹیشنری کی ڈیمانڈ دے دی ہے آپ نے اگلے سال کے لئے"

ایک دو دفعہ اس عز عمل کے خلاف فطرت نے آواز بھی اٹھائی لیکن بے سود ہر بار اسے یہی جواب ملتا "ڈیوٹی از ڈیوٹی"

فطرت کسمسا کر رہ جاتا' ملاقاتی دفتر میں بیٹھ بیٹھ کر چلے جاتے اور جونہی وہ گیٹ سے باہر نکلتے فطرت کے "بوس" فطرت کو فارغ کر دیتے۔

بظاہر یوں معلوم ہوتا تھا کہ فطرت میں قوت برداشت بہت ہے وہ وزیراعظم کے سیکرٹری کی جھاڑ سے لے کر زبیدہ کی تلخ باتوں تک ہر چیز سہہ رہا تھا لیکن درحقیقت ایسا نہ تھا۔ ایک ایک تلخ تجربہ اس کی رگ رگ میں سرایت کر جاتا۔ ایک ایک صدمہ گھن کی طرح اس کے اندر چمٹ جاتا۔ ایک ایک دھچکا اسے جھنجھوڑ کر رکھ دیتا۔ یہ سب غم' یہ سب اندوہ یہ سب صدمے اس کے اندر بڑھتے رہے اور یوں اس کے اندر ایک آتش فشاں پلتا رہا۔ فطرت نہ آٹا پیسنے والی چکی کی طرح صدائے احتجاج بلند کر سکتا تھا اور نہ بھٹے کی چمنی کی طرح بھڑاس نکال سکتا تھا۔

اس کا واحد ذریعہ اظہار اس کے کینوس تھے جن پر وہ اپنا سارا غصہ اتار لیتا تھا۔

انہی دنوں بزم احباب اسلام آباد کے زیر اہتمام ایک ادبی تقریب ہوئی تو حسب معمول فطرت بھی وہاں جا نکلا۔ اس کے پہنچنے سے پہلے کیف جہلمی اپنی غزل پیش کر چکے تھے اور اب پروفیسر شعیب صدیقی اپنا افسانہ پیش کرنے والے تھے۔ فطرت بھی چالیس پچاس سامعین میں جا کر بیٹھ گیا اور غور سے افسانہ سننے لگا۔ افسانے کی بنیادی کہانی ایک مرکزی کردار کے نام گھومتی تھی جس کا نام مراد تھا۔ بچپن میں مراد کی ماں فوت ہو گئی تو اس کے زمیندار باپ نے دوسری شادی کر لی۔ گھر میں روپے پیسے کی کوئی

کی نہ تھی لیکن ملک صاحب کی دوسری شادی سے مراد ماں اور باپ دونوں کی شفقت سے محروم ہو گیا۔ وہ سوتیلی ماں کے رویئے سے اتنا تنگ آیا کہ وہ گھر سے بھاگ گیا۔ پھر باقی افسانہ ان تھپیڑوں پر مبنی تھا جو زندگی کے راستے پر مراد سہتا رہا۔ کبھی کسی گھٹیا ورکشاپ میں مستری کے پاس' کبھی منڈی میں مزدور کے طور پر کبھی بسوں کے اڈے پر کلینر کی حیثیت سے اور کبھی اخباروں کے ہاکر کے روپ میں۔

جب اس افسانے پر بحث شروع ہوئی تو زیادہ تر شرکاء نے افسانے پر بحث کرنے کی بجائے پروفیسر صدیقی کے نظریات پر تبصرہ کرنا شروع کر دیا۔ وہ اس بات کو بالکل نظر انداز کر گئے کہ مراد شعیب صدیقی کا دوسرا نام نہیں ہے۔ شعیب خالق ہے اور مراد اس کی تخلیق وہ مراد کے حوالے سے معاشرتی حالات کی عکاسی کرنا چاہتا ہے نہ کہ کسی فلسفے یا نظریئے کا پروپگینڈہ بزم احباب کے آداب کے طابق پروفیسر شعیب صدیقی بحث میں حصہ نہیں لے سکتے تھے۔ لہٰذا وہ چپ بیٹھے سنتے رہے حتی کہ ناقدین اکثریت نے تقریبے مفتقہ طور پر فیصلہ دے دیا کہ پروفیسر صدیقی اشتراکی خیالات کا مصنف ہے جو مراد جیسے کرداروں کی اوٹ میں نظریہ پاکستان اور نظریہ اسلام کے خلاف نفرت پھیلانا چاہتا ہے۔ ایسے لوگ ملک و قوم کے لئے عظیم خطرہ ہیں۔ اور ہماری قوم سو رہی ہے وہ نہیں سمجھتی کہ آستین کے یہ سانپ اعلی درسگاہوں میں گھسے بیٹھے ہیں اور نئی نسلوں کے ذہن خراب کر رہے ہیں۔

اگرچہ فطرت اس قسم کی بحث میں عموماً حصہ نہیں لیتا تھا لیکن وہ شعیب صدیقی کے ساتھ یہ زیادتی ہوتے دیکھ کر خاموش نہ رہ سکا۔ اس نے کہا

صاحب صدر' میں دو نکات آپ کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں ایک یہ کہ ہمیں فکشن کو بطور فکشن دیکھنا چاہیئے۔ ہر افسانے کا ہرو یا مرکزی کردار افسانے کے مصنف کا عکس نہیں ہوتا۔ ہمارے ہاں یہ بڑا افسوس ناک رجحان بڑھ رہا ہے کہ ہم افسانوی کردار کو اس کے خالق کا ہمزاد سمجھ کر ادیب کے خلاف فتوی دینے لگتے ہیں۔ حالانکہ

 © Urdu4U.com

ہر افسانہ اپنے خالق کو آٹو بائیو گرافی (سوانح) نہیں ہوتی۔ اگر ہم نے اس تمیز کو ملحوظ نہ رکھا تو ادیبوں کے دلوں میں اتنا خوف بیٹھ جائے گا کہ وہ تخلیق سے تائب ہو جائیں گے۔

URDU4U.COM

"جناب والا' میرا دوسرا نکتہ یہ ہے کہ انسان بڑی کمپلکس (پچیدہ) چیز ہے۔ فکری اور جذباتی لحاظ سے اس کا کیمیاوی تجزیہ نہیں کیا جا سکتا۔ صاحب صدر انسان گاجر ملی نہیں ہوتے جن کے سفید اور سرخ رنگ دیکھ کر انہیں متعلقہ ڈبوں میں بند کر دیا جائے۔ انسانی شخصیت کے کئی رنگ ہوتے ہیں اور وہ بیک وقت اس کے اندر موجود رہتے ہیں ممکن ہے ایک وقت میں ہمیں اس کا سفید رنگ نظر آئے' دوسرے وقت سرخ' تیسری مرتبہ پیلا اور چوتھی مرتبہ بالکل سیاہ' قدرت نے انسان میں ان سب رنگوں کا امتزاج پیدا کیا ہے اور وہ حالات کے مطابق اپنا رنگ دکھاتا رہتا ہے۔ لہذا میرے خیال میں پروفیسر شعیب صدیقی کو یوں کمیونسٹوں کے زمرے میں ڈال دینا سراسر زیادتی ہے"

فطرت اپنی علمی اور ادبی بحث کر رہا تھا کہ پیچھے ایک جوشیلا نوجوان اٹھا ور کہنے لگا:

"سرخوں کی حمایت کرنے وال خود سرخہ ہوتا ہے۔ یہ خود ایک ایسے ادارے میں گھسا ہوا ہے جہاں ایسے شخص کا ہونا ملک و قوم کے لیے عظیم خطرہ ہے۔ ایسے لوگوں کا بھی محاسبہ ہونا چاہئے۔"

فطرت نے صاحب صدر کی اجازت سے کہا:

"آپ میرے خلاف جو چاہیں کہیں اور جس طرح چاہیں محاسبہ کرائیں لیکن مجھے ایک بات بتائیے: کیا سماجی انصاف کی بات کرنا کمیونزم ہے یا عین اسلام؟ کیا معاشرے میں غربت' افلاس' جبر تشدد اور نا انصافیوں کے خلاف آواز اٹھانا اشتر١٣اکیت ہے یا سمانی جہاد؟ کیا اسلام اس کی اجازت دیتا ہے کہ ایک انسان دوسرے انسا کے حقوقمحض اسلئے سلب لے کہ وہ طاقتور ہے۔ دولت مند ہے' با اثر ہے؟ کیا اسلام اس بات کی اجازت دیتا ہے کہ معاشرے کا ایک طبقہ تو گڑیوں کی شادی پر لاکھوں روپے خرچ کر دی اور دوسری طرف غریب بچیاں جہیز کے انتظار میں بوڑھی ہو جائیں؟ کیا یہ واقعی اسلام

کی خدمت ہے کہ ہم خود صاحب نصاب ہونے کے باوجود زکوۃ و عشرادانہ کریں لیکن دوسروں پر کفر کے فتوی صادر کرتے رہیں۔ صاحب صدر! میرے خیال میں ہمیں یہ احتیاط کرنی چاہئے کہ ہم سماجی بھلائی کی ہر کوشش کو کمیونزم یا اشتراکیت کے کھاتے میں نہ ڈالیں۔ کیونکہ اسلام خود سماجی انصاف کا دین ہے۔ اس سے بڑھ کر انسانی بہبود کا کوئی اور نظریہ حیات سامنے نہیں آیا۔ اور نہ ہی انشاء اللہ آئے گا۔ اس لئے جذات میں آ کر ہمیں اپنے دین کی اچھائیاں دوسروں کی جھولی میں نہیں ڈالنی چاہئیں۔ اور پروفیسر شعیب صدیقی جیسے ادیبوں کو یوں کھڑے کھڑے دوسرے کیمپ میں نہیں پھینکنا چاہئے۔

اگرچہ کئی اور حضرات اس بحث میں حصہ لینے کے لئے پرتول رہے تھے لیکن صاحب صدر نے وقت کی کمی کا بہانہ کر کے محفل برخاست کر دی۔

فطرت نے ادارۂ شناخت پاکستان میں اپنی نوکری کا سب سے بڑا فائدہ یہ اٹھایا کہ وہ اپنی تخلیق پیاس کو بجھانے کے لئے جو تصویریں پینٹ کرنا چاہتا تھا وہ اس نے مکمل کر لیں۔ اس نے مختلف موضوعات پر کل تیس کینوس تیار کئے لیکن جن تصویروں کو وہ اپنے فن کی معراج سمجھتا تھا وہ اٹھ نو کینوس تھے:

کینوس نمبر1

یہ تصویر جو قیام پاکستان کے حوالے سے تقسیم ہند کے ایک درد ناک منظر پر مبنی تھی دراصل چار مختلف مناظر پر مشتمل تھی جس میں انتقال آبادی کی داستان پیش کی گئی تھی ' داستان مختصرا یہ تھی کہ مشرقی پنجاب کا ایک گھرانہ جس میں میاں بیوی' ان کے والدین اور ایک نوازئیدہ بچہ شامل تھا' نئے وطن کی طرف روانہ ہوا۔ اس گھر کی ایک کتیا جس نے ابھی چند روز پہلے بچے دیئے تھے۔ ان کے ساتھ چل پڑی کتیا کے بچے یکے بعد دیگری راستے میں رہ جاتے ہیں لیکن کتیا دودھ سے بھرے ہوئے تھنوں سمیت اپنے مالکوں کے ساتھ ساتھ چلتی رہتی ہے۔ واہگہ کے پاس رات کے دن ان

پر حملہ ہوتا ہے۔ سارا خاندان راستے سے ہٹ کر جھاڑیوں میں پناہ لیتا ہے۔ لیکن حملہ آور تعاقب کر کے ان سب کو موت کے گھاٹ اتار دیتے ہیں۔ نوزائیدہ بچہ بے ہوش کر زمین پر گر پڑتا ہے۔ اور جنوبی لوگ اسی مردہ سمجھ کر چھوڑ جاتے ہیں۔ رات کی تاریکی میں کتیا اگلے پنجوں پر بیٹھ کر اس بچے پر پہرہ دیتی رہتی ہے۔ آدھی رات کے بعد جب بچہ ہوش میں آتا ہے تو بھوک سے بلبلا کر بند آنکھوں کے ساتھ ماں کے دودھ کے لئے ہاتھ پاؤں مارنے لگتا ہے اچانک اس کا ہاتھ کتیا کے تھنوں پر پڑتا ہے جو گرم گرم بھی تھے اور دودھ سے لبریز بھی۔ بچہ رینگ کر ان تھنون تک پہنچتا ہے اور بھوک اور پیاس سے مجبور ہو کر کتیا کا دودھ پینے لگتا ہے۔ کتیا مدافعت نہیں کرتی اور یوں نئی مملکت کا نوزائیدہ شہری کتیا کے دودھ کے سہارے زندگی سے اپنا رشتہ قائم رکھنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

کینوس نمبر۲

یہ تباہی کا ایک منظر ہے جو رات کے وقت پینٹ کیا گیا ہے۔ سارا میدان لٹی پٹی، کٹی پھٹی لاشوں سے اٹا پڑا ہے۔ مرد، عورتیں، بچے، سفید، رنگین اجلے اور میلے کپڑوں میں مردہ انسان، نہ کوئی مارنے والا نہ دفنانے والا۔ صرف مردے ہی مردے۔ بے ہنگم، بے ترتیب، نہ فرد جرم کا نشان نہ قاتل کا کھوج، نہ منصف نہ گواہ۔ موت اور صرف موت، اس منظر کا واحد تماشائی۔ تاروں بھرا آسمان جس کی نگاہیں کرنوں کی شکل میں نیچے اترتی ہیں اور لاشوں پر منجمد ہو جاتی ہیں۔

کینوس نمبر۳

چھوٹی سی دکان پر ایک بڑھئی کام کر رہا ہے۔ اس کی سیٹ ایک کھڑکی کے نیچے واقع ہے جہاں وہ گرمیوں، سردیوں میں بھٹی کے سامنے بیٹھا لوہے کو ٹانکے لگاتا رہتا ہے۔ کھڑکی جس میں شیشہ لگا ہوا ہے مستقل طور پر بند رہتی ہے اور سردیوں میں اس سے

 © Urdu4U.com

سورج کی روشنی چھن چھن کر آتی اور بڑھئی کے نیم مردہ جسم کو تقویت پہنچاتی ہے۔ لیکن گرمیوں میں سورج کی کرنیں ظالم کے نیزے کی طرح اس پر برستی ہیں لیکن وہ بھٹی کے سامنے بیٹھا کام کرتا رہتا ہے۔ اس کے جسم کی جلد متواتر مشقت کی وجہ سے پھٹ چکی ہے۔ جیسے پانی کا جوہڑ خشک ہونے کے بعد جگہ جگہ سے پھٹ جاتا ہے۔ جس ترتیب سے اس کی جلد پر لکیریں نظر آتی ہیں۔ اسی ترتیب سے کھڑکی کے شیشے میں دراڑیں پڑ جاتی ہیں۔ کیوں؟ تصویر وضاحت نہیں کرتی!

URDU4U.COM

کینوس نمبر۴

نسبتاً بہت بڑا کینوس ہے جس کے ایک کنارے سے لے کر دوسرے کنارے تک عوام ہی عوام ہیں جنھوں نے سندھی' پنجابی' بلوچی' پختون اور بنگالی لباس پہن رکھا ہے لیکن سبایک ہی فریم میں یکجا ہیں۔ ان کے پاؤں' ٹانگیں' بازو' ہاتھ' سر اور گردن صاف نظر آتے ہیں لیکن چہروں کی جگہ خالی ہے۔ چہرے کا فریم یا چوکھٹہ موجود ہے لیکن اس پر سفیدہ لگا ہوا ہے۔ بے رنگ'ب ے نام' بے نشان "طاقت کا سرچشمہ عوام!"

کینوس نمبر۵

ایک دیہاتی گائے کا دودھ دوھ رہا ہے۔ گائے نہایت لاغر اور پتلی دبلی ہے۔ اس کی ہڈیاں صاف نظر آ رہی ہیں۔ جیسے ایک عرصے سے اس کو چارہ نصیب نہیں ہوا۔ لیکن کسان اس کی اگلی اور پچھلی ٹانگوں کو علیحدہ علیحدہ جکڑ کر اس کے تھن نچوڑنے کی کوشش کر رہا ہے لیکن اس کے گھٹنوں میں اٹکی ہوئی لوہے کی بالٹی خالی ہے۔ کسان کا بھائی گائے کی آنکھون پر پٹی کس کر اس کی پیٹھ پر ڈنڈے برسانے لگتا ہے۔ بالا آخر کسان اس کے تھن سے پہلی دھار نچوڑنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ دھار دودھ کی نہیں' خون کی ہے۔

کینوس نمبر۶

ایک جاگیردار تخت نما مسہری پر بیٹھا حقہ پی رہا ہے۔ اس کے چہرے پر اکڑی ہوئی مونچھیں اور سر پر اکڑا ہوا شملہ (پگڑی) نظر آ رہا ہے نیچے ایک دائرے کی شکل میں بہت سے مزارعے زمین پر بیٹھے ہیں۔ درمیان میں ایک مزارع کو جاگیرداروں کی مرضی کے خلاف ووٹ دینے کی سزا دی جا رہی ہے اور سزا کا طریقہ یہ ہے کہ ایک اور کٹا مزار جو جاگیردار صاحب کا منظور نظر ہے خصوصی قسم کے چمڑے کا ہوتا جو تیل میں بھگویا گیا ہے۔ تڑاک تڑاک' "منحرف" کی ننگی پیٹھ پر برسا رہا ہے جہاں جہاں یہ خصوصی جوتا پڑتا ہے جلد کاایک ٹکڑا اپنے ساتھ نوچ لاتا ہے۔ حاضرین خاموش بیٹھے یہ عبرتناک منظر دیکھتے رہتے ہیں اور مالک مغل سٹائل حقے کے کش لگاتا رہتا ہے۔ حتی کہ بے جان جوتی کے اپنے تلوے سے خون رسنے لگتا ہے۔ تصویر میں ہٹے کٹے مزارع نے ایک اور ضرب لگانے کے لئے جوتا ہوامیں لہرا رکھا ہے اور اس کے تلوے سے۔ ہمدردی کے آنسوؤں کی طرح۔ خون رس رہا ہے!

کینوس نمبر۷

یہ تصویر پاک بھارت جنگ کے ایک منظر پر مشتمل ہے۔ منظر یہ ہے کہ متحارب فوجوں کے درمیان غیر جانبدار علاقے No man's land میں ایک گاؤں ہے۔ دونوں طرف سے توپوں کے لوگ اس گاؤں کے اوپر سے گونجتے گزر جاتے ہین ایک گولہ ٹارگٹ پر پہنچنے کی بجائے اس گاؤں کے پاس گر کر پھٹ جاتا ہے جس کی وجہ سے گاؤں والی فوراً گاؤں چھوڑ کر بھاگ جاتے ہیں لیکن گائے کا ایک بچھڑا صحن میں کھونٹے کے ساتھ بندھا رہ جاتا ہے۔ جب گولے پھر گاؤں کے اوپر سے ہوتے ہوئے اپنے اپنے ہدف کی طرح پرواز کرنے لگتے ہیں تو یہ معصوم سا بچھڑا دہشت سے کانپ جاتا ہے اور کھونٹا تڑوا کر بھاگنے کی کوشش کرتا ہے۔

گولے کی ہر گونج کے ساتھ وہ رسہ تڑوانے کے لئے کھونٹے کے گرد تیز تیز چکر لگاتا

ہے۔ بھاگنے کی ہطر کے ساتھ رسہ اس کے گلے پر تنگ ہوتا جاتا ہے حتی کہ وہ اسی پھندے میں سانس بند ہونے سی گر پڑتا ہے۔ اور دم توڑ دیتا ہے۔ ادھر اسی دن سیز فائر کا اعلان ہو جاتا ہے۔

URDU4U.COM

کینوس نمبر۸

یہ ایک اجتماعی قبر (Mass grave) کا منظر ہے جس پر بل ڈوزر سے تازہ تازہ مٹی ڈالی گئی ہے۔ اسی رات تیز بارش ہونے کی وجہ سے یہمٹی بیٹھ گئی ہے اور قبر کی کچیم ٹی میں شگاف پڑ گیا ہے جس کی وجہ سے لاشوں کی بدبو کتوں کو اپنی طرف کھینچنے لگتی ہے۔ کتوں نے صرف دو چار پاؤں مارے تو کسی کے م نہ میں قمیض کی آستین آ گئی۔ کسی کے حصے پاؤں کا انگوٹھا آ گیا۔ یا چوڑیوں والی کلائی اور مہندی لگا زنانہ ہاتھب اہر آ گیا۔ کتنے یہ ہاتھ جنجھوڑنے اور کاٹ کھانے کی بجائے چھوڑ دیا اور منہ پھیر کر چ دیا۔ پتہ نہیں لاشیں کھا کھا کر اس کا پیٹ بھر گیا تھا یا وہ مہندی لگا مقصوم زنانہ ہاتھ دیکھ کر شرما گیا تھا۔ حالانکہ تھ اوہ کتا ہی!

کینوس نمبر۹

یہ کینوس اس دور کے جشن آزادی کی عکاسی کرتا ہے جب ملک میں ہر طرف ترقی اور خوشحالی کا ڈھنڈورا پیٹا جا رہا تھا۔ خوشیوں کے ترانے گائے جا رہے تھے۔ ۱۴ اگست کو سارے ملک میں قومی پرچم لہرائے گئے تھے اور رات کو جگہ جگہ چراغاں کیا گیا تھا۔ اس موقع پر ایک اپاہج کوڑھی نے بھی جشن آزادی منایا۔ گھر والے بند دکانوں کے تھڑے پر اسے ایک ریڑھی پر بٹھا گئے تھے۔ اس کے سامنے دو انچ اونچی موم بتی جل رہی تھی اور ساتھ ریڑھی کے کنارے پر کاغذ کا چھوٹا سا ہلالی پرچم تنکے کے سہارے کھڑا تھا۔ جشن آزادی کی رونق دیکھنے والے لوگ اس کے پاس سے خوش خوش گزر جاتے۔ غبارے اڑتے' آئس کریم کھاتے' کاروں میں لگے ہوئے کیسٹ سے قومی گانے سنتے!

کوڑھی اپنی موم اور اپنے جھنڈے کے ساتھ انہیں دیکھتا رہا۔
باقی کیس بائیس تصویریں وہ تھیں جو وہ وقتاً فوقتاً بناتا رہا تھا۔ اب اس نے انہیں حسب ضرورت Retouch یا Finish کیا۔ یہ تصویریں مختلف مناظر کی عکاسی کرتی تھیں۔ مثلاً میکلوڈ روڈ پر فرنیچر سے لدا ریڑھ دھکیلنے والا مزدور' سواریوں کے بوجھ سی گر کر مرنے والے تانگے کا گھوڑا نئی بستی کے باسی۔ کچی اینٹیں ڈالنے والے کنبے۔ جھگی کے سامنے بیٹھ کر نشہ کرنے والا بھنگی اور خانہ بدوشوں کی زندگی کے عکس شامل تھے۔ تین تصویریں وہ بھی تھیں جو اس نے 3-D's کے پاشا صاحب کے لئے شروع کی تھیں۔ لیکن انہیں پسند نہیں آئی تھیں۔
جب یہ تیس تصویریں تیار ہو گئیں تو فطرت نے چاہا کہ ان کی نمائش کی جائے۔ اس کے اپنے وسائل اس کی اجازت نہیں دیتے تھے کہ وہ ایک شایان شان تقریب کا اہتمام کر سکے۔ اس نے آرٹ کونسل' آرٹ گیلری' کلچرل سنٹر' نیشنل سنٹر' ایجوکیشن کلب اور ادارۂ فروغ مصوری سے رابطہ قائم کیا لیکن کسی نے اس کی نمائش کرنے کی حامی نہ بھری۔ ایک دو آدمیوں نے کچھ دلچسپی ظاہری کی لیکن تصویریں دیکھ کر پیچھے ہٹ گئے۔
فطرت مایوس نہیں تھا۔ اسے یقین تھا کہ اگر وہ تمام تر رکاوٹوں کے باوجود اپنی مرضی کے چند کینوس بنانے میں کامیاب ہو گیا ہے انشاء اللہ ان کی نمائش کا بھی اہتمام ہو جائے گا کب' کہاں' کس کے ذریعے؟ اس کا اسے علم نہ تھا۔ لیکن اللہ پر اسکا یقین کامل تھا۔
فطرت نے یہ تصویریں دسمبر میں مکمل کر لیں۔ اس کی خواہش تھی کہ کسی نہ کسی طرح ان کی نمائش کا اہتمام اس کی ۳۳ ویں سالگرہ پر ہو جائے جو جنوری میں پڑتی تھی۔ لیکن کوشش کے باوجود ایسا نہ ہو سکا۔
جنوری کے آخری یا فروری کے ابتدائی کی بات ہے کہ اسلام آباد یونیورسٹی نے ایک

آل پاکستان مشاعرے کا اہتمام کیا۔ یونیورسٹی میں فطرت کی جان پہچان تو بھی ہی لہٰذا اسے بھی دعوت نامہ مل گیا۔ فطرت نے سوچا یہ اچھا موقع ہے ایک عرصے بعد اچھے شعر بھی سن لیں گے اور شاید لاہور، فیصل آباد یا اسلام آباد کا کوئی ایسا دوست بھی مل جائے جس کے ذریعے نمائش منعقد کرنے کی صورت پیدا ہو جائے۔

مشاعرہ رات کے کھانے کے بعد شروع ہوا اور کوئی ایک بجے جا کر ختم ہوا مشاعرے کے بعد یونیورسٹی کے دو پروفیسر صدر اور عزیز نے (جو دراصل اسسٹنٹ پروفیسر تھے لیکن پروفیسر ہی کہلاتے تھے) فطرت سے کہا۔

"آؤ یار، کمرے میں چلتے ہیں۔ کافی پیتے ہیں اور مشاعر کا پوسٹ مارٹم کرتے ہیں"

"نہیں بھئی، بہت دیر ہو گئی ہے"

"جہاں ایک بج سکتا ہوں وہاں دو بھی بج سکتے ہیں۔ ایسی بھی کیا آفت آ جائے گی، آؤ ایک عرصے سے ادبی موضوع پر گپ شپ ہی نہیں ہوئی"

فطرت ان کے اصرار پر یونیورسٹی کیمپس میں واقع ان کے ہوسٹل میں چلا گیا صفدر بجلی کے چولہے پر پانی کی کیتلی رکھ دی اور الماری میں سے کافی کاٹن اور چینی ڈبہ نکالنے لگا۔ عزیز نے ایک کرسی کھینچ کر فطرت کے سامنے کر دی۔ فطرت وہاں بیٹھ گیا۔

اگرچہ فطرت ادبی محفلوں میں ان سی پہلے بھی مل چکا تھا لیکن ان کمرے میں آنے کا پہلا موقع تھا۔ اسے کمرے کا جائزہ لیا تو اس میں وہ ساری بد نظمی موجود تھی جو ایک یا دانشور کے کمرے میں ہو سکتی ہے۔ یعنی کتابوں کے ڈھیر، کتابون کا یاک تو وہ میز پر، چند کتابیں چارپائی کے سرہانے، میز پوش میز سے نیچے گرا ہوا، رسالوں کے ڈھیر پر جمی ہوئی گرد ایش ٹرے کا پیٹ سگریٹ کے ٹکڑون سی بھرا ہوا، فرش کے دری پر روشنائی کے جھینٹے، دروازے اور کھڑکی پر میلے پردے، پلنگ کے نیچے ہوائی چپل جرابیں اور باسی اخبارب کھرے ہوئے!

کافی کے ساتھ ساتھ مشاعرے پر تبصرہ شروع ہو گیا۔ بعض چیدہ چیدہ شعراء فرداً فرداً

تبصرے کے بعد مشاعرے کے متعلق مجموعی رائے یہ دی گئی کہ اس کا معیار توقع سے کہیں کم تھا۔ صفدر نے کہا

"اس کی وجہ کہیں یہت و نہیں کہ لوگ سچا اور کھرا شعر کہنے سے ڈرتے ہیں"

URDU4U.COM

فطرت نے جواب دیا "میرا نہیں خیال کہ سچا آرٹسٹ خواہ وہ شاعر ہو یا مصور' خارجی ڈر کی وجہ سے وہ کچھ کہنے سے گریز کر سکتا ہے۔ جو وہ کہنا چاہتا ہے۔ کیوں عزیز کیا خیال ہے آپ کا؟"

عزیز نے کہا "خارجی حالات کا اثر پڑتا ہے لیکن میرے خیال میں اتنا نہیں جتنا کہ صفدر کہہ رہا ہے بہرحال جبر کی کیفیت اثر انداز ہوتی تو ہے' آرٹسٹ پر"

صفدر نے کہا "لیکن بھئی' حکومت نے تو اظہار پر کوئی پابندی نہیں لگائی' کوئی کالا قانون نہیں بنایا"

فطرت بولا

"وہ تو میں بھی کہتا ہوں کہ یہ عوامی دور ہے۔ جمہوری حکومت ہے۔ شاعروں مصوروں اور دانشوروں کو پوری آزادی ہے لیکن جبر سے مراد صرف حکومت کی طرف سے لگائی گئی پابندیاں نہیں ہوتیں۔ جبر تو معاشرے کی ایک مجموعی کیفیت ہوتی ہے۔ جس کے خلاف میں سب دانشوروں کو جہاد کرنا چاہئے کیونکہ جس معاشرے سی رواداری ختم ہو جائے وہ معاشرے ختم ہو جاتا ہے۔ اور ہمارا ملک جس کی بنیادی ہی اسلام جیسے دین فطرت پر ہے اس میں رواداری کا عنصر بہت زیادہ ہونا چاہئے"

"ہونا چاہئے اپنی جگہ۔ دیکھنا یہ ہے کہ آیا یہ راوداری یا درگذر کا جذبہ ہمارے معاشرے میں موجود ہے یا نہیں"

"موجود نہیں ہے۔ یہ میں مانتا ہوں۔ لیکن میرا ایمان ہے کہ اگر ہم نظریہ اسلام کو جسے ہم بدقسمتی سے صرف ڈیوگریشن فکے طور پر ہر جگہ سجائے رکھتے ہیں عملی زندگی میں نافذ کر دیں تو معاشرے میں خود بخود رواداری آ جائے گی۔ لیکن اگر ہمن ے اسلام کو عملی زندگی سے خارج کر کے سوسائٹی کی تعصبات میں جکڑ دیا تو یہاں زندہ رہنام شکل

ہو جائے گا کیا خیال ہے صفدر"

"تم ٹھیک کہتے ہو' لیکن بتاؤ تم نے شاعری کیوں چھوڑ دی تھی۔ معاشقے ختم ہو گئے تھے

URDU4U .COM

یا تم بھی کسی خوف کا شکار ہو گئے تھے"

"معاشقے والی بات تو سرا سر مذاق ہے جس طبقے سے آپ اور میں تعلق رکھتے ہیں اس میں معاشقے کا کیا تعلق۔ ہم تو ہوش سنبھالتے ہی پیٹ کے دھندے میں ایسے پھنستے ہیں کہ اور کسی چیز کا ہوش نہیں رہتا۔ جہاں تک خارجی خدشات کا تعلق ہے میں آج تک ان سے ڈر کر تخلیق کام سے پیچھے نہیں ہٹا"

"تو پھر شاعروں کیوں چھوڑ دی"

"اپنی مجبوری کی وجہ سے"

"کیا مجبوری تھی؟"

"چند سال جھک مارنے کے بعد مجھے محسوس ہونے لگا تھا کہ میرے الفاظ گونگے ہو گئے ہیں۔ ان میں گونج تو ہے لیکن آواز نہیں۔ وہ کھنکتے ہیں لیکن بولتے نہیں۔ وہ بجتے ہیں لیکن کہتے کچھ نہیں۔ عجیب بانجھ قسم کے الفاظ ہیں جن کی کاغذ پر قطاریں تو کھڑی کی جا سکتی ہیں لیکن ان کے ذریعے ابلاغ نہیں ہو سکتا"

"پھر"

"پھر میں نے پارٹ ٹائم شاعری ترک کر کے ہول ٹائم پینٹنگ کو اپنا لیا۔"

"لیکن ہم نے تو آج تک تمہاری تصویروں کی کوئی نمائش نہیں دیکھی"

"نمائش ہونے والی ہے۔ چند دنوں میں۔ بس دعا کرو۔"

"خیر نمائش تو ہم دیکھیں گی اور داد بھی دیں گے لیکن یہ بتاؤ کہ پینٹنگ ایک فضول دھندا نہیں جب آرٹ یا آرٹسٹ Receognition ہی نہیں تو کپڑے پر برش گھسانے کا فائدہ؟"

"دیکھو صفدر' اگر پینٹنگ کو تم پیسے کا دھندا سمجھتے ہو تو میں تمہارے ساتھ اتفاق کرتا ہوں کہ یہ ایک فضول دھندا ہے۔ جتنی محنت اور جانفشانی سے ایکتصیور بنتی ہے جو

بکتی بھی نہیں اتنی دیر میں آدمی تربوز بیچ کر روزی کما سکتا ہے لیکن Receognition کا مطلب یہ سمجھتے ہو کہ کوئی بڑا سرکاری افسر نمائش کا افتتاح کر دے۔ ایوان اقتدار سے خط آ جائے' اخباروں میں ذکر ہو جائے یا مقابلے میں انعام مل جائے Receognition ہو گئی سچ پوچھو تو میں ان باتوں کو کوئی اہمیت نہیں دیتا۔ میرے خیال میں آرٹسٹ کا سب سے بڑا انعام اس کی اپنی تسکین ہے۔ یعنی آیا وہ جو کچھ کہنا چاہتا تھا کہہ سکا ہے یا نہیں۔ اور دوسری بات یہ کہ وہ اپنی بات ج ن لوگون تک پہنچانا چاہتا تھا ان تک پہنچ گئی ہے یا نہیں باقی سب فروعات ہیں۔ کسی کتاب کے کتنے ایڈیشن بک گئے یا کسی آرٹسٹ کی تصویر کتنے میں اٹھ گئی۔ محض کاروباری بات ہے جس کا آرٹ کی عظمت سی کوئی تعلق نہیں"

"اچھا یہ بتاؤ فطرت کہ تم نے شاعری ترک کر کے مصوری کو اپنا یا تو تمہارے پیش نظر مشن کیا تھا اور تم' تمہارے اپنے خیال میں' اس مشن میں کہاں تک کامیاب ہوئے ہو"

"پینٹنگ کو اپنانے میں میرا مقصد ایک اور صرف ایک تھا اور وہ یہ کہ معاشرہ میں جو ظلم و ستم' نا انصافیاں' جبر و تشدد' رنج و الم' افلاس و غربت' جہالت و پس ماندگی دیکھوں اس کا برملا اظہار کروں تا کہ ان ناسوروں کے خلاف لوگوں کے اندر ایک احساس جاگے۔ ان کے دلوں میں تحریک اٹھے۔ ان میں ان داغوں کو مٹانے کے لئے جذبہ پیدا"

"لیکن تم پر یہ اعتراض بھی تو ہو سکتا ہے کہ تمہیں اس کھاتے پیتے ہنستے کھیلتے معاشرہ میں اور کچھ نظر نہیں آتا' غربت' افلاس' اندوہ اور غم کے سوا"

"یہ اعتراض ہو سکتا ہے لیکن میرا جواب یہ ہے کہ میں ان پہلوؤں کو اجاگر کرنا چاہتا ہوں جن میں اصلاح کی ضرورت ہے۔ جن کی طرف خاص و عام کی توجہ مبذول کرانے اور جن کے خلاف سماجی شعور بیدار کرنے کی ضرورت ہے۔ میں غربت افلاس کو پروجیکٹ کر کے پاکستان کی خوشحالی کی نفی نہیں کرتا۔ میں صرف ان داغوں کی نشاندہی کرنا چاہتا ہوں جو اس خوشحال ملک کے دامن پر موجود ہیں"

"یہ موضوعات تو ایسے ہیں جو کمیونسٹ ذہن کی نشاندہی کرتے ہیں تم پر کہیں کمیونسٹ یا اشتراکی ہونے کا ٹھپہ نہ لگ جائے"

"وہ ٹھپہ تو مجھ پر یونیورسٹی کے زمانے میں بھی لگ چکا ہے۔ پہلے سرخہ کہا گیا پھر سی آئی اے کا ایجنٹ قرار دیا گیا لیکن میں نے ان ٹھپوں کی پروا کئے بغیر اپنا کام جاری رکھا کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ ظلم' جبر' غربت' افلاس اور ناانصافی کے خلاف جہاد کرنا عین اسلام ہے۔ بلکہ جو شخص ان ناسروں کو دیکھ کر منہ پھیر لیتا ہے اس کے ایمان میں کچھ ضعف ہے۔ ورنہ کس طرح ممکن ہے کہ پیارے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا شیدائی ان کی امتم یں یہ رنج و الم دیکھے اور وہ خاموش رہے وہ ان زیاتیوں کا مشاہدہ کرے اور اس کے کان پر جوں نہ رینگنے"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ لیکن میں تمہیں اپنی سوسائٹی کی بات بتا رہا ہوں کہ جو کوئی ان موضوعات پر قلم یا برش اٹھاتا ہے اسے کمیونسٹ کہا جاتا ہے۔"

"میں اس مفروضے کو توڑنا چاہتا ہوں۔ میرے مسلمان ہونے میں تو کسی کو شک نہیں' کلمہ گو مسلمان ہوں' نماز پڑھتا ہوں' روزے رکھتا ہوں' عمرہ کر آیا ہوں۔ قرآن شریف پر' خاتم النبین پر اور روز قیامت پر ایمان رکھتا ہوں اور ایسے کینوس پینٹ کرتا ہوں جو معاشرے کی ناہمواریوں اور نا انصافیوں کے خلاف جذبات بھڑکاتے ہیں۔ میں کمیونسٹ کیسے ہو سکتا ہوں۔ کمیونزم کا زہر تو خالی پیمانوں میں بھرا جاتا ہے لیکن جس شخص کا دل اسلام سے منور ہو اور جس کی آنکھوں میں روضہ مبارک کی تصویر بجی ہو وہ محض غربت و افلاس کے مناظر پینٹ کرنے کی وجہ سی کافر' لادین یا کمیونسٹ نہیں ہو سکتا۔"

"بہرحال ہم تو تمہیں محتاط رہنے کا ہی مشورہ دیں گے"

"یار تم لوگ دانشور ہو' یونیورسٹی میں پڑھاتے ہو۔ اگر تم بھی ایسے معاملات میں احتیاط' احتیاط کے چکرمیں پڑ گئے تو جھوٹ کو جھوٹ اور سچ کو سچ کون کہے گا میں اس نمائش

سے اور کچھ ثابت(Establish) کر سکوں یا نہ کر سکوں۔ کم از کم یہ ضرور ثابت کر دوں گا کہ ایک مسلمان کے برش سے ان موضوعات کو بھی پینٹ کیا جا سکتا ہے جو روایتی طور پر اور غلط طور پر لیفٹ سے منسوب رہے ہیں"

URDU4U.COM

"Wish you good luck" (اللہ آپ کو کامیاب کرے)

باتوں باتوں میں ہی صبح کے تین بجگئے۔ فطرت نے گھڑی دیکھی تو فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔

صفدر نے کہا

"کافی کا ایک کپ اور۔ گرم گرم"

"نہیں یار، بہت دیر ہو گئی میں چلتا ہوں"

وہ ان سے رخصت ہو کر اپنی کار میں بیٹھا اور یونیورسٹی سے باہر نکل آیا۔ یونیورسٹی کے بیرونی گیٹ سے بمشکل سو گز آگے گیا ہو گا کہ ایک شخص ے اس کی کاروائی اور اسے گاڑی سے باہر نکلنے کو کہا۔ فطرت صبح کی چاندنی میں بکھرے بالوں اور امریکی وضع کے لباس میں سڑک پر کھڑا ہو گیا۔ گاڑی روکنے والے نیم جاہل شخص ے کہا:

"آپ فطرت ہیں، آرٹسٹ"

"جی"

"اچھا، آپ جایئے لیکن احتیاط کیجئے۔ اگر میں آپ کو ذاتی طور پر جانتا نہ ہوتا تو میں آپ کو بھی مشتبہ شخص سمجھ کر گرفتار کر لیتا۔"

"مگر کیوں"

"کیا آپ کو پتہ نہیں کہ یہ یونیورسٹی تخریب کاروں کا اڈا ہے۔ پچھلے دنوں یہاں سے مہلک ہتھیاروں کی اچھی خاصی مقدار پکڑی گئی ہے۔ حکام کی اس جگہ پر خاص نظر ہے۔ آپ جن لوگوں کے پاس رات گذار کر آئے ہیں وہ بھی مشتبہ افراد کی فہرست میں شامل ہیں۔ ان پر بھی کڑی نظر ہے۔ اگر میری جگہ کوئی اور ہوتا تو اب تک آپ کو تھانے پہنچا چکا ہوتا۔ جایئے آپ، قبل اس کے کہ ہمارا کوئی اور شخص آپ کو پکڑ

لے ۔ جایئے''
فطرت نے گاڑی میں دوبارہ بیٹھتے ہوئے تاروں بھرے آسمان کی طرف دیکھا اور سرد آہ بھر کر اپنے آپ سے کہا
''یا اللہ تو نے' اتنا کھلا آسمان بنایا ہے پھر یہ زمین اتنی تنگ کیوں کر دی ہے''

انہی جاتے جاڑوں کا ذکر ہے کہ یورپ سے آرٹسٹوں کا ایک وفد پاکستان آیا۔ اسلام آباد میں اپنے قیام کے دوران یہ وفد ادارۂ شناخت پاکستان بھی آیا جہاں سب سے پہلے اس چھ رکنی وفد نے ڈی۔ جی سے ملاقات کی۔ جنھوں نے وفد کو ادارے کی تنظیم اور فرائض کے متعلق بتایا۔ پاکستان میں فنون لطیفہ کی ترقی اور اس میں اس ادارے کے رول کے بارے میں روشنی ڈالی اور بڑے فخر سے بتایا کہ ہمارے اس ادارے میں بھی اچھے اچھے آرٹسٹ ملازم ہیں جن کی ہر طرح حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔
بعد میں انہوں نے وفد سے ادارے کے افسروں کا تعارف کرایا۔ اس تعارف کے دوران فطرتمس گریس کو اور مس گریس فطرت کو دیکھ کر خوشگوار حیرت میں پڑ گئے۔ انہوں نے بڑے تپاک سے ایک دوسرے سے مصافحہ کیا اور دوبارہ ملاقات پر خوشی کا اظہار کیا۔
مس گریس وہی خاتون تھیں جس سی فطرت کی پیرس میں ملاقات ہوئی تھی اور اس نے فطرت کو نہ صرف فرانس کی سب سی بڑی آرٹ گیلری دکھائی تھی بلکہ اس خاص تواضع بھی کی تھی۔ فطرت نے سوچا کہ اب اس مہمان نوازی کا جواب مہمان نوازی سے دینا اس کا اخلاقی فرض ہے چنانچہ جب وفد نے ادارۂ شناخت پاکستان کا دورہ مکمل کر لیا تو فطرت نے مس گریس کو ڈنر کی دعوت دے دی جو اس نے بخوشی قبول کر لی۔
رات کو آٹھ بجے فطرت نے تیار ہو کر اپنی فوکسی نکالی اور مس گریس کے ہوٹل میں پہنچ گیا۔ اس نے استقبالیہ سے کمرے میں فون کر کے اپنی آمد کی اطلاع دی تو اس

نے کہا۔ I'll be down in a minute (میں ایک منٹ میں آئی) اور وہ واقعی پرس اور مفلر سنبھالتی نیچے آ گئی۔ فطرت نے اسے خوش آمدید کہا اور کھانے کے متعلق اس

URDU4U.COM

کی پسند پوچھی۔ اس نے کہا

"فطرت' چوائس آپ کا ہے میرا مقصد آپ سے ملنا ہے' جہاں چاہو' لے چلو" فطرت اسے چینی ریستوران میں لے گیا۔

وہ کھانے کا آرڈر دے کر اپنی اپنی پسند کا مشروب سامنے رکھ کر باتیں کرنے لگے۔ پہلے ایک دوسرے کے حالات اور مصروفیات کے بارے میں باتیں ہوتی رہیں پھر بات آرٹ کے فروغ پر مرکوز ہو گئی۔

اتنے میں بیرا چینی سوپ کا ایک پیالہ' فرائڈ رائس مکسڈ ویجی ٹیبل' بیف اور سویٹ اینڈ ساور پر آن وغیرہ لے کر آ گیا۔ کھانا کھاتے ہوئے مس گریس نے پوچھا کہ پاکستان میں آرٹ لائف کیسی ہے۔

فطرت نے حب الوطنی کے تقاضوں کے مطابق بتایا کہ پاکستان میں آرٹ کی ترقی کی رفتار بہت اچھی ہے۔ آرٹسٹوں کی دو نسلیں آرٹ کی خدمت میں مصروف ہیں۔ ایک نسل وہ ہے جو عہد غلامی میںپ یدا ہوئی اور ہند یا مغربی آرٹ کے زیر اثر پلی بڑھی اور دوسری وہ جس نے قیام پاکستنا کے بعد جنم لیا اور اب آرٹ کی دنیا میں داخل ہوئی ہے۔

"دونوں نسلوں میں کیا فرق ہے" مس گریسن ے پوچھا

فطرت نے اسے بتایا "دونوں نسلیں اپنی اپنی جگہ اہم خدمات انجام دے رہی ہیں۔ پرانی نسل کا ذہن تجربہ اور نقطہ نظر اپنے عہد کا تشکیل کردہ ہے۔ وہ نئی نسل کے لئے Perspective کا کام دیتا ہے۔ جبکہ نئی نسل کا محور پاکستان اور اس کے مسائل ہیں ویسے پرانے آرٹسٹوں نے بھی آزادی کے بعد حالات کے ساتھ اپنے آپ کو خوب (Ajust) کر لیا ہے۔

دونوں میں کوئی تضاد نہیں بلکہ وہ ایک دوسرے کو سپلیمنٹ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

"خوب' یہ تو بڑھی اچھی بات ہے ہاں' یہ بتایئے کہ پاکستان جیسے ملک میں جہاں اسلام پر اتنا زور دیا جاتا ہے فائن آرٹس کا کیا مستقبل ہے۔ خاص کر جب اسلام Figurative Arts کے خلاف ہے۔"

URDU4U.COM

فطرت نے اپنی نظریاتی مملکت کا بھرپور دراع کیا اور کہا:

"پاکستان میں فنون لطیفہ کو کوئی خطرہ نہیں یہان مصورون پر حتی کہ Figurative Arts سے وابستہ آرٹسٹوں پر بھی کسی قسم کی کوئی پابندی نہیں۔ وہ جو چاہتے ہیں پینٹ کرتے ہیں۔ اور جہاں چاہتے ہیں اور جس سے چاہتے ہیں اپنے فن پارون کی نمائش کروا لیتے ہیں۔ ان کے خلاف کسی قسم کا تعصب نہیں پایا جاتا۔ کوئی ان پر انگلی نہیں اٹھاتا کوئی انہیں پریشان نہیں کرتا خاص کر حکومت کا رویہ توب ہت ہی فراخد لانہ ہے۔ وہ آرٹسٹوں کو نہ صرف ہر طرح کی آزادی دیتی ہے بلکہ انہیں ہر ممکن سہولت بھی مہیا کرتی ہے۔ ان کے فن پارے خرید کر پاکستانی سفارتخانوں میں بھیجتی ہے۔ اور آرٹسٹوں پر مشتمل ثقافتی وفد تشکیل دی کر بیرون ملک روانہ کرتی ہے"

"کیا آپ بطور آرٹسٹ نظریاتی ملک میں کسی قسم کی گھٹنٹ محسوس نہیں کرتے"

"کیا بات کر رہی ہیں آپ مس گریس! گھٹن کا کیا مطلب ہے' ہم یہاں اپنے گھروں میں خود کو اتنا ہی آزاد محسوس کرتے ہیں جتنا آپ پیرس میں۔ ممکن ہے فضا میں اڑنے والے پرندے کو دریا میں رہنے والی مچھلی محصور لگے لیکن اس پرندے کو نہیں بھولنا چاہیئے کہ یہ دریا ہی اس مچھلی کا گھر ہے۔ اگر اسے دریا سے نکال کر ہوا میں پھینک دیا جائے تو یہ مر جائے گی۔ بالکل اسی طرح جس طرح پرندے کو پکڑ کر دریا میں ڈبو دیا جائے تو وہ مر جائے گا۔ دونوں کا اپنا اپنا جہاں ہے۔ دونوں اپنی اپنی جگہ آزاد اور خوش ہیں۔ پیرس میں گریس اور پاکستان میں فطرت"

اس سلسلے میں مس گریس نے اپنا نقطہ نظر بیان کرنے کے بعد پوچھا "آپ نے نظریاتی ملک میں آرٹ کے مستقبل کے بارے میں میری بات کا جواب نہیں دیا"

"میں نے بتایا نا' دونوں میں کوئی Conflict یا تضاد نہیں ہے۔ سویت یونین' عوامی جمہوریہ چین اور شمالی کوریا اپنی اپنی جگہ نظریاتی ممالک ہیں۔ کیا آپ کہہ سکتی ہیں کہ وہاں آرٹ کا وجود ختم ہو گیا ہے۔ اسلام ان نظریاتی ملکوں کی نسبت کہیں زیادہ فراخ دل ہے۔ پتہ نہیں آپ نے اسلام کا ٹھنڈے دل سے مطالعہ کیا ہے یا نہیں۔ یہ تو ہے ہی سراسر جمال' سراسر توازن' سراسر حسن' ہم اسے دین فطرت کہتے ہیں اور فطرت یا قدرت کا اپنا خاصا یہ ہے کہ اس کے ہر روپ میں ایک توازن ہے۔ ایک حسن ہے۔ ایک جمال ہے۔"

انہی باتوں میں انہیں دو تین گھنٹے گزر گئے۔ فطرت نے کھانے کا بل ادا کرتے ہوئے اپنی گفتگو کا نچوڑ پیش کیا اور مس گریس کا یقین دلایا کہ پاکستان میں ہرگز کوئی گھٹن نہیں۔ نہ آرٹسٹوں کے لئے اور نہ عام شہریوں کی لئے۔ یہاں آرٹ ترقی کر رہا ہے اور انشاء اللہ کرتا رہے گ۔"

جب وہ ہوٹل سے باہر نکلے تو رات کے سوا گیارہ بج چکے تھے۔ جاڑے کی چاندنی اپنے جوبن پر تھی۔ صاف نیلے آسمان پر اور چاند اور تارے چمک رہے تھی۔ فطرت نے مس گریس کی توجہ آسمان کی طرف متوجہ کراتے ہوئے کہا:

"مس گریس' ہمارا آسمان کتنا ستھرا' کتنا کشادہ اور کتنا چمکدار ہے"

"ہاں ٹراپیکل ریجن میں رات کو موسم بہت اچھا ہو جاتا ہے"

وہ یہ باتیں کرتے ہوے گاڑی میں بیٹھے اور فطرت کی فوکس ویگن سڑککے کنکر ایک طرف اڑاتی ہوئی اسلام آباد کی بڑی بڑی سڑک پر آ گئی۔ وہ بمشکل ایک فرلانگ گئے ہوں گے کہ چار پانچ نوجوانوں کی ایک ٹولی نے انہیں روک لیا۔ انھوں نے فطرت کے ساتھ میم کو بیٹھے دیکھ کر کہا:

"اپنا نکاح نامہ دکھایئے"

"کیا مطلب' کون ہیں آپ" فطرت نے حیرت اور غصے کے ملے جلے لہجے میں پوچھا "ہم تنظیم اصلاح شہریاں آسلام آباد کے رضا کار ہیں۔ ہماری تنظیم کو یہ اطلاع ملی ہے کہ

 © Urdu4U.com

اسلامی جمہوریہ پاکستان کے وفاقی دارالحکومت میں فحاشی پرورش پا رہی ہے اور راتوں کو غیر مرد اور غیر عورتیں داد عیش دینے کے لئے اپنے اپنے گھروں سے باہر نکل آتے ہیں۔ سرعام بوس و کنار کرتے ہیں۔ ہم ان واہیات حرکات کو روک تھام کے لئے رات کو ۹ بجے سے صبح چار بجے تک ڈیوٹی کرتے ہیں ۔ ہمارے گروپ کی ڈیوٹی ۱۲ بجے تک ہے۔ آپ اپنی معصومیت کا ثبوت دیجئے۔ ورنہ ہم آپ کو اور آپ کی آشنا عورت کو تنظیم کے دفتر میں لے جائیں گے اور دونوں کی اصلاح کر دیں گے"

فطرت ان کا منہ دیکھنے لگا۔

انہوں نے اپنے مشن پر زور دیتے ہوئے کہا "آپ شرافت سے ہمارے ساتھ تعاون کیجئے ورنہ ہم بدمعاشوں کے ساتھ نپٹنا بھی جانتے ہیں"

فطرت نے اپنا شناختی کارڈ دکھایا۔ انہون نے کارڈ واپس کرتی ہوئے کہا "اس کارڈ سے صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ آپ ادارۂ شناخت پاکستان میں شعبہ فنون بصری کے ڈائریکٹر ہیں اور آپ کا نام فطرت ہے۔ لیکن اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ آپ دونوں میاں بیوی ہیں۔ آپ یہ بتایئے کہ کیوں نہ آپ دونوں کی سر راہ اصلاح کر دی جائے"

"بھئی یہ سراسر زیادتی ہے"

"دیکھئے ہمارے اس وقت نہیں ہے۔ ہم نے دوسرے سیکٹروں میں بھی چکر لگانا ہے"

فطرت کو یوں محسوس ہوا کہ وہ ابھی اسے اور اس کی مہمان کو گھسیٹ کر کار سے نکال لیں گے اور سر عام مارنا شروع کر دیں گے۔ اسی نجات کی کوئی صورت نظر نہ آئی تو اس نے کہا:

"بھئی معاف کر دو آئندہ رات کو باہر نہیں نکلیں گے"

"معافی تو اپنی جگہ ٹھیک ہے لیکن ہم کیا یونہی بیکار سڑکوں پر پھرتے رہتے ہیں"

فطرت سمجھ گیا کہ ان کا اشارہ رشوت کی طرف ہے۔ اس نے اپنی جیب سے سو روپے کا اکلوتا نوٹ (جو وہ احتیاطاً ساتھ لے آیا تھا کہ کھانے کے پیسے کم نہ پڑ جائیں) نکال کر ان کے لیڈر کے ہاتھ میں تھمایا اور انہوں نے راستہ دے دیا۔

© Urdu4U.com

راستے میں مسز گریس نے پوچھا "یہ کون تھے اور کیا چاہتے تھے"

"دراصل آج کل حکومت کو رپورٹیں مل رہی ہیں کہ غیر ملکی تخریب کار پاکستان میں گھس آئے ہیں اور ان کا ایک گروپ اسلام آباد پہنچ چکا ہے شہریوں کی جان' مال اور عزت حفاظت کے لئے شہریوں کی کمیٹیاں تشکیل دی گئی ہیں جو رات کو گشت کر کے انتظامیہ کا ہاتھ بٹاتی ہیں۔ اس پارٹی کو جونہی احساس ہوا کہ میں ایک شریف شہری ہوں اور میرے ساتھ یاک غیر ملکی معزز مہمان ہے تو انہوں نے لمبی ضرورت سے لمبی معذرت کی اور جب میں نے انہیں معاف کرف دیا تو وہ چلے گئے۔ انہوں نے جاتے ہوئے مجھے کہا کہ میں ان کی طرف سے آپ سے بھی معافی مانگ لوں"

"نہیں' معافی کی کوئی بات نہیں' اچھا ہے کہ تمہاری گورنمنٹ Vigiland (محتاط) ہے"

فطرت نے ڈرتے ڈرتے مس گریس کو اس کے ہوٹل میں چھوڑا اور خود اپنے گھر روانہ ہو گیا۔

فطرت اس وقعہ سے اتنا زچ ہو چکا تھا کہ وہ گھر میں داخل ہوت ہی اسٹوڈیو میں گھس گیا اور کرسی پر بیٹھ کر گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ اسے پتہ ہی نہ چلا کہ زبیدہ اپنے پلنگ سے اٹھ کر اس کے کمرے میں آ چکی ہے۔ جب فطرت نے اس کی موجودگی کا کوئی نوٹس نہ لیا تو زبیدہ نے تلخ لہجے میں کہا:

"کچھ میرے ساتھ بھی بات کرو گے یا اسی چڑیل کے خیالوں میں کھوئے رہو گے"

"کون سی چڑیل' کس کا خیال"

"میں سب جانتی ہوں۔ نہ بولوں تو الگ بات ہے ورنہ یہ نہ سمجھو کہ میں گھر میں بیٹھی رہتی ہوں اور مجھے کسی بات کا علم نہیں میں تمہاری ایک ایک حرکت جانتی ہوں"

"وہم نہ کیا کرو"

"وہم نہیں' حقیقت ہے"

"گھر میں بیٹھے بیٹھے کیا الٹی سیدھی باتیں سوچتی رہتی ہو"

"الٹی سیدھی باتیں نہیں' سچی سچی باتیں"

"لیکن تمہیں کیا پتہ میں کہاں گیا تھا اور اپنے سینے پر کیا غم باندھ کر واپس آیا ہوں"

"وہ چڑیل جاتے وقت غم نہیں دے گی تو کیا دے گی۔ چٹی چمڑی جو ہوئی اس کی۔

URDU4U.COM

ورنہ مجھ میں کیا کمی ہے"

"تم پہیلیاں نہ بجھاؤ۔ سیدھی سیدھی بات کرو۔ ہوا کیا"

"ہوا یہ ہے کہ تمہارے جانے کے بعد تمہاری دفتر کے ریاست صاحب آئے تھے"

"ریاست؟ وہ؟ کس وقت؟ وہ تو کبھی نہیں آیا ہمارے گھر۔ ضرور کوئی کام ہو گا اسے

کیا کہتا تھا وہ؟"

"اس نے آتے ہی پوچھا فطرت واپس آ گیا یا نہیں؟"

"میں نے پوچھا کہاں ہے؟ تو اس نے مجھے بتایا کہ صبح ایک میم دفتر میں آئی تھی جو

تمہاری پرانی واقف تھی پتہ نہیں کب سے تم نے کہاں کہاں دوستیاں لگا رکھی ہیں۔

بہرحال اس نے بتایا کہ تم نے اس کے ساتھ کوئی ٹائم مقرر کیا تھا۔ پتہ نہیں کیا نام

بتایا تھا اس کا گرس' گریس یا کچھ ایسا نام۔ جب تم تیار ہو کر جا رہے تھے تو تمہاری

تیاری دیکھ کر مجھ کو شک تو ہوا لیکن میں سمجھی شائد کسی فنکشن میں جا رہے ہو۔

مجھے نہیں معلوم تھا کہ کسی ولایتی چڑیل کے پاس گئے ہو اور آدھی رات اس کے ساتھ

گزار دو گے۔ کیا وہ بہت خوبصورت تھی۔ مجھ سے بھی خوبصورت!"

"بکواس بند کرو' ہوتا کچھ ہے اور تم مطلب کچھ اور نکال لیتی ہو"

"جی' میں دیہاتی عورت سہی لیکن اتنی ابھی جاہل نہیں ہوں۔ میں سب سمجھتی ہوں۔ میں

ہر بات سمجھتی ہوں اور اس کا مطلب بھی صحیح نکالتی ہوں"

"میں چلی جاتی ہوں لیکن یہ بتا دوں کہ مجھ سے یہ سب کچھ برداشت نہیں ہو گا۔

میں"

"ٹھیک ہے۔ لیکن نکل جاؤ اس کمرے سے فوراً ابھی"

زبیدہ بڑبڑاتی ہوئی کمرے سے نکلی تو فطرف نے اندر سے چٹخنی لگا دی۔ وہ دونوں ہاتھوں

سے اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گیا اور ابلتے ہوئے آنسو ضبط کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ جاس نے دراز سے ٹیپ ریکارڈر نکالا اور حسب عادت اپنے غم اس میں دفن کرنے لگا۔

URDU4U.COM

"یا اللہ تیرے اس جہنم کی آگ بہت تیز ہو گئی ہے میں بہت کمزور انسان ہوں۔ مجھے امتحان میں نہ ڈال۔ میں یہ سب کچھ نہ سہہ سکوں گا۔ میں خودکشی کر کے تیرے حکم کی نفی کرنا نہیں چاہتا لیکن خدایا! لوگ بیٹھے بیٹھے دم توڑ دیتے ہیں۔ چلتے چلتی ان کی حرکت قلب بند ہو جاتی ہے۔ وہ نجات پا جاتے ہیں۔ میں نے کیا جرم کیا ہے کہ میں پچھلے ۳۳ سال سے سولی پر لٹکا ہوا ہوں۔ یا اللہ مجھے نجات دے۔ میری خطائیں معاف کر، مجھے اس دنیا سے اٹھا لے مجھے اس عذاب سے بچا لے"

یوں ہی روتے روتے وہ کرسی پر سو گیا۔

ایک دن فطرت "بزم احباب" کی ادبی نشست میں گیا تو اسے یو، ایس آئی ایس (امریکہ کے مرکز اطلاعات) کے زبیری صاحب مل گئے۔ ابتدائی علیک سلیک کے بعد زبیری نے پوچھا "کیوں فطرت صاحب کیا ہوا آپ کی نمائش کا، ہم تو انتظار ہی کرتے رہ گئے۔

دعوت نامے کا"

"بس ہونے والی ہے، کچھ عرصے کے بعد"

"اگر کوئی رکاوٹ ہے تو ہم کرا دیں"

"چاہو تو تم کرا دو۔ مجھے تو کوئی اعتراض نہیں"

"ٹھیک ہے ہم کروا دیتے ہیں۔ مہمان خصوصی وغیرہ کے بارے میں سوچا آپ نے؟"

"نہیں میں نے تو کچھ نہیں سوچا"

"کوئی خاص پسند، ناپسند؟"

"کوئی ایسی پسند، ناپسند بھی نہیں، اصل مقصد تو یہ ہے کہ میں راتوں کو جاگ جاگ کر جو جھک مارتا رہا ہوں، وہ لوگوں کے سامنے آسکے۔ ویسے افتتاح کرنے والی شخصیت کا تعلق ادب، آرٹ یا ثقافت سے ہو تو بہتر ہے"

"ہاں مجھے یاد آیا کہ مارچ میں شگاگو انسٹی ٹیوٹ آف آرٹ کے سربراہ ڈاکٹر برڈ جنوبی ایشیا کے دورے پر آ رہے ہیں۔ اگر تم ڈیڑھ دو مہینے صبر کر سکو تو نمائش کا افتتاح ان سے کروا لیں۔ وہ ۲۴ مارچ سے ۱۲ مارچ تک یہاں ہوں گے"

URDU4U.COM

"واہ' اس سے اچھی بات کیا ہو سکتی ہے۔ شائد تمہیں معلوم نہیں کہ میں ایم۔ اے کرنے کے بعد جب ایک سال کے لئے امریکہ گیا تھا تو اسی انسٹی ٹیوٹ میں ایک سال رہا تھا اور ڈاکٹر برڈ سے ہی استفادہ فکیا تھا۔ وہ مجھے اچھی طرح جانتے ہیں۔ افتتاح ان کے ہاتھوں میں ہو جائے تو بہت ہی اچھا ہے"

۱۷ مارچ کو شام کے چار بجے اسلام آباد کے ایک فائیو سٹار ہوٹل میں خاصی گہما گہمی تھی۔ آج فطرت کے فن پاروں کی نمائش ہو رہی تھی۔ گویا فطرت کی زندگی کی سب سی بڑی خواہش پایہ تکمیل کو پہنچ رہی تھی۔ شگاگو انسٹی ٹیوٹ کے سربراہ اس نمائش کا افتتاح کرنے والے تھے۔ شائد ہی شہر کا کوئی دانشور' آرٹسٹ' ادیب یا شاعر ہو جو آج کی اس تقریب سے غیر حاضر ہو۔ فطرت نے اپنے دفتر والون کو بھی دعوت نامے بھیجے تھے۔ لیکن حسد یا مصروفیت کی وجہ سے ان میں کوئی بھی نہیں آیا تھ۔ا بلکہ ڈی ڈی جی بخاری صاحب نے تو اسی شام ایسی تقریبات کو کوریج کرنے والے مقامی صحافیوں اور کالم نگاروں کو چائے پر بلوا لیا تاکہ اس نمائش کی تشہیر ہی نہ ہو سکے لیکن فطرت نے اسے کوئی اہمیت نہ دی کیونکہ فطرت کا مقصد پبلسٹی نہیں بلکہ فن پاروں کی نمائش منعقد کرنا تھا۔

فطرت کی خواہش پر تقریب کا آغاز قرآن پاک سے ہوا۔ سٹیج پر ڈاکٹر برڈ' خود فطرت اور سٹیج سیکرٹری پروفیسر شعیب صدیقی بیٹھے تھے۔ مضامین پڑھنے والوں میں یونیورسٹی کے پروفیسر صفدر' مقامی آرٹسٹ اصغر اور فطرت کے ایک ادبی دوست بشیر گنجاہی تھے۔ اگرچہ مضامین فطرت کی شخصیت اور فن کے بارے میں تھی لیکن ان کا زیادہ تر جھکاؤ فن کی بجائے شخصیت کی طرف تھا شائد اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ فطرت کو تو جانتے تھے

لیکن اس کے فن کے متعلق زیادہ معلومات نہ رکھتے تھے یہ کسی ڈاکٹر برڈ نے پوری کر دی۔ جنھوں نے رسمی تقریب میں شرکت سے پہلے فطرت کے کام کا بغور مطالعہ کیا تھا۔

URDU4U.COM

ڈاکٹر برڈ کی تقریر کے دو حصے تھے۔ پہلے حصے میں قوموں کی زندگی میں آرٹ کی اہمیت کو واضح کیا گیا اور دوسرے حصے میں فطرت کے فن پر روشنی ڈالی گئی تھی۔

ڈاکٹر برڈ نے تقریر کے پہلے حصے میں فرمایا:۔

"قومیں اپنے کریکٹر یا کردار کا اظہار اپنے کلچر کے ذریعے کرتی ہیں اور اس اظہار کا ایک موثر میڈیم پینٹنگ ہے۔ اگرچہ پینٹنگ کو پینٹر کی ذلت سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا لیکن وسیع سیاق و سباق میں دیکھا جائے تو ایک تصویر یا فن پارہ اپنے خالق کی ذات کا اظہار ہی نہیں ہوتا بلکہ اس میں پوری قوم کے اجتماعی شعور کی عکاسی ہوتی ہے اور تہذیب و تمدن کی دنیا میں ملکوں کی پہچان اس بات سے ہوتی ہے کہ اس کے آرٹسٹ کیا تخلیق کر رہے ہیں اور معاشرہ ان آرٹسٹوں کے ساتھ کیا سلوک کرتا ہے۔ جب ایک حملہ آور' ایک چنگیز خان یا ایک ہٹلر دوسرے ملک کو روندتا ہوا اس کی آرٹ گیلریاں اور لائبریاں تباہ و برباد کر دیتا ہے تو وہ تاریخ میں اپنے لئے ایک سیاہ باب رقم کر جاتا ہے۔ یہی حال اندرون ملک قوموں کا ہوتا ہے۔ اگر وہ آرٹسٹوں ادیبوں' شاعروں اور دانشوروں کو ان کا صحیح مقام نہیں دیتیں یا ان کی تخلیقات کی قدر نہیں کرتیں تو وہ قومیں خود اپنے حق میں چنگیز خان یا ہٹلر سے کسی طرح مختلف نہیں ہوتیں۔ آپ نے تاریخ عالممیں پڑھا ہو گا کہ کسی خاص دور میں ایک وم اس وجہ سی مشہور ہوئی کہ اس کے پاس دنیا کا سب سے بڑا آرمیڈایا بحری بیڑہ تھا کوئی قوم اس لئے ممتاز قرار پائی کہ اس نے صنعتی انقلاب برپا کر دکھایا' کوئی قام اس لئے با اثر ٹھہری کہ اس کے پاس بہترین اسلحہ اور بہترین افواج تھیں۔ لیکن جب آپ تاریخ کے مجموعی دھارے پر نظر ڈالتے ہیں تو آپ کو احساس ہوتا ہے کہ یہ امتیاز' فخر یا یہ انفرادیت صرف ایک دور یا عہد تک محدود تھی۔ اور وہ تاریخ عالم میں اس قوم کے لئے پائیدار وجہ شناخت

 © Urdu4U.com

نہ بن سکی۔ اگر مستقل طور پر کسی قوم نے اقوام عالم کی صف میں کوئی عزت و تکریم پائی تو وہ اپنے آرٹ اور کلچر کی وجہ سے۔ یعنی تاریخ کے حوالے سے ایک قوم کے متمدن اور مہذب ہونے کا انحصار آرٹ اور آرٹسٹوں کے ساتھ اس کے رویئے پر ہوتا ہے۔ جو قومیں اپنی عظمت کے ان میناروں کو نظر انداز کر دیتی ہیں وہ خود اپنے ماتھے پر سیاہی مل لیتی ہیں۔" فطرت کے فن کے متعلق اظہار خیال کرتے ہوئے ڈاکٹر برڈ نے کہا:

"چند سال پہلے جب فطرت ایک سال کے لئے شگاگو انسٹی ٹیوٹ آف آرٹ میں آئے تو انہوں نے مجھ سمیت اپنے اساتذہ کو جس بات سے متاثر کیا وہ آرٹ کے ساتھ ان کا کومٹ منٹ تھا۔ ان کے اندر تخلیقی آگ تھی جو پورے زور سے بھڑک رہیت ھی۔ ان کے اندر ایک تڑپ تھی جو ان سے ملنے والے ہر شخص کو متاثر کرتی تھی۔ میں نے اس کے جو ورکس (Works) دیکھے ہیں اور چند منٹوں بعد آپ بھی دیکھیں گے۔ ان کے مطالعے سے مجھے بہت خوشی ہوئی ہے ان کی جس خوبی نے مجھے بہت متاثر کیا وہ یہ ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کے فن میں اساتذہ جیسی پختگی بھی آ گئی ہے اور تخلیقی آگ بھی مدھم نہیں پڑی۔ تخلیقی جوہر اور فنی پختگی ایک خاص امتزاج کے ساتھ فطرت کے فن میں یکجا ہو گئے ہیں۔ میں پاکستان کو لائق صد مبارک باد سمجھتا ہوں کہ اس کی سر زمین پر فطرت جیسا برائٹ(Bright) اور ٹیلینٹڈ(Talented) آرٹسٹ موجود ہیں۔ دراصل اس کا وجود کسی بھی ملک کے لئے وجہ افتخار ثابت ہو گا۔ خاص کر پاکستان کی دھرتی اور پاکستان کے بنیادی نظریئے کے ساتھ اس کا جو کومٹ منٹ ہے وہ انشاء اللہ بیرون ملک بھی پاکستان کے لئے شناخت کا ایک حوالہ بنے گا۔ میں فطرت کو یہ فن پارے جن میں سے کئی لحاظ سے واقعی شاہکار ہیں تخلیق کرنے پر مبارک باد دیتا ہوں۔ مجھے فکر ہے کہ زندگی کے ایک مرحلے پر مجھے ذاتی طور پر فطرت سے متعارف ہونے اور اس کے ساتھ کچھ وقت گزارنے کا موقع ملا۔ شکریہ"

اس تقریب کے فوراً بعد اخباری نمائندے اور کالم نویس اسی ہوٹل میں ف طرت کے بوس'

ڈی۔ جی بخاری صاحب کی چائے پر چلے گئے۔ فطرت کو خبر نہ تھی کہ بخاری صاحب نے اپنی خباثت کے اظہار کے لئے ان اخبار نویسوں کو بلایا ہے۔ وہ تقریب کے شرکاء کے ساتھ گھل مل گیا۔ اس نے ڈاکٹر برڈ کا دلی شکریہ ادا کیا اور جو مہمان اسے مبارک باد دینے آگے بڑھے ان کے ساتھ بات چیت کی۔ چند لڑکے لڑکیاں اس کے آٹوگراف لینے لگے۔ اس نے ایک لڑکے کی آٹوگراف بک پر دستخط کر دیئے تو اس نے کہا

"اس پر کچھ لکھ دیجئے"

فطرت نے ایک سطر لکھ دی "ایک موم بتی سے تاریکی ختم نہیں ہوتی"

اس نے کہا "نہیں سر، کوئی شعر"

فطرت نے اس سطر کے نیچے پہ شعر لکھ دیا۔

"آتش کدہ ہے سینہ مرا راز نہاں سے

اے وائے اگر معرض اظہار میں آوے"

ایک لڑکی نے اپنی آٹوگراف بک آگے بڑھاتے ہوئے کہا

"اس پر کوئی رومانٹیک سا شاعر لکھ دیں"

فطرت نے یہ شعر لکھ دیا۔

زندگی ایک سلگتی سی چتا ہے ساحر

شعلہ بنتی ہے نہ یہ بجھ کے دھواں ہوتی ہے

اسی طرح اس نے چند اور نوجوان شائقین کو بھگتایا۔ بعض شائقین کی سہولت کے لئے اپنے فن پاروں کی تشریح کی۔ بعض سے داد اور بعض سے دبی دبی شکایت سنی۔ لیکن مجموعی طور پر یہ نمائش کامیاب رہی اور فطرت خاصی حد تک مطمئن اور خوش خوش گھر واپس آ گیا۔

لیکن فطرت کو احساس نہ تھا کہ یہ تعریف خاص کر ایک امریکی پروفیسر کے منہ سے

یہ تعریف اسے کتنی مہنگی پڑے گی۔

اگلے روز مقامی اخبارات نے اس نمائش کو بہت کم اہمیت دی۔ کہیں اندر کے صفحوں میں ایک کالمیسرخی کے ساتھ صرف اتنا کہا گیا کہ ایک امریکی کے ہاتھوں پاکستانی مصور کی تصویروں کی نمائش کا افتتاح ہوا۔ اگرچہ ہر اخبار میں سرخی کے الفاظ مختلف تھے لیکن سب کا نقطہ نظر ایک ہی تھا۔ یعنی امریکی پروفیسر کے ہاتھوں نمائش کا افتتاح!

اگلے دو تین روز میں اخباروں میں جو کالم چھپے انہوں نے فطرت کو ہلا کر رکھ دیا۔ اس مین ایک سوچی سمجھی سکیم کے تحت فطرت کو تنقید کا ہدف بنایا گیا اور اس پر کئی قسم کے الزامات لگائے گئے۔

کسی نے لکھا:

یہ امریکی ایجنٹ ہے۔ کیونکہ اس نے ملک کی تمام برگزیدہ ہستیوں کو نظر انداز کر کے ایک امریکی پروفیسر سے نمائش کا افتتاح کروایا۔ بلکہ نمائش کے سارے اخراجات بھی امریکیوں نے برداشت کئے۔ دعوتی کارڈ تک امریکی سٹیشنری پر چھپے ہوئے تھے۔ یہ پہلے بھی امریکہ جا چکا ہے۔ اب پھر چلا جائے گا یہ سی آئی اے کا ایجنٹ ہے۔ ان کے ڈالروں پر پلتا ہے اور پھر ایسے ادارے میں ملازم ہے جس کے ذمے پاکستان کا تشخص ابھارنا ہے۔ جس شخص کی وفاداریاں اپنی دھرتی کی بجائے کسی غیر ملک سے ہوں وہ پاکستان کا تشخص کیا خاک ابھارے گا۔ ایسے ملک دشمن عناصر کو جو کلیدی آسامیوں میں گھسے ہوئے ہیں' زہریلے کیڑوں کی طرح چن چن کر باہر پھینک دینا چاہئے۔

دوسرے نے لکھا:

تصویروں پر ایک نظر ہی واضح کر دیتی ہے کہ ان کا خالق اشتراکی خیالات کا مالک ہے۔ اس نے چن چن کر ایسے موضوعات پر طبع آزمائی کی ہے جو روایتی طور پر سوشلسٹ مصوروں' شاعروں اور دانشوروں کے دل پسند موضوع رہے ہیں۔ ان میں کہیں اسلام کا

ذخر نہیں ہے۔ یہ ضرور کے جی بی کا آدمی ہے۔ روس کا ایجنٹ ہے۔ سماجی انصاف کے پردے میں اشتراکی نظریات پھیلانا چاہتا ہے۔ اس کے خلاف انکوائری ہونی چاہئے اور اگر نمائش کے اکثر شرکاء کا یہ تاثر درست ہے کہ وہ اشتراکی ذہن کا مالک ہے تو اسے عبرتناک سزا ملنی چاہئے یہ نہیں ہو سکتا کہ یہ شخص کھائے تو پاکستان کا اور پرچار کرے اپنے غیر ملکی آقاؤں کا ایسے اشخصا سے نظریہ اسلام کو سخت خطرہ ہے۔ جتنی جلدی ان کا محاسبہ کیا جائے ملک و قوم کے لئے اتنا ہی اچھا ہے"

تیسرے نے لکھا:

پاکستان نے پچھلے ستائیس اٹھائیس سالوں' خاص کر ۱۹۷۱ء کے المیے کے بعد بہت ترقی کی ہے۔ اس کا جی این پی بڑھا ہے۔ اس کی برآمدات بڑھی ہیں۔ اس کے زرمبادلہ میں اضافہ ہوا ہے۔ اندرون ملک خوشحالی آئی ہے۔ کشادہ سڑکیں' نئے ہوائی اڈے' عظیم الشان عمارتیں اور فائیو سٹار ہوٹل تعمیر ہوئے ہیں لیکن مصور کا پراگندہ ذہن زندگی کے روشن پہلوؤں کون نظر انداز کر کے اس کے صرف تاریک پہلوؤں پر توجہ دیتا ہے اور ان کی نشاندہی کرتی ہوئے بھی مبالغے سے کاملیتا ہے۔ جس کی وجہ سے اس کی تصویریں فن کی سطح سے گر کر سستا پروپگینڈہ بن جاتی ہیں۔ یہ بڑے افسوس کا مقام ہے کہ ان تصویروں کے خالق کو کراچی کا حبیب پلازہ' لاہور کا واپڈا ہاؤس اور اسلام آباد کا خوبصورت شہر نظر نہیں آتا۔ اسے نظر آتا ہے تو مزارع مزدور' کسان' گوالا' بھنگی اور خانہ بدوش۔ پتہ نہیں ایسے غیر محب وطن لوگ ابھی تک کیوں دندناتے پھرتے ہیں۔
کیا ان کو پوچھنے والا کوئی نہیں؟ آرٹسٹ ہو یا کوئی اور۔ اس ملک میں کسی شخص کو یہ اجازت نہیں ہونی چاہئے کہ وہ پاکستان کی تقری اور خوشحالی کو نظر انداز کر کے غربت' افلاس' جہالت یا تعصب کا پرچار کرے۔ پتہ نہیں یہ آرٹسٹ کون ہے اور اسے ایسی ملک دشمن نمائش کرنے کی کیوں اجازت دی گئی ہے۔ کیا اس میں کوئی غیر ملکیہ اتھ تو نہیں؟ اگر ہے تو ان پاکستان دشمن ہاتھوں کو بے نقاب کرنا چاہئے"

فطرت یکے بعد دیگرے اپنے فن کی یہ "قدردانی" پڑھ کر چکرا گیا۔ اسے اپنا مش ناکام اور اپنا وجود بے معنی نظر آنے لگا وہ کس کے سامنے اپنی صفائی پیش کرے۔ کیوں صفائی پیش کرے۔ وہ رات کو اپنے سٹوڈیو میں بند ہو کر رونے لگا۔ اس نے ٹیپ ریکارڈر کھول کر دل کی بھڑاس اس میں بھرنا شروع کی:

"یا اللہ' میری مدد فرما

یا اللہ' تو گواہ ہے کہ تجھ پر اور تیرے نبی آخر الزماں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر میرا ایمان کتنا پختہ ہے۔

یا اللہ تو گواہ ہے کہ اس ملک' اس دھرتی اور اس کے نظریئے سے مجھے کتنی محبت ہے۔

یا خدا' تو نے مجھے آرٹسٹ کیوں بنایا۔ مجھے ایک حساس دل دے کر میرے ہاتھ میں برش کیوں تھمایا۔ کیا اس لئے کہ میں سچ کا ساتھ نہ دوں' جھوٹ کو بے نقاب نہ کروں' صرف پر شکوہ عمارتوں کی تصویریں بناؤں۔ صرف ٹین کے اونچے کھمبوں کو سلام کروں اور تیرے ان لاکھوں کروڑوں عوام کو بھلو جاؤں جن کی زندگی ایک متواتر عذاب ہے۔ جن کا ایک ایک سانس عالم نزع میں ہے اور جن کا جینا ان کے لئے موت سے بڑی سزا ہے۔ کیا میں نے ان غریبوں کی ترجمانی کر کے تیری اور تیری دیئے ہوئے دین کی نفی کی ہے؟ کیا میں نے ان کی زندگی کو اجیرن بنانے والوں کو بے نقاب کر کے پاکستان سے دشمنی کی ہے؟

یا اللہ' اگر میں حق پر ہوں تو میری مدد فرما' مجھے سکون اور ہمت عطا فرما اور اگر میں غلطی پر ہوں تو مجھے راہ ہدایت دکھا ورنہ میرا ایمان اس بات سے اٹھ جائے گا کہ حق ہمیشہ غالب آتا ہے۔ کہاں ہے حق کی فتح' کہاں ہے سچ کا بول بالا' کہاں ہی روشنی' کہاں ہے نور؟"

دوسرے یا تیسرے دن اسے دفتر میں ایک مہر بند لفافہ ملا جس پر اس کا پورا نام عہدہ اور پتہ لکھا تھا۔ اس نے کھولا تو اس میں چارج شیٹ تھی۔ اس پر تین الزام لگائے

 © Urdu4U.com

تھے:
(۱) آپ کے فرائض میں دوسرے فن کاروں کے فن کو فروغ دینا شامل ہے۔ آپ نے ان کے فن پاروں کی بجائے اپنی تصویروں کی نمائش کیوں کی‘ کیا اس کے لئے آپ نے محکمانہ اجازت حاصل کی؟

URDU4U.COM

(۲) آپ نے ایک غیر ملکی ادارے (یو ایس آئی ایس) کے اخراجات پر ایک فائیو سٹار ہوٹل میں اپنی تقریب منعقد کروائی اور اس کا افتتاح ایک غیر ملکی شخص سے کروایا جو قواعد و ضوابط کے خلاف ہے۔

(۳) اخباری تبصروں اور آرٹ کے نقادوں کی رائے میں آپ کی تصویروں سے سوشلسٹ خیالات کی بو آتی ہے اور قیام پاکستان سے لے کر موجودہ عوامی دور تک آپ نے ملکی تاریخ کو جس طرح مسنح کیا ہے اس آپ پر اینٹی پاکستان (پاکستان دشمن) ہونے کا الزام لگایا گیا ہے۔
اگر آپ اپنے دفاع میں کچھ کہنا چاہتے ہیں تو ۲۲/مارچ کو اوقات کار ختم ہونے سے پہلے پہلے اپنی وضاحت زیر دستخطی پہنچا دیں ورنہ آپ کے خلاف ضابطے کی کاروائی کی جائے گی۔

دستخط
(ایس اے بخاری)
ڈپٹی ڈائریکٹر (ایڈمنسٹریشن)

جب سے فطرت چارج شیٹ ملی تھی۔ وہ ذہنی سکون اور نیند کھو بیٹھا تھا۔ اسے بات کا رنج نہ تھا کہ ڈی ڈی جی کی سازش کے تحت اس کی نمائش کے خلاف اخبارات میں لکھوایا گیا اسے اس چیز کا افسوس نہ تھا کہ اس پر کبھی لیفٹ اور کبھی رائٹ کی تہمت لگائی گئی۔ اسے جس بات نے ذہنی طور پر ماؤف کر کے رکھا دیا وہ پاکستان دشمن ہونے

کا الزام تھا۔ وہ کس طرح ثابت کرے کہ وہ محب وطن ہے۔ وہ کون سا سرٹیفکیٹ دکھائے کہ اس کا دل اسلام اور پاکستان کی محبت سے لبریز ہے۔ وہ کون سا ثبوت مہیا کرے۔ اور کیوں ثبوت مہیا کرے۔ کہ وہ پاکستانی ہے۔ خالص اور کھرا پاکستانی!

وہ ۱۷/ مارچ سے ۲۰ مارچ تک جن تجربات سے گزرا انھوں نے اس کے اندر زندہ رہنے کی ہمت سلب کرلی۔ اس کا جی چاہا کہ وہ خودکشی کر لے۔ لیکن اسے خلاف اسلام سمجھ کر رد کر دیا۔ اس نے سوچا کہ وہ ملک چھوڑ کر بھاگ جائے لیکن دھرتی کی بو' نظریے کی باس' دن کی دھوپ اور رات کی چاندنی نے اس کے پاؤں میں بیڑیاں ڈال دیں۔ اسے نوکری کا غم نہ تھا وہ جاتی ہے تو جائے۔ اسے زندگی کا رنج تھا جس کا دھاگہ لمحہ بہ لمحہ اس کے ہاتھوں سے سرک رہا تھا۔

جس دن اس نے چارج شیٹ کا جواب دینا تھا اس سے اگلے روز "یوم پاکستان" تھا اس کے پیارے وطن کے اساسی نظریئے کی سالگرہ! وہ اس سالگرہ کو اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ اس کے جشن میں شریک ہونا چاہتا تھا۔ وہ اپنے دلارے وطن کی ۲۸ ویں سالگرہ کی جوانی' اس کا جلوہ دیکھنا چاہتا تھا۔

۲۳' مارچ کو جمعہ کا دن تھا۔ اس نے نہا دھو کر مسجد میں نماز پڑھی۔ سہ پہر تک کمرے میں لیٹا رہا اور پانچ بجے نیشنل سنٹر میں "یوم پاکستان" کی تقریب میں شرکت کے لئے چلا گیا۔ وہاں اس نے پچھلے بنچ پر بیٹھ کر مقررین کی تقریریں سنیں۔ دوسروں کے ساتھ مل کر تالیاں بجائیں اور بالاخر مہمان خصوصی کی تقریر کا ایک ایک لفظ غور سے سنا۔

اس کے کانوں سے حسب ذیل جملے ٹکراتے رہے:

پاکستان ایک فلاحی اسلامی مملکت ہے۔ یہ کسی کی جاگیر نہیں اس کے مالک چھ کروڑ عوام ہیں"

"یہ اسلامی نظریاتی ملک ہے اور اسلام ظلم و ستم اور جبر و تشدد کی ممانعت اور مذہبی رواداری اور سماجی عدل و انصاف کی تلقین کرتا ہے۔"

"ہم سب کو مل کر اس ملک کی تعمیر نو کرنا ہے جس میں زندگی کے سب شعبوں یعنی

مزدوروں‘ کسانوں‘ استادوں‘ طالب علموں‘ مصوروں‘ شاعروں اور دانشوروں نے اہم کردار ادا کرنا ہے۔ یہاں سب کے لئے یکساں موقع ہیں۔ یہاں سب کے لئے آزادی مکمل

URDU4U.COM

آزادی"

مہمان خصوصی کی تقریر ختم ہوئی تو فطرت چپکے سے اٹھا اور پچھلے دروازے سے باہر نکلنے لگا تو دائیں بائیں بیٹھے حاضرین نے اسے عجیب نظروں سے دیکھا۔ (حالیہ اخباری تبصروں کے بعد) فطرت کو یوں محسوس ہوا کہ سب لوگ اسے طعنہ دے رہے ہیں۔

"وہ امریکی ایجنٹ سی آئی اے کا آدمی۔ ڈالروں پر پلنے والا"

"اوئے سرخہ ہے‘ سرخہ۔ وہ گیا۔ پکڑو اسے ایجنٹ ہے ایجنٹ"

"اینٹی پاکستان۔ اینٹی پاکستان"

وہ نیچے سڑک پر آیا تو اس کے ہوش و حواس خلط ملط ہو رہے تھے۔ اسے کچھ سوجھ نہ رہا تھا کہ اس نے بائیں مڑنا ہے یا دائیں۔ وہ پھرتا پھراتا اپنے گھر پہنچ گیا اس کی بیوی‘ بچوں سمیت کسی سہیلی کے گھر گئی ہوئی تھی۔ فطرت نے سٹوڈیو کھولا‘ فریم اتار کر سارے کینوس سمیٹے برش اور پینٹ وغیرہ اٹھائے اور اسلام آباد سے باہر نکل گیا۔ جنگل کی طرف!

جب میں اپنی دلکش ٹیوٹا میں کمال کو لے کر فطرت کے گھر پہنچا تو اس نے کوٹھی نما مکان کا گیٹ بند تھا۔ جس پر فطرت کے نام کی تختی لٹک رہی تھی۔ سامنے پورچ میں گہرے آسمانی رنگ کی فوکس ویگن کھڑی تھی۔ نمبر تھا آر آئی ڈی ۹۵۵۔ نمبر پلیٹ کے اوپر چند خشک پتے اٹکے ہوئے تھے کچھ پتے پہلے بھی پڑے ہوئے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ کئی دنوں سے جھاڑو نہیں دیا گیا۔

ہمن ے گاڑی باہر کھڑی کر دی۔ کال بیل کا بٹن دبایا لیکن یہ برقی رو سے خالی تھا۔ گھنٹی کو مردہ پا کر ہم نے ہینڈل کو گیٹ کے ساتھ دو تین دفعہ بجایا جواباً فطرت کا بیٹا فرخ باہر آیا۔ نیکر اور قمیض پہنے ہوئے۔ کمال نے اس سی پوچھا

"بیٹا' امی ہیں؟ اس نے اثبات میں جواب دیا تو ہم اندر چلے گئے۔ میری نسبت کمال کی یہاں آمدروفت زیادہ تھی۔

فطرت کی بیوی زبیدہ رو رو کر نڈھال ہو چکی تھی کہ اس نے مٹیالے رنگ کی شلوار قمیض پر میلی سی چادر اوڑھ رکھی تھی۔ اس کا چہرہ آنسوؤں سے دھل دھل کر پیلا ہو چکا تھا۔ اس کی سرخ آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ کئی روز سے سوئی نہیں۔ وہ اب بھی رو رہی تھی۔ ہم سب ڈرائنگ روم میں بیٹھ گئے فرخ باہر بھاگ گیا۔ ہماری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ بات کس طرح شروع کریں۔ کس سے شروع کریں۔ بالاخر کمال نے پہل کی۔

"بہن! فطرت صاحب کی کوئی خبر ملی؟"

زبیدہ نے ناک پونچھتے ہوئے نفی میں سر ہلایا۔

میں نے کہا۔

"بھابھی' کب گئے تھے وہ گھر سے' کیا کہہ کر گئے تھے کہ وہ کہاں جا رہے ہیں"

"۲۳ مارچ کی بات ہے بھائی۔ وہ نیشنل سنٹر میں کسی فنکشن کے لئے گئے تھے میں ایس ڈی او کی بیوی سے کڑھائی کا نیا ڈیزائن لینے گئی ہوئی تھی۔ وہ واپس آئے تو ساری تصویریں اٹھا کر لے گئے۔ میں سمجھی شائد یوم پاکستان کی خوشی میں انکی ساری تصویریں بک گئی ہیں۔ میں نے بعد مین ان کا کمرہ دیکھا تو وہاں سے تصویریں غائب تھیں مکمل' نامکمل' اچھی بری سب تصویریں پینٹ اور برش بھی"

"آپ کو ان کے یوں اچانک چلی جانے پر تعجب نہیں ہوا"

"نہیں' وہ پہلے بھی اسی طرح اچانک گھر سے نکل جاتے تھے۔ اس دن تو وہ پھر شام کو گئے تھے۔ پہلے وہ آدھی آدھی رات کو نکل جاتی تھی لیکن آخر کار واپس آ جاتے تھے لیکن اب کے ایسے گئے کہ پھر واپس نہیں آئے"

اس کے ساتھ ہی وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"یہ کب کی بات ہے؟"

"۲۳/مارچ کی"

"اور آج ہے ۲۷ مارچ۔ پانچواں دن؟ کہیں سے کوئی خبر نہیں ملی"

زبیدہ نے نفی میں سر ہلایا۔

کمال نے پوچھا۔

URDU4U.COM

"بہن آپ نے آج کا اخبار دیکھا ہے؟"

ہاں' عزیز صاحب کی بیوی صبح صبح اخبار لے کر آئی تھی لیکن وہ خودکشی کا یہ واقعہ کہیں اور کا ہے۔ ایک تو جس شخص کا حلیہ اس درج ہے وہ فطرت کا نہیں' دوسرے فطرت خودکشی کو غیر اسلامی سمجھ کر اس کے سخت خلاف تھا۔"

اتنے میں فطرت کے پڑوسی ایس ڈی اور رحیم صاحب اور فارسٹ آفیسر صاحب آ گئے۔ ان کے ساتھ ایک نیم تعلیم یافتہ ادھیڑ عمر شخص تھا۔ نوید نے بیٹھے ہی کہا

"بھائی' یہ سپر وائزر نور احمد ہے"

"جی"

"اس نے فطرت صاحب کو دیکھا تھا"

زبیدہ جو غم و اندوہ کی پوٹلی ہی تھی فوراً جاگ اٹھی کب' کہاں؟ ٹھیک تھے وہ؟

"بتاؤ نور احمد تم بتاؤ اپنی زبانی" نوید نے کہا

نور احمد نے بتانا شروع کیا

"۲۳ مارچ کو سورج ڈوبنے کے وقت ہمارے فارسٹ ہٹ کے چوکیدار نے فطرت صاحب کو تصویروں سمیت جنگل کی طرف جاتے دیکھا"

کمال نے بیتابی سے کہا

"اس نے روکا نہیں انہیں کہ وہ اس وقت کہاں جا رہے ہیں؟"

"چوکیدار انہیں پہلے بھی کئی مرتبہ یوں گھومتی پھرتے دیکھ چکا تھا۔ کبھی تصویر بنانے والے سٹینڈ' کپڑے اور پینٹ سمیت اور کبھی اس کے بغیر' وہ جانتا تھا کہ وہ تصویریں بناتے

ہیں"
"تو پھر" میں نے پوچھا
"وہ تو چلے گئے کہیں آگے جنگل کے اندر سڑک سے دور؟"
"کوئی نشان ملا ان کا؟"
"صرف دو نشان ملے۔ بلکہ ایک"

URDU4U .COM

"وہ کیا؟"
"جنگل کے عین وسط میں ان کی ساری تصویریں جلی پڑی تھیں۔ پینٹ اور برش بھی۔ بعض نیم جلے ٹکڑے زمین پر پڑے تھے جو نوید صاحب نے بھی آج دیکھے ہیں۔"
"اور دوسرا نشان یا اطلاع"
"جہاں انہوں نے تصویریں جلائی تھیں وہاں پہاڑی کی اوٹ میں ایک مکان ہے۔ ہم نے اس مکان کے رہنے والوں سے پوچھا"
"کیا بتایا انہوں نے؟"
"انہوں نے صرف اتنا بتایا کہ انہیں زور زور سے کسی پاگل کی آواز سنائی دی"
"کیا کہہ رہا تھا وہ"
"صحیح لفظ تو یاد نہیں۔ کچھ اول فول نکل رہا تھا اس کے منہ سے جیت گیا' جیت گیا' نکل گیا' نکل گیا' لے لیا بدلہ میں نے' پاگل ہیں سارے' بیوقوف' کیا کر لیں گے میرا' کیا بگاڑ لیں گے' پاگل بیوقوف کہیں گے' نکل گیا میں' نکل گیا میں"
"پھر؟"
"پھر گاؤں کے لونڈے پاگل پاگل کہہ کر دور سے اس پر پتھر پھینکنے لگے۔ فطرت نے ان کے شور اور پتھروں کا کوئی نوٹس نہ لیا اور رات کی تاریکی میں ڈھلونا کے اس پار جنگل میں کھو گیا۔
"پھر"
"پھر کیا' رحیم صاحب اور نوید صاحب نے مری تک تلاش کروا لیا کہیں کھوج نہیں ملا ان کا"

یوں عالم دیوانگی میں وہ اپنے پریشر ککر سے ہمیشہ کے لئے آزاد ہو گیا اور زبیدہ' فرخ اور حنا کو ایک نئے پریشر ککر میں پھینک گیا۔

URDU4U.COM